زندگی خاک نہ تھی
اُم مریم
WWW.PAKSOCIETY.COM

پیش لفظ

اللہ کے بابرکت نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

یہ ناول "زندگی خاک نہ تھی" فروری 2013ء میں "واپسی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے شعاع میں۔ کچھ وجوہات کی بنا پر مجھے اس کا نام تبدیل کرنا پڑا۔ لیکن مجھے امید ہے اس تبدیلی سے اس کے معیار کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا ہوگا۔ آپ سب کی پسند اور خواہش کے مطابق میں نے اس کا "پارٹ ٹو" لکھا ہے۔ وہ کمی یا پھر تشنگی جو آپ کو "واپسی" کو یہ پڑھتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اس خوبصورت اضافے کے ساتھ یہ تشنگی کا احساس میں نے مٹانے کی اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے۔

غالباً دو ڈھائی سال قبل شعاع میں ہی ہماری ایک قاری بہن نے تمام مصنفین سے ایک خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ چاہتی ہیں کوئی ایسا ناول لکھا جائے جس کا مرکزی کردار ایک ڈاکو ہو۔ مگر اسے اختتام پہ سدھار لیا جائے۔ یہ ایک ایسا پلاٹ تھا جس نے میرے ذہن کو فوراً متحرک کر دیا۔ میں نے قلم اُٹھایا تھا۔ اور اپنی اس بہن کی خواہش کو عملی جامہ پہنا دیا۔ جو "واپسی" کے عنوان سے کچھ ماہ قبل آپ کے ذوق اور پسند پر پورا اُتر کر سراہا جا چکا۔ الحمدللہ! یہاں کتاب کی اشاعت کراتے میں نے اسے ازسرِنو اس لیے لکھا کہ شعاع کی کمپوزنگ کے دوران بہت ساری جگہوں پر کچھ ایڈیٹنگ ہو جانے کے باعث مجھے کہانی کا ربط ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جبکہ یہ ناول مجھے ذاتی طور پر بہت پسند تھا۔ دل سے بہت قریب تھا۔ جبھی اس پہ کوئی سمجھوتہ بھی نہیں کر سکی۔ فیس بک اور ٹیلی فونک رائے کے بعد آپ سب کے اصرار پر میں نے اس کا دوسرا حصہ اس سوچ اس خیال کے ساتھ لکھا ہے کہ نیکی کا عہد کر لینا جتنا آسان اس پر قائم رہنا اسے نبھانا اسی قدر دشوار امر ثابت ہوا کرتا ہے۔ آپ لوگوں کی خواہش تھی کہ دیا کو اس کے والدین سے ملوانا چاہیے تھا۔ مستقیم کو اپنی ضد چھوڑ دینی چاہیے تھی۔ پارٹ ٹو میں آپ کو معلوم ہو سکے گا۔ دیا اگر اپنے والدین سے ملی تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ مستقیم نے اگر اپنی ضد برقرار رکھی تو اس کی وجوہات کیا تھیں۔

اس ناول میں میرا پسندیدہ کردار "دیا" کا کردار ہے۔ میں نے ایک کوشش کی ہے عورت کو اس کا مرتبہ اس کا مقام سمجھانے کی۔ حالات جیسے بھی ہوں۔ اسے اپنی ہمت اپنا وقار اپنا یقین اللہ پر

مضبوط رکھنا ہے۔ پھر بھلا ممکن ہے کہ کامیابی قدم نہ چومے۔ دیا روشنی کے جگنو کا نام ہے ہر ایسی عورت کے لیے جو حالات و واقعات کے تارِ عنکبوت میں جکڑی جائے۔ اگر قسمت نے آزمائش نصیب کی ہے تو خدارا اس سے فرار حاصل نہ کریں۔ حالات کے سامنے ڈٹ جائیں جیسے دیا ڈٹ گئی۔ اللہ پہ بھروسے یقین اور ایمان کے ساتھ۔ سرخروئی نصیب لازمی ٹھہرے گی۔ ان شاء اللہ!

کیونکہ اچھائی یہ نہیں کہ حالات اچھے سب کچھ ٹھیک تو ہم بھی اچھے ہیں۔ نہیں.......... اچھائی یہ ہے کہ حالات کڑے۔ آزمائش سر پہ مگر ہم نے سپر نہیں ڈالی ہے۔ خود بدلنے کی بجائے۔ حالات کو بدلنے کا عزم ضروری ہے۔

"زندگی خاک نہ تھی" مستقیم کے حالات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی کہانی ہے۔ اس کا مرکزی کردار بھی مستقیم ہی ہے۔ لیکن دیا نے اسے کیسے بدلا اسے کیسے جیت لیا۔ اس کا جواب محبت اور خدا پہ یقین کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت دیں کہ

"اللہ پاک میری ارضِ پاک پہ امن و سلامتی اُتارے۔"

میرے والدین بھائی بہنوں آمنہ اور ہر پاکستانی ہر مسلمان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے مکمل سلامتی کے ساتھ۔ خوش رہیے، خوشیوں کو بانٹیے۔

اُمِ مریم

پہلا حصہ

چھنچھناتا ہوا رکشہ ایک نسبتاً چھوٹے مکان کے سامنے آکر رُک گیا۔ بابا کرایہ ادا کرنے لگے تو دیا اپنا بیگ اور چادر سنبھالتی اُتر آئی۔ لکڑی کا پرانا رنگ اُڑا بوسیدہ سا دروازہ تھا۔ چھوٹی دیواروں پر سے جامن کے درخت کی شاخیں اِدھر اُدھر جھانک رہی تھیں۔ بابا کے ہمراہ یونہی بھڑا ہوا دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو دادی جامن کے درخت تلے بچھی چارپائی پہ بیٹھیں سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔ انہیں دیکھا تو بوڑھے چہرے پر ایک دم رونق سی چھا گئی۔ اٹھ کر پرتپاک انداز میں بیٹے اور پوتی کو باری باری گلے لگایا پیار کیا۔

"چائے پیو گے کہ بوتل منگوالوں؟"

"دادی پہلے بوتل پھر کھانے کے بعد چائے۔"

اس سے پہلے کہ بابا جواب دیتے وہ بول پڑی۔ دادی کو اس کی یہ اپنائیت آمیز بے تکلفی پسند آئی تھی جبھی مسکرانے لگیں اور بوتل منگوانے کو گلی کے کسی بچے کو آواز دینے لگی تھیں کہ بابا نے روک دیا۔

"رہنے دیں اماں! میں لاتا ہوں۔"

دادی کے منع کرنے کے باوجود بابا چلے گئے تو دیا نے چادر اُتار کر تہہ کی اور وہیں چارپائی پر لیٹ گئی۔ دھیان خود بخود گھر کی جانب چلا گیا تھا۔ ذیشان اور لائبہ تو امی کے ساتھ کھانا کھا چکے ہوں گے۔ امی تو نماز پڑھ کے سو جائیں گی۔ لائبہ اور ذیشان نے ضرور اودھم مچا رکھا ہوگا۔ آزادی جو نصیب ہوئی تھی انہیں۔ نہ بابا گھر نہ وہ۔ اس سے تو خاص طور پر ڈرتے تھے۔ بہت رعب جمایا کرتی تھی ان پر اپنی بڑائی کا جبھی خاصا دبا کے رکھا ہوا تھا دونوں بچاروں کو۔

جب دادی کا بلاوہ آیا تو تبھی دونوں نے جھٹ اس کا نام لے دیا تھا۔

"بجو کو بھیج دیں بابا! ویسے بھی ان کے ایگزام ہو چکے ہیں۔"

اس کے گھورنے کو نظر انداز کیے ذیشان نے کہا تھا۔

"تم خود کیوں نہیں چلے جاتے؟"

بابا کو آمادہ ہوتے پا کر وہ ذیشان کو گھورتے ہوئے غرائی۔

www.paksociety.com

"میری ان سے اتنی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے نا۔ ہر بات پر اعتراض۔ اس روز پتہ ہے کیا کہہ رہی تھیں؟ لڑکے اتنی تیز تیز منہ چلا کر نہ کھایا کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ بکرا چارہ کھا رہا ہے۔ کتر کتر کتر۔" وہ غصے میں کہہ گیا مگر پچھتایا کہ دیا اور لائبہ کے ساتھ بابا اور امی بھی ہنس رہے تھے۔ وہ روہانسا ہونے لگا۔

"اب آپ لوگ بھی مذاق اڑائیں گے میرا۔"

"نہ میرے چاند! دادی کی بات کا برا نہ مانا کر۔ وہ جو بھی کہتی ہیں مقصد اصلاح ہوتا ہے۔"

امی اپنے لاڈلے کو لپٹا کر پیار سے سمجھانے لگیں، جبکہ وہ مسئلہ وہیں اٹکا تھا ساتھ میں دیا کی جان بھی۔ قرعہ اس کے نام نکلتا تھا اور وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔

"ٹوکتی تو مجھے بھی رہتی ہیں دادی میری تھوڑا بنتی ہے ان سے۔"

وہ بسوری اور امی نے اسے گھورا تھا۔ ان کے خیال میں آج کل کے بچے بہت بے مہار تھے۔ مجال ہے جو بڑوں کا ادب لحاظ ہو۔

"آپ سے پیار تو کرتی ہیں نا۔ ٹوکتی بھی اگر ہیں تو نرمی سے۔ ہمیں تو بس ڈانٹتی ہی ہیں۔"

لائبہ نے بھی نقطہ اعتراض اٹھا لیا۔ اور یوں بے دلی سے سہی مجبوراً و مروتاً ہی مگر آنا دیا کو ہی پڑا تھا۔ فارغ وہی تھی۔

بابا صرف کولڈ ڈرنک نہیں گوشت، سبزیاں، پھل اور ضرورت کی دیگر اشیاء لے آئے تھے۔ جنہیں سنبھالتیں دادی اب بڑبڑا بھی رہی تھیں۔

"ذرا جو خیال ہو۔ گڈیوں کی طرح پیسے اڑاتا ہے ولی محمد! بھلا مجھ اکیلی جان کا کتنا خرچہ۔ جب بھی آئے گا تھیلے بھر کے چیزوں کے جمع کر کے رکھ جائے گا۔"

چارپائی پر لیٹی دیا نے تکیے سے سر ذرا سا اونچا کر کے انہیں دیکھا پھر ہنسنے لگی۔

"کیوں پریشان ہوتی ہیں دادی! اب میں آگئی ہوں نا یہاں۔ سب کچھ ہڑپ کر لیا کروں گی۔"

اس کی بات نے گلاس دھوتیں دادی کو نہال کر ڈالا۔

"ہاں ... جیتی رہو جیئے۔ اللہ سب برتنا نصیب کرے۔"

وہ ای خوشی و اطمینان سے اسے دعائیں دینے لگیں۔

"بیٹے آپ نکال لیں کولڈ ڈرنک گلاسوں میں۔"

"وہ مزے سے بیٹھی تھی۔ بابا کے ٹوکنے پر منہ بنا لیا۔

"فکر نہ کریں بابا! اب دادی کے سارے کام مجھے ہی کرنا ہیں۔ اس وقت تو تھکی ہوئی آئی ہوں

نا۔"

"ہاں ہاں ... تو چپ رہ۔ میں اتنا سا کام اپنی دھی کا کر کے تھکنے نہیں لگی۔"

دادی نے بھی بابا کو ہی ڈانٹا تھا۔ پانی پی کر بابا نماز کے لیے مسجد چلے گئے تو دیا نے پھر چارپائی پر لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ طبیعت مضمحل سی ہو رہی تھی۔ دادی اٹھ کر سالن بنانے کی تیاری میں مصروف ہوئیں اور گوشت کی تھیلی جو دادی کی نگاہ سے بچ کر وہیں تخت پر پڑی رہ گئی تھی دیوار پر بیٹھی بلی کی نگاہ سے نہ بچ سکی۔ اس نے اپنی کانچ سی آنکھیں کھولیں۔ گوشت کی تھیلی کو تولتی نظروں سے دیکھا۔ ناک سکوڑ کر تازہ گوشت کی خوشبو سونگھی اور مال غنیمت جان کر دبے پاؤں اتری۔ دیوار سے چھت پہ کودی پھر سیڑھیاں عبور کیں۔ صحن میں آ کر وہ بہت سرعت سے جھپٹی تھی اور گوشت کی تھیلی کو منہ میں ڈالے دیوار پر جست لگا دی۔

عین اسی لمحے دادی باہر آئی تھیں۔ مارے صدمے کے ہاتھ سے لہسن پیاز کی گڈیاں چھوٹ گئیں۔

"اوئے پکڑیو۔ بھاگیو۔ لے گئی کمبخت! تیرے باپ کی کمائی تھی۔ ارے کوئی ہے؟"

ان کی چیخ و پکار کے جواب میں دیا نے چونک کر آنکھوں سے بازو ہٹایا اور صورتحال سمجھتے ہی جھک کر اپنا جوتا اٹھایا اور تاک کر عین وقت پر بلی کو کھینچ مارا۔ بلی کے منہ سے تھیلی چھوٹ کر گری۔ جسے دادی نے بھاگ کر قبضہ میں کیا اور سینے سے لگا لیا۔

"نامراد ... کمینی ... تو پہ ذرا کی ذرا نظر چوکی نہیں اور یہ سارا گوشت لے کر بھاگی نہیں۔"

دادی کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ وہ اپنی پھرتی کے مظاہرے پر اب جشن رہی تھی۔ جب دادی نے اس کا کارنامہ بابا کو سنا کر اسے شاباش دی۔ اس کی گردن کچھ اور اکڑ گئی تھی۔ گویا بابا کو جتا رہی ہو آپ کی دیا اتنی بھی بیکار نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ بابا نے مسکراہٹ چھپائی تھی۔

دادی کی پڑھی لکھی شہری پوتی کی آمد کا سن کر آس پڑوس کی عورتیں باقاعدہ اس کے دیدار کو آ رہی تھیں۔ دادی ہر کسی کے سامنے اس کے رکھ رکھاؤ، ذہانت، تعلیم اور خوبصورتی کے لمبے چوڑے قصیدے پڑھتیں تو دیا یکدم خجل ہو جایا کرتی ایک دو بار انہیں دبے انداز میں ٹوکا بھی۔ مگر ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ سو مگن رہیں اس روز انہوں نے بڑے شوق سے گڑ کے چاول پکائے تھے جس میں چنے کی دال بھی ڈالی تھی۔

"تیرے ابا کو یہ چاول بڑے پسند ہیں اور تیرے بہشتی دادا کو بھی۔"

انہوں نے پلیٹ بھر کے اسے تھماتے اطلاع دی۔ وہ محض مسکرا دی مگر اتنی رغبت سے کھا نہ سکی

جنتی سے غالباً دادا اور بابا کھاتے ہوں گے۔ جبھی تو دادی کا چہرا اتر گیا تھا۔

''چل پھر تو روٹی کھا لے پتری! بھوکے پیٹ نہ سونا۔ میں ذرا ثریا کے گھر سے آؤں یہ

جاؤں۔''

وہ بڑے سائز کی دوسری پلیٹ بھر کے اٹھ گئیں۔ البتہ باہر جانے سے قبل اسے اندر سے دروازہ بند کرنے کی تاکید کرنا نہیں بھولیں۔ دیا گہرا سانس بھر کے اٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

دادی نے چار مرغیاں پال رکھی تھیں۔ اس وقت اس نے دادی سے انڈوں کے حلوے کی فرمائش کی تھی۔ جب ہی دادی ایک دم پرجوش ہو کر حلوہ بنانے میں مصروف تھیں۔ دیسی گھی دیگچی میں کڑکڑا رہا تھا اور ماحول میں انڈوں کے حلوہ کی خوشبو پھیلانے لگی تھی۔ خود دادی وقفے وقفے سے چمچہ چلاتیں گویا اسے بھی سکھانے پر کمربستہ اسے ترکیب باآواز بلند از بر کرا رہی تھیں۔ دیا کو انہوں نے خشک میوہ جات صاف کرنے پر لگا رکھا تھا۔

بابا اسے دادی کے پاس چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ شہری ماحول کی عادی تھی۔ یہاں اسے وقت بہت سست روی سے گزرتا محسوس ہوتا تھا۔ ماحول کی تبدیلی نے اس پر بیزاری اور کسلمندی طاری کر رکھی تھی۔ حالانکہ تقریباً روز ہی گھر پہ سب سے فون پر بات ہوتی تھی مگر پھر بھی وہ ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی۔ زندگی پہ چھایا جمود اب اسے اکتاہٹ سے دوچار کرنے لگا تھا۔ مگر دادی کے خیال سے چپ تھی کہ اتنی جلدی اس کی واپسی کا سن کر ان کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ جب سے دادا کی وفات ہوئی تھی وہ بہت اکیلی ہو گئی تھیں۔ بابا کو ہر وقت ان کے حوالے سے فکر لاحق رہا کرتی کیونکہ وہ ان کی منت سماجت کے باوجود بھی شہر آ کے رہنے پر آمادہ نہ تھیں۔

''نہ پتر! تیرے ابا مجھے اس گھر میں بیاہ کر لائے تھے۔ میرا جنازہ بھی یہیں سے اٹھنا چاہیے پھر تیرے ابا کی ہی کیا... ہمارے سارے پرکھوں کی قبریں یہیں ہیں۔ میں ایسی بے وفائی نہیں کر سکتی کہ سب کچھ چھوڑ کر شہر جا بسوں۔''

بابا کے سمجھانے اصرار کرنے پر دادی نے یہی کہا تھا اور وہ اپنی ضد پر قائم رہی تھیں۔ تب بابا نے ان کی تنہائی کا یہ حل نکالا تھا کہ دیا کو ان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

''اچھا ہے اماں! آپ اسے اپنے پاس رکھیں۔ ذرا اس کی تربیت بھی کر دیجیے گا۔ ورنہ اس کے بابا نے تو صرف لاڈ پیار کر کے اسے بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ یہ نہیں پتہ بٹی پرایا دھن ہوتی ہے۔ اس کی شادی بھی کرنا ہے۔''

اسی رات امی نے فون پر دادی سے کہا تھا اور دادی جی جان سے تیار ہو گئی تھیں۔

''سو بسم اللہ! کیوں نہیں پتری! میں اپنی دھی کو سینا پرونا، گھرداری سب سکھا دوں گی۔ بس اللہ سوہنا میری شہزادی جیسی صورت رکھنے والی پوتی کا نصیبا بہت اچھا کرے۔''

اور اب دادی یقیناً اس کی تربیت کا ہی بیڑا اٹھائے ہوئے تھیں کہ ہر کام اس سے کرایا کرتیں۔ صبح خود نماز کو اٹھتیں تو اس وقت تک ان کی پکاریں نہ تھمتیں جب تک اسے بھی وضو کے لیے واش روم روانہ نہ کر دیتیں۔ پھر یہیں پہ اکتفا نہ ہوتا تھا۔ قرآن پاک کی تلاوت اور تسبیحات بھی ضروری تھیں۔ جبکہ وہ تو صبح کالج جانے سے ذرا پہلے اٹھنے کی عادی تھی۔ یہاں دادی اسے نماز پڑھ کے بھی سونے کی اجازت نہ دیا کرتیں۔

''بغیر عذر کے فجر کے بعد سونا جائز نہیں ہے پتر! منع ہے ہمارے مذہب میں۔''

وہ ہر بات اتنے پیار اتنے رسان سے سمجھایا کرتیں کہ انکار کی ہمت اور جرأت مفقود ہو جایا کرتی۔ یہاں آنے کے بعد وہ شاید ہی پندرہ بیس دنوں میں کوئی نماز چھوڑنے پائی ہو۔ ورنہ گھر پہ تو وہ مرضی کی مالک ہوا کرتی تھی۔ جی چاہا پڑھی نہیں تو نہ سہی۔ بابا کی تاکید اور امی کی سرزنش پہ وہ کہاں اتنا کان دھرنے کی عادی تھی۔ مگر دادی کی تو بات ہی الگ تھی۔ وہ صرف کہنا نہیں منوانا بھی جانتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

گلابی سرد شام تیزی سے در و دیوار پر اترتی آ رہی تھی۔ ماحول میں خنکی کا احساس بڑھ رہا تھا۔ وہ دھلے کپڑے اتارنے چھت پر آئی تھی اور دیوار سے بندھی رسی سے ایک ایک کپڑا کھینچنے لگی۔ تبھی فضا اڑتے کبوتروں کے پروں کی کاٹ اور گنگنانے کی آواز سے گونج اٹھی۔

آ بیٹھ پاس تیری روح میں اتر جاؤں
نظر کے پاس رکھوں حد سے میں گزر جاؤں

دیا چونک کر پلٹی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ منڈیر پر جھکا اپنے کبوتروں کو نہیں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے متوجہ ہوتے ہی دلفریبانہ انداز میں مسکرایا اور جھٹ ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ دیا صرف ہوائی نہیں حلق تک بیزار بھی ہو گئی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اسے چھت پر منڈلاتے دیکھا کرتی تھی۔ اسے تو لگا تھا وہ اسی کا منتظر ہوتا ہے۔

کدی تے ہس بول وے
نہ جند ساڈی رول وے
آ دلاں دیا جانیاں

تو کر مہربانیاں آ بیٹھ جا میرے کول وے

نہ جند ساڈی رول وے

وہ اب باقاعدہ لہک لہک کر تا ہنسی اڑا رہا تھا۔ دیا کا مارے غصے کے چہرہ لال بھبوکا ہوا۔ گو اس کی بے نیازی کا شکوہ کیا جا رہا تھا۔ جتنے کپڑے وہ اتار چکی تھی انہی کو سمیٹے پلٹ کر دیکھنے کا تکلف کیے بنا وہ دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتر آئی۔

''میں نے سوچا آج پلاؤ پکا لیتی ہوں۔ گوشت لا دیا ہے۔ دھو کے بھی رکھ دیا۔ پکائے گی ج... لاڈو رانی۔'' اسی وقت دادی کچن سے نکلی تھیں۔ دیا نے جواب دیئے بنا کپڑوں کا ڈھیر چارپائی پر پھینک دیا۔ وہ اس عاشق سے بیزار تھی مگر اس کا حل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ دادی کے دوبارہ کچن میں جانے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر کپڑوں کو تہہ لگا کر رکھنے لگی۔ اداس شام چپکے چپکے در و دیواروں سے جھانکتی رہی تھی۔ کھلے سے آنگن میں بکھری اکتائی سی دھوپ نے دھیرے دھیرے بے دلی سے اپنے پر سمیٹے اور واپسی کا سفر شروع کر دیا تو نیلا خاموش امبر پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور چہکاروں سے بھرنے لگا۔ جامن کی شاخوں پر پڑے جھولے پر کوئی ننھی سی چڑیا شاید راستہ بھول کر آ بیٹھی۔ زرد دھوپ میں اونگھتے پتوں نے آنکھ کھول کر اس اجنبی مگر مانوس مسافر کو خوش آمدید کہا۔ اس کے ننھے وجود سے جھولا ہولے ہولے ہلنے لگا۔ دیا کپڑے تہہ لگا کر اٹھی تو چڑیا ہڑبڑا کر پھر سے اڑ گئی۔ وہ کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی جب اس کے سیل پر بیپ ہونے لگی۔ کچن سے دادی بھی مسلسل پکار رہی تھیں۔

''دادی کو کیا فرق پڑا میرے آنے سے؟ وہ اکیلی تھوڑا ہی تھیں۔ یہاں ہمسایہ کی عورتیں دن بھر ان کے پاس چکر لگاتی ہی رہتی ہیں۔ مگر میری زندگی کیسی اکتاہٹ سے بھر گئی ہے۔''

وہ فون پر لائبہ سے شکوہ کناں تھی۔

''کوئی بات نہیں بجو! آہستہ آہستہ دل لگ ہی جائے گا۔''

لائبہ کی تسلی پر وہ بھڑک اٹھی۔

''مجبوری بھی آخر کیا ہے جو دل لازمی لگاؤں۔ واضح رہے یہ میرا سسرال نہیں ہے جو زبردستی کروں۔'' اس کی اتنی سنجیدگی بلکہ رنجیدگی سے کہی بات پہ بھی لائبہ کی کھی کھی جاری ہو گئی تھی۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ؟ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہو؟''

وہ مرنے مارنے پر تل گئی۔ لائبہ فون پر ہی کھکھیانے لگی۔

''نہ...... نہیں بجو...... میں تو اس لیے ہنسی کہ سسرال میں زبردستی نہیں کرنی پڑے گی آپ کو دل لگانے میں وہاں ہمارے وجیہہ و شکیل ہینڈسم دولہا بھائی ہوں گے نا اس کام کو۔''

وہ جیسے اسے بہلا رہی تھی۔ مگر یہاں تو تھی کہ وہ بہل نہیں سکی تھی۔ فون بند کیا تو پہلے سے زیادہ بوجھل ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

دادی کو جب بھی کسی کام کی ضرورت پڑتی رضیہ کے لڑکے کو آواز دے لیتی تھیں۔ رضیہ کا گھر ان کے سامنے ہی تھا۔ انہوں نے دروازہ کھول کر گلی میں جھانکا۔ شاید کہیں نکو کھیلتا نظر آ جائے۔ مگر گلی خالی تھی۔ انہوں نے پلٹ کر دیا کو اندر سے کنڈی لگانے کا کہا اور خود گلی پار کر کے رضیہ کے دروازے پر آن رکیں۔ رضیہ سامنے ہی نظر آ گئی۔ صحن میں ایک طرف بنے کھرے میں اپنے بچے کو نہلا رہی تھی۔

''بٹی یہ کون سا وقت ہے بچے کو نہلانے کا۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

''کیا کروں ماسی! ذرا کی ذرا بٹھا کر گئی تھی اندر دال نکالنے کو۔ سیدھا جا پڑا گوبر میں۔'' رضیہ جی بیٹھی تھی۔ بچے کی گردن بغل میں داب اس کی ٹانگیں صابن سے مل مل کر دھونے میں مصروف۔ صحن کے ایک طرف گھاس پھونس کے چھپر تلے بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ جن کی غلاظت کی بو سے دل الٹتا تھا۔ بچہ روتے ہوئے ٹانگیں چلانے لگتا تو رضیہ صابن سے بھرے ہاتھ کا ہی دھموکا اس کی کمر پر جڑ دیتی۔ بچہ پہلے سے بڑھ کر گلا پھاڑنے لگتا۔

''آپاں نظر نہیں آ رہیں۔ نکو بھی کہیں نہیں تھا۔ مجھے تو اس سے کام تھا۔''

دادی نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے قبل اس کی ساس کا پوچھا۔ رضیہ کی آنکھیں نفرت سے سکڑ گئیں۔

''ہو گی محلے کے دورے پر۔ شام کو اس وقت آئے گی جب ہانڈی روٹی پک کے تیار ہو گی۔ ماں پر بیٹے کی ہمدردی کے مروڑ الگ اٹھتے ہیں۔ وہ جو میری ہڈیاں توڑتا ہے اس کا پتہ نہیں۔ قسم سے کل رات پھر چار چوٹ کی مار لگائی مجھے۔ جسم نیلوں نیل ہے۔ پیسے مانگ رہا تھا نشے کو۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ ماں بہنوں کو بیچ کر کر لے چسکا پورا۔''

دوپٹے کے ساتھ بچے کی ٹانگیں خشک کرتی وہ اپنے دکھ پھولنے لگی۔

''ماسی تو خود انصاف کر۔ سارا دن گدھی کی طرح کام کروں۔ اس پر ایسا بھی نہیں کہ دونوں کسی کو ہی اٹھا لیں۔ اب میرے ساتھ یہ چولہے میں سڑ دے یا گوبر میں جا گھسے، مفت کی نوکر ہوئی میں اس پر ماں بیٹے کی جتیں سنوں۔''

''بٹی سخت حالات میں صبر سے گزارا کرتے ہیں۔ تیرا مرد گھر کی ناچاقی کی وجہ سے نشہ کرنے لگ گیا اس سے بڑھ کر پریشانی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ تجھے چاہیے تو عقل کے ناخن لے۔ ساس سے

میٹھا بول بول اور شوہر کی دلجوئی کر۔ وہ سر کا سائیں ہے تیرا۔ خدانخواستہ کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو سر
کے روئے گی۔"
دادی کی نصیحتوں پر رضیہ کے ماتھے پر سلوٹیں نمودار ہونے لگیں۔
"تو چھوڑ ماسی ان جھمیلوں کو۔ یہ معاملے نہیں سدھرنے کے۔ لا پیسے دے۔ بتا جو منگانا ہے
آئے تو منگا دوں گی۔"
دادی کو صاف لگا وہ دوسرے لفظوں میں انہیں وہاں سے چلتا کر رہی ہے۔ وہ سخت دل
واپس آئی تھیں۔
"عورت خود اپنا گھر بگاڑتی اور بناتی ہے۔ قدرت نے اس میں اتنی طاقت رکھی ہے کہ وہ
معاملے سدھار سکے مگر رضیہ......"
وہ دیا سے رضیہ کا سارا قصہ کہتی آخر میں تاسف سے گویا تھیں۔ دیا کیا کہتی۔ اسے نہ رضیہ
دلچسپی تھی نہ اس کی کہانی سے۔

☆......☆......☆

دادی کے کہنے پر وہ مرغیوں کے ڈربے سے انڈے لینے آئی تھی مگر نکو دادی سے بھی
مشتاق لگتا تھا اس کام کا۔ جبھی اس سے پہلے موجود تھا۔ دیا نے حیرانی سے اسے انڈے چراتے دیکھا
دادی سے وہ متعدد بار یہ سن چکی تھی کہ وہ انڈے چرا کر بھاگ جاتا ہے۔ اب وہ باقاعدہ پہرا
تھیں۔ مگر نکو پھر بھی ہاتھ دے جاتا تھا انہیں۔
"نکو کے بچے! اک منٹ رکو تم۔"
اسے بے تحاشہ غصہ آ گیا جبھی زور سے چیخی۔ نکو اسے دیکھتے ہی بدحواس ہوتا بگٹٹ بھاگا
کی چھت کو دوسری سے الگ کرتی درمیانی منڈیر پھلانگی۔ ایک سے دوسری پھر تیسری چھت پر
وہ لمحوں میں غائب ہو چکا تھا۔
"بدتمیز کتنا بڑا چور ہے۔"
وہ جھنجھلائی تھی۔ اور ڈربے پر جھکی جو خالی پڑا منہ چڑاتا تھا۔ گہرا سانس کھینچ کر پھر اس
دیکھا اور چونک گئی۔ منڈیر پر ٹوٹے ہوئے انڈے پڑے تھے۔ یقیناً بدحواسی میں نکے کے ہاتھ
چھوٹ گئے تھے۔ چھلکے انڈے کی زردی اور سفیدی۔ منڈیر پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تاسف کا
وہیں ٹھہری رہ گئی۔ جاڑے کی شام آہستہ روی سے پھیلتی اس شفاف رنگت والی نازک لڑکی کا
مسکرا کر تکتی رہی۔ دن بھر کے سفر سے نڈھال شاہ خاور بڑی فراخدلی سے اپنا زرد نارنجی رنگ

کناروں سے دھرتی کے سینے مکانوں کی چھتوں دیواروں کے سوکھے بدنوں اور بوڑھے درختوں پہ
پھیلا رہا تھا۔ منڈیر پہ بیٹھا کوا اسے دیکھ کر اڑ گیا۔ وہ گہرا سانس بھرتی واپس سیڑھیاں اتر آئی۔ اس
بات سے بے نیاز کہ وہ کبوتروں والا عاشق آج بھی ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا ہے اور اسے خبر نہیں
ہونے دی۔
وہ نیچے اتر کر آئی اور بے دلی سے تخت پر جا بیٹھی۔ دادی رضیہ کے شوہر کی عیادت کو گئی تھیں۔ جو
بیمار رہنے لگا تھا۔ دادی کو رضیہ کے شوہر سے پوری ہمدردی تھی۔ ان کا خیال واثق تھا اگر عورت چاہے تو
ڈوبتی ناؤ کو بھی کھینچ کر ساحل پر لا سکتی ہے۔
"آزمائش کس پر نہیں آتی۔ یہ تو اولیا اور پیغمبروں پر بھی آئی ہیں۔"
وہ ناصحانہ انداز میں کہا کرتیں۔
"مگر دادی آپ سارا بوجھ عورت پر ہی کیوں ڈالتی ہیں۔ حالات کے سدھار کی ذمہ داری مرد
پہ بھی تو عائد ہوتی ہے نا۔"
وہ اختلافی نقطہ اٹھا دیا کرتی۔ دادی جواباً مسکرانے لگیں۔
"میری بچی اللہ نے عورت میں ازل سے قربانی کا جذبہ وافر مقدار میں رکھا ہے۔ بظاہر نازک
نظر آنے والے جسم میں ہمت اور حوصلہ پہاڑوں جیسا ہے۔ اگر یہ چاہے اگر ہمت کرے تو بگڑے
سے بگڑے مرد کو سدھار سکتی ہے۔ وہ بھی ایسے مرد کو جو اپنی بیوی کو اہمیت دے۔ اس سے محبت کرتا ہو۔
تو کیا رضیہ سے اس کا شوہر محبت کرتا ہے؟"
وہ حیران ہو کر سوال کر رہی تھی۔ دادی کچھ جھینپ گئیں۔
"ان دونوں کی محبت کی شادی ہے۔ خالہ خالہ کے دھی پتر ہیں دونوں۔ رضیہ کا جبھی تو ذرا ل چلتا
ہے کہ ساس برداشت نہیں کرتی اور اس کے کان بھرتی ہے۔
"اچھا یہ بتائیں آج کیا پکانا چاہیے۔"
دیا نے بات بدل دی۔
"جو کھانا ہے بچی پکا لے۔ میں تو سب کچھ ہی کھا لیا کرتی ہوں۔"
دادی کے جواب پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔
"میرا خیال ہے مٹر پلاؤ۔ رائتہ اور سلاد۔ رات میں آپ کو کافی پلاؤں گی۔ مزا آ جائے گا نا۔"
وہ ان کی تائید چاہ رہی تھی۔ جو دادی نے مسکرا کر اس کی پیشانی چوم کر اپنے انداز میں پیش کی۔

☆......☆......☆

اسے وہاں آئے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس دوران ایک چکر بابا کے ساتھ امی اور ذیشان اور ارباب بھی یہاں لگا گئے تھے۔ شروع دنوں میں بیزار رہنے کے بعد جیسے تیسے سہی مگر وہ ایڈجسٹ کر رہی تھی۔ یہ نومبر کا مہینہ تھا اور یہاں تو اکتوبر سے ہی سردی پڑنا شروع ہو چکی تھی۔ شدید سردی کے موسم کے آغاز کے ساتھ ہی دادی کو ہزاروں کام آ پڑے تھے۔ سب سے زیادہ الجھن دیا کو اس وقت ہوئی جب دادی لحاف ادھیڑ کے بیٹھ گئیں۔

''صاف ستھرے تو تھے دادی! کیوں بکھیرا ڈال لیا۔''

وہ جھنجلا سی گئی تھی۔ دادی کے اطمینان میں البتہ فرق نہیں آیا۔

''دوبارہ سے بھرائی کرانی تھی نا بیٹے! پھر اب میں تمہیں ان میں ڈورے ڈالنے بھی تو سکھاؤں گی اس طرح۔''

ان کے بڑے چاؤ سے کہنے پر دیا جیسے بیہوش ہونے کے قریب جا پہنچی۔

''پلیز دادی! مجھے نہیں سیکھنے۔''

وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ دادی ہنسنے لگیں۔

''نہ پتر ایسے نہ کہہ۔ سب کچھ والدین کے گھر سے سیکھ کر اپنے گھر جائے گی تو شوہر کے دل پر راج کرے گی۔ کوئی تنگی نہ ہو گی تمہیں کسی بھی نئے کام میں ہاتھ ڈالتے اور کام تو سب ہی کرنے پڑتے ہیں بیٹا! یہ تو طے ہے۔''

دادی نے مخصوص سبھاؤ سے سمجھایا۔ دیا نے ہونٹ بھینچ کر ناگواری دبالی۔

''مجھے تو ہر کام میں خود جان مارنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی دادی! جو کام پیسے دے کر ہو جائے اسے.....''

''نہ کرنا ہر کام میری دھی اگر سیکھنے میں کوئی حرج ہے؟''

دادی کا انداز وہی ناصحانہ نرم اور دھیما اپنائیت آمیز تھا۔ جس سے فرار ممکن ہی نہ تھا۔ جبھی وہ محض ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی۔

''پتر عورت کو ہر کام آنا چاہیے۔ مشکل اور آزمائش کے وقت میں فائدہ رہتا ہے۔''

''آپ کو الہام ہوا ہے کہ میری قسمت میں مشکل یا آزمائش ضرور آنی ہے؟''

وہ کلس گئی تھی اور دادی تڑپ۔ جبھی کتنی بے قراری سے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

''میری تو دعا ہے دھیئے کہ تیرا نصیبا شہزادیوں سے بھی زیادہ اچھا ہو۔ مگر آنے والے وقت کا صرف اللہ کو ہی علم ہے نا۔ اللہ سے تو بہتری اور بھلائی کی امید ہے۔ مگر انسان کو ہر طرح کے حالات

کے لیے تیار ضرور رہنا چاہیے۔ تاکہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ شکوہ و شکایت ناراضگی مسائل کا حل کبھی پیش نہیں کرتے۔ بلکہ بگاڑ کا باعث بنا کرتے ہیں۔ مشکل حالات میں مضبوط اعصاب، چابک دستی اور صبر و استقامت سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا فتح و کامرانی کی کنجی ثابت ہوا کرتا ہے دھی رانی۔'' وہ پھر اسے سمجھا رہی تھیں۔ دیا محض سر ہلا کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ لحاف میں سکڑی سمٹی ہوئی پڑی تھی۔ ساری رات بارش برسی تھی۔ صبح نماز کے لیے اٹھی تو آنگن گیلا اور فضا میں کہر تھا۔ ٹھنڈی یخ ہوا کے جھونکے اسے کپکپا کے رکھ گئے تھے۔ سردیوں میں برسنے والی بارش نے سردی کی شدت کو خطرناک حد تک بڑھا دیا تھا۔ وہ نماز بھی بہ مشکل ہی پڑھ سکی کہ چھینکوں نے برا حال کر دیا تھا۔ پھر دوبارہ سو گئی۔ اب جا کے آنکھ کھلی تو اس نے لحاف سے منہ نکال کر کمرے کا جائزہ لیا۔ دادی کمرے میں نہیں تھیں۔ وہ آنکھیں کھولے کمرے میں آتی روشنی دیکھنے لگی۔ دھندلی سی صبح تھی۔ کھلے دروازے سے دھند کے بگولے سے اندر چلے آ رہے تھے۔ اس نے جمائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دادی کا بستر اور لحاف سمٹا ہوا تھا۔ کھلے بالوں کو سمیٹتے اس نے پیر بستر سے نیچے لٹکائے اس سے پہلے کہ اٹھ کر باہر نکلتی دادی اس کے لیے ناشتہ لیے چلی آئی تھیں۔ وہ یکدم شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

''رہنے دیا ہوتا دادی! میں خود بنا لیتی۔''

''کوئی بات نہیں پتر! تو ہی بناتی ہے ہر روز۔ اب طبیعت بہتر ہے؟ ناشتہ کر لے۔ مجھے رضیہ کی طرف جانا ہے۔''

دادی کا انداز واضح طور پر بجھا بجھا سا محسوس کر کے وہ بے طرح چونکی۔

''کیوں دادی خیریت؟''

وہ جانتی تھی دادی عام عورتوں کی طرح محلے کے گھروں میں فضول جا کر بیٹھنے کی عادی کبھی نہیں تھیں۔ پھر اتنی صبح وہ بھی اس کی طبیعت کی خرابی کے باوجود۔

''نانا فوت ہو گیا ہے اس کا۔''

دادی کی اطلاع پر دیا دھک سے رہ گئی۔ ان کی ساری کہانی دادی نے اتنی بار دہرائی تھی کہ وہ بھی آگاہ تھی۔ پھر اتنی جوان موت کا اچانک صدمہ۔ وہ اسی زاویے پر پہنچی رہ گئی۔

''ساری رات گھر نہیں آیا تھا نمانا! بیچاری بڈھی ماں برستی بارش میں چھاتا لیے رات بھر ڈھونڈتی پھری مگر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ صبح لوگ فجر کی نماز پڑھ کر لوٹ رہے تھے تو گلی کے گندے نالے کے

قریب گرا ہوا ملا۔ اللہ جانے کیسے جان دی ہوگی سسک سسک کے بیچارے نے۔"

دادی کی آواز بھرا گئی۔

"غلط کاموں کے ہمیشہ غلط ہی نتیجے نکلا کرتے ہیں دادی! وہ غلط راستوں پر چل نکلا تھا تو انجام ایسا ہی ہو سکتا تھا پھر۔"

وہ کسی قدر روکھے پن سے کہہ کر اٹھ کر منہ دھونے چلی گئی۔ کچھ دیر قبل کے احساسات جامد ہو چکے تھے۔ واپس آئی تو ناشتے کی سمت اطمینان سے توجہ دینے لگی مگر دادی تو جیسے اس کی منتظر تھیں۔

"وہ شروع سے ایسا تھوڑا ہی تھا پتر! حالات کی ستم ظریفی کی نذر ہو گیا بیچارہ۔"

دادی کے رنجیدہ لہجے میں ملال بھی شامل ہو چکا تھا۔ دیا چند نوالوں سے زیادہ نہ لے سکی اور چائے کا مگ اٹھا کر ناشتہ ختم کیا۔

"ایسے مردوں کو راہ راست پر لایا بھی کیسے جا سکتا ہے دادی! جو سمجھ رکھنے کے باوجود راہ سے بھٹک جائیں۔"

اس کے سخت لہجے میں واضح تلخی اتر آئی۔

"انسان خطا کا پتلا ہے پتر! غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ پھر حالات ہی انسان کو مایوس کرتے ہیں یا حوصلہ مند بناتے ہیں۔ مگر اس غلطی کو نہ سدھارنا ہی اصل غلطی ہے۔ مایوسی سے نہ نکلنا ہی دائمی تباہی ہے۔ بسا اوقات انسان کو خود اپنی غلطی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ یا گناہ کی لذت اور کشش ہی اسے اتنا مسحور کر دیا کرتی ہے کہ اندر کا یہ فطری احساس دھیما پڑ جاتا ہے یا مٹ کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں اس سے وابستہ لوگوں کا فرض ہے کہ اسے بھلائی اور ہدایت کے رستے کی طرف بلائیں اور پھر بیوی کا رشتہ تو ایسا رشتہ ہے جو بہت مضبوط ہی نہیں بہت قریبی بھی ہوتا ہے۔ عورت اپنے مرد سے پیار محبت اور توجہ دے کر جو چاہے کرا لے۔ مرد کی کمزوری بنایا ہے قدرت نے عورت کو۔ اس کے بغیر مرد کبھی خود کو مکمل اور آسودہ محسوس نہیں کرتا اور خاص طور پر وہ عورت جس سے مرد کو محبت ہو۔ وہ مرد سے کچھ بھی کروا لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

دادی کے الفاظ میں ایسی تاثیر تھی جو دلوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ وہ بھی غصہ بھول کر مسکرانے لگی۔

"ہاں یاد آیا۔ آپ نے بتایا تھا مجھے، دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ پھر تو رضیہ نے واقعی عجیب حرکت کی۔"

دادی نے اس کی بات پر گہرا سانس بھرا تھا۔

"پتر اس رشتے میں اگر پہلے محبت نہ بھی ہو تو بعد میں اللہ کی طرف سے ڈال دی جاتی ہے۔ دو انجان غیر اور اجنبی انسان ایک ہوتے ہیں تو اللہ ہی ہے جو انہیں ایک دوسرے کو پیار کرنے اور سمجھوتے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ان میں بھی محبت تھی۔ مگر حالات کے بدلتے رخ نے رضیہ کو کمزور کر دیا۔ ذمہ داری نبھانے کی بجائے وہ بری الذمہ ہو گئی۔ شاکی اور بیزار..... اب نقصان سامنے ہے۔ نیک اور پارسا عورت وہی ہے جو رشتہ ازدواج کو خوبصورتی سے نبھاتی ہے۔ اس رشتے میں توازن رکھنے میں سب سے زیادہ کردار ہی بیوی کا ہوتا ہے۔ تحمل مزاج اور خوش اخلاق عورت نہ صرف اپنے شوہر کے دل پر راج کرتی ہے بلکہ اسے غلط راستے سے صحیح پر بھی لا سکتی ہے۔ رضیہ کے شوہر کی زندگی تو اتنی ہی تھی۔ مگر جس انداز میں اس کی موت ہوئی اس میں یقیناً حالات کے ساتھ ساتھ رضیہ کی بھی کوتاہی اور زیادتی شامل رہی ہے۔"

دادی نے حسب عادت طویل لیکچر دیا تھا۔ پھر اس رنج و ملال کے انداز میں گھٹنوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈالتی اٹھی تھیں۔

"دروازہ بند کر لو اور میری آواز پہچان کر ہی کھولنا۔"

دادی تاکید کرتی چلی گئیں۔ دیا ان کے پیچھے ڈیوڑھی تک آئی۔ دروازہ بند کیا اور نیم گیلا صحن عبور کر کے پھر سے کمرے میں آ گئی۔ اس کی سوچوں کا محور رضیہ اور اس کے بچے ہی تھے۔ پتہ نہیں جو دادی کہہ رہی تھیں وہ کتنے فیصد صحیح تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہلکان تھی کہ عورت سے ہی ہر کوئی کیوں قربانی مانگتا ہے۔ اس کا شوہر، اس کے بچے اس کے گھر والے اور یہ معاشرہ بھی۔ وہ جتنا سوچتی اسی قدر آزردہ ہوتی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

پچھلے کئی دنوں سے چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ آج بھی صبح سے لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ کبھی تیز بوچھاڑ کبھی ہلکی پھلکی اور ایسی ہی ہلکی پھلکی پھوار میں بابا، امی، ذیشان اور لائبہ جب اچانک بنا کسی اطلاع کے چلے آئے تو اس کی خوشی کا جیسے کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ چہرا جو پہلے ہی کم روشن نہیں تھا اس پل کچھ اور بھی جگمگا اٹھا۔ وہ سب سے پہلے بھاگ کر بابا کے کاندھے سے لگی تھی۔

"آپ سب سے زیادہ یاد آتے ہیں مجھے۔"

"بابا نہیں۔ صاف کہیں ان کی لاڈیاں اور فرمائشیں پوری کرنا مس کرتی ہیں آپ۔"

لائبہ نے چہک کر کہا تھا وہ اسے گھورنے لگی۔ لائبہ نے ہنستے ہوئے اسے گلے لگایا تھا۔

"رئیلی میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔" وہ اس کے گال کو چوم کر مستی میں بولی۔ دیا نے اس

مکے پر اسے ایک زور کی دھپ لگادی۔

"اچھا چھوڑو۔ امی اور ذیشان سے تو ملنے دو۔"

وہ زبردستی اس سے الگ ہوئی پھر ماں اور بھائی سے بھی اسی جوش سے ملی تھی۔

"میں بہت اداس رہنے لگی ہوں امی! ختم کردیں یہ سزا۔ ہم سب اکٹھے بھی تو مل کر رہ سکتے ہیں۔" وہ ملتجی ہوئی اور ذیشان دانت نکالنے لگا۔

"جی ہاں..... رہ سکتے ہیں مگر ہم سب۔ آپ نہیں۔"

"کیوں؟ میں کیوں نہیں؟" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"بھئی آپ کو سسرال بھیجنے کا ارادہ بن گیا ہے نا۔"

ذیشان کے چہک کر دیئے جواب نے دیا کا چہرا فق کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے بے اختیار امی کو دیکھا جو ذیشان کو گھور رہی تھیں۔ یعنی یہ خاموش اشارہ تھا زبان بندی کا۔ دیا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ شاکی سی ہوتی اٹھی تھی جب ذیشان نے اس سے پکوڑوں اور گلگلوں کی فرمائش کر دی۔ وہ کچن میں آئی تو امی بھی ہمراہ ہو لی تھیں۔ بابا حسب عادت آتے ہوئے ڈھیروں سامان لائے تھے۔ جسے امی ان کے ٹھکانوں پر پہنچا رہی تھیں۔ ساتھ لائبہ مدد کرانے لگی۔ ساری سبزیاں دھو کر فریج میں رکھیں۔ جام، انڈے اور ڈبل روٹی کے پیکٹ بھی سلیقے سے فریج میں رکھ دیئے۔ وہ گم صم سی پالک کاٹتی رہی۔ امی نے کام کے دوران اک دو بار اسے دیکھا ضرور تھا۔ کچھ کہنے سے گریز برتا۔ اس کا رزلٹ آ چکا تھا۔ وہ جانتی تھیں اب وہ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے۔ جبکہ امی اور دادی کا خیال پختہ تھا اس کی شادی کا۔ دونوں اپنی بات پر قائم بھی تھیں۔

پچھلے دنوں امی کی کوششوں کے نتیجے میں اک دو اچھے رشتے بھی آئے تھے۔ امی آج اسی سلسلے میں دادی کے پاس آئی تھیں۔ یہاں سے ساس بہو کا ارادہ بابا کے ساتھ جا کر لڑکا دیکھنے کا تھا۔ یہ ساری اطلاعات ابھی کچھ دیر قبل اسے ذیشان دے چکا تھا۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔

"کیوں پیچھے پڑ گئی ہیں آخر امی میرے؟ پڑھ تو لینے دیں سکون سے۔"

وہ جھنجھلا گئی تھی۔ جبھی چیخی۔

"ہم ہمیشہ کے لیے آپ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں بجو! قسم سے وہاں آپ کے بغیر اتنا مزا آ رہا ہے کہ بس کیا ہی بتاؤں۔ نہ فکر نہ فاقہ بس عیش کر کاکا۔"

وہ جھوم رہا تھا۔ گنگنا رہا تھا اور یقیناً اسے چھیڑ رہا تھا مگر دیا کی آنکھیں جانے کس احساس کے تحت لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔

"جان چھڑانا ہے تو مجھے کسی کنویں میں دھکا دے آؤ نا۔"

وہ اسے دھکا مار کر ہذیانی ہو کر بولی۔ ذیشان تو بوکھلا سا گیا تھا۔

"ارے رے..... اک ہینڈسم سے بندے کو بھلا ہم کیوں اتنی پیاری سی لڑکی سے محروم کریں۔ قسم سے بہت ڈیشنگ ہیں۔ دیکھیں گی تو بس دیکھتی رہ جائیں گی۔"

ذیشان نے اسے چپ کرانے بہلانے کو کہا تھا۔ وہ ہونٹ کچلتی رہی اور بھیگی آنکھوں سے اسے گھورا۔

"وہ جتنا بھی ہینڈسم ہو۔ مگر سن لو مجھے ماسٹرز کرنا ہے۔ میں بابا سے خود بات کر لوں گی۔ اور اس نے یہ محض دھمکی نہیں دی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد جب وہ سب کمرے میں دہکتی انگیٹھی سے آگ تاپتے چائے اور ابلے ہوئے انڈوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے تب دیا نے اپنے ازلی اعتماد کے ساتھ یہ بات بابا سے کہہ ڈالی تھی۔

"ہاں تو پڑھ لینا ہم کون سا منگنی کے ساتھ ہی فوراً شادی بھی کر دیں گے۔ ابھی تو صرف لڑکا دیکھنے جانا ہے۔"

جواب بابا کی بجائے امی کی طرف سے آیا تھا۔ جنہیں اس کا یوں منہ پھاڑ کر شادی سے باپ کو منع کرنا ایک آنکھ نہیں بھا سکا تھا۔ جب ہی بے حد جزبز ہو کر بولی تھیں۔ بابا کے تاثرات البتہ نارمل تھے۔ وہ بچوں کو اپنی آزادانہ رائے دینے کے حامی تھے۔

"آپ فکر نہ کریں بیٹے! اگر آپ ماسٹرز کرنا چاہتی ہیں تو ڈونٹ یو وری۔ ہم آپ کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہی آپ کی شادی کریں گے۔"

ان کی تسلی نے امی کو سب سے زیادہ برافروختہ کیا تھا۔ جبھی ناگواری دبائے بغیر بول پڑی تھیں۔

"میں کہے دے رہی ہوں اگر لڑکا مجھے پسند آ گیا تو میں ہرگز یہ رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔ آج کل پتہ ہے کتنی مشکل ہوتی ہے اچھا بر ڈھونڈنے میں۔ صاحبزادی کے مزاج نہیں ملتے اس پر بابا ہیں کہ ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں۔"

انہوں نے پہلی تنبیہ بابا اور دیا کو جبکہ آخری بات شکایتی انداز میں دادی کو سنا کر کہی تھی۔ ساتھ ہی اپنا ارادہ بھی ظاہر کر دیا۔ دیا پھر سے بے چین مضطرب ہونے لگی۔

"تو بیگم صاحبہ آپ اپنا کام کریں۔ اگر لڑکا واقعی اچھا ہوا تو ہم بھی پاگل نہیں جو انکار کر دیں۔"

بابا کے کہنے کی دیر ہوئی دیا تحت احتجاجی انداز میں روہانسی ہوتی جھٹکے سے اٹھی تھی۔ اسے نرم نظروں سے تکتے بابا محبت و شفقت سے مسکرائے مگر وہ بھرپور ناراضی دکھاتی دھپ دھپ کرتی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی اور کچن میں آ کر بخ بخ کر ایک ایک برتن دھونے لگی۔ بابا سب کے بیچ سے اٹھ کر اس کے پیچھے وہاں آئے تھے۔

”خفا کیوں ہوتی ہو بیٹے! منگنی ہونے میں بھلا کیا حرج ہے۔ آئی پرامس وویو۔ شادی ہم آپ کی تعلیم مکمل ہونے پر کریں گے۔ آپ کی ماں بھی خوش ہو جائے گی۔ چلو اب مسکرا کر دکھاؤ اپنے بابا کو۔“

وہ ہر صورت اس کا موڈ بحال کرنے کے متمنی تھے۔ وہ جھینپ کر مسکرا دی۔ بابا مطمئن ہونے لگے۔

☆......☆......☆

بابا دیا کا ایڈمیشن یونیورسٹی میں کرانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ادھر امی کو رشتہ بھی جی جان سے پسند آ چکا تھا۔ آتے ہوئے ساتھ لڑکے کی تصویر بھی لائیں۔ اب لڑکے والوں کو اسے دیکھنے آنا تھا۔ دیا، دادی کو قائل کر رہی تھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ شہر چلیں۔ دادی کسی طور بھی آمادہ نہ تھیں۔ دیا انہیں اکیلے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ انہیں رسانیت اور محبت سے قائل کر رہی تھی اور یہ اس کی منت سماجت ہی تھی کہ دادی کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑ گئے تھے۔ وجہ یہی تھی کہ وہ ان کے بیٹے کی پہلی اولاد ہونے کے باعث اسے بے حد عزیز تھی۔ جب اس نے ناراضی دکھائی تو انہیں مانتے ہی بن پڑی تھی۔

دو دن بعد بابا نے انہیں لینے آنا تھا۔ دادی آج کل اپنی ہمسایوں سے ملتی پھرتی تھیں اور رخصت لیتی تھیں۔ اپنا گھر چھوڑ جانے کے خیال سے اداس بھی لگتی تھیں۔ یہ اس گھر میں ان کی آخری رات تھی۔ دادی اپنے بستر پر سکون کی نیند سو رہی تھیں۔ جبکہ دیا کی آنکھ ایک آدھ گھنٹہ کی نیند کے بعد کھل گئی تھی۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ یونہی کروٹیں بدلتے جانے کتنا ٹائم بیت گیا۔ رات اپنے اندر ہزاروں بھید چھپائے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے چوکیدار کی سیٹی کی گونجنے والی آواز کے علاوہ اندر باہر خاموشی کا راج تھا۔ معاً یکدم سرد ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ دو گھر چھوڑ کے تیسرا گھر اہل تشیعہ کا تھا۔ جن کی چھت پر نصب سیاہ پرچم کے سرے پر لگے گھنگرو ہوا سے بجتے تو لگتا جیسے آدھی رات کو کوئی چڑیل مستی میں آ کر رقص کرنے لگی ہے۔

دور کہیں سے بھونکتے کتے کی آواز اور فضا میں دراڑ ڈالتی جھنگروں کی آواز کے ساتھ دادی کے ہلکے خراٹے بھی اس کی بے چینی کا باعث تھے۔ لائبہ بھی سوتے میں خراٹے لیا کرتی تھی اور اسے اتنی

ہی چڑ ہوا کرتی۔ بغیر لحاظ کے اسے جھنجھوڑ کر جگا ڈالتی۔ وہ بیچاری پھر جاگے یا سوئے۔ یہ آرام سے سو جاتی۔ اگلے دن لائبہ ڈھیروں شکایتوں کے ساتھ بابا کے آگے فریادی بنی کھڑی ہوئی مگر اس کے سامنے بھلا اس کی کہاں چلتی تھی۔

”اللہ کرے آپ کا شوہر اتنی زور سے خراٹے لیا کرے کہ آپ سونے کو ترسیں۔“ لائبہ کی ایک نہ چلتی تو وہ بددعاؤں پر اتر آتی۔ اس وقت بھی اسے لائبہ کی بددعا یاد آئی تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر پیاس محسوس کر کے بستر سے اتری تھی اور سرہانے پڑی میز سے پانی کا جگ اٹھایا۔ جو خالی تھا حالانکہ دادی کی عادت تھی رات کو پانی ڈال کر ڈھک کے رکھنے کی۔

”شاید بھول گئی ہوں۔“

وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ باہر جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ مگر پیاس کا شدید احساس حلق میں کانٹے سے چبھونے لگا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد وہ بالآخر پھر سے اٹھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کچھ سوچا پھر دل کڑا کر کے باہر کچن تک جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ دادی کی نیند خراب کرنے کا اس کا دل نہیں چاہا۔ دروازے کی چٹخنی گرائی اور سرہانے پڑی شال اٹھا کر باہر برآمدے میں آ گئی۔

ڈیوڑھی میں جلتے انرجی سیور کی روشنی صحن تک بھی پہنچ رہی تھی۔ چاند غائب تھا۔ ہر شے پر خامشی اور پراسراریت کا تاثر قائم تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی کچن میں آ گئی۔ مدھم سی روشنی کچن کی کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھی۔ اس نے لائٹ آن کیے بغیر سنک سے گلاس اٹھا کر سنک کی ٹونٹی کھول کر گلاس بھرا۔ ابھی گلاس منہ کی جانب لے کر بھی نہیں گئی تھی کہ فضا میں گونج اٹھنے والے فائر کی آواز سے اس کا دل کانپ کر رہ گیا مگر اصل دہشت اس پر اس وقت طاری ہوئی تھی جب منڈیر سے یکے بعد دیگرے کئی سایوں نے صحن میں چھلانگ لگائی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ خوف سے منجمد ہوتی جیسے اپنی جگہ پر سکتہ میں آ گئی تھی۔ پہلا خیال چوروں کا ہی تھا۔

وہ لمبے تڑنگے آدمی جن کے چہروں پر سیاہ ڈھاٹے اور ہاتھوں میں اندھیرے میں چمکتی رائفلیں تھیں۔ دندناتے ہوئے آنگن برآمدے اور پھر کمرے کے کھلے دروازے سے اندر بھی جا گھسے۔ دیا کو اک پل کو لگا اس کا دل مارے خوف کے کسی بھی لمحے بند ہو جائے گا اور وہ ابھی بیہوش ہو کر گر جائے گی۔ خوف سے ساکن آنکھیں لیے وہ اسی حالت میں کھڑی باہر جھانکتی رہی۔ کچن کی لائٹ نہ جلانا اس کے لیے کتنا مفید ثابت ہوا تھا۔

”او بڑھیا! اٹھ۔ تیرے باقی گھر والے کدھر ہیں؟“

اس نے وہیں کھڑے کھڑے اک کرخت آواز سنی تھی۔ اس کی ٹانگیں دادی کا خیال آتے ہی

کانپنے لگیں جو ان وحشیوں کے رحم و کرم پہ آ گئی تھیں جو سفاکیت و بے رحمی میں سرفہرست گردانے جاتے تھے۔ "چابیاں نکال بڑھی! سونا نقدی جو بھی ہے شرافت سے نکال کر ہمارے حوالے کر دے۔ اور کیا تو گھر میں اکیلی ہے؟"

وہی سفاک آواز پھر گونجی۔ دیا کا دل دھک دھک کرنے لگا تو جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ جانے دادی کیا کہتی اب۔

"یقیناً نہیں ...... بڑھی کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ کھلا ہوا دروازہ اور خالی بستر گواہ ہے کسی دوسرے کی موجودگی کا۔ کہاں ہے وہ؟ کہیں اسے پتہ تو نہیں چل گیا ہماری موجودگی کا اور ...... یقیناً مائی کا بابا ہوگا۔ واش روم چیک کرو امانت اور اسے فوراً قابو کرو۔"

ایک اور گمبھیر تر بھاری آواز گونجی۔ جس میں بلا کا یقین اور استحکام تھا۔ دیا کو اپنا وجود سن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یقیناً اب اس کی خیر نہیں تھی۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کو ان وحشی درندوں کو یقیناً زیادہ ٹائم نہیں لگنا تھا۔ برآمدے کے پاس کھڑا ہوا آدمی چوکنے انداز میں آگے بڑھا تھا۔ اس کا رخ واش روم کی جانب تھا۔ دیا کے دماغ نے لمحے کے ہزارویں حصے میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے نظریں گھما کر اپنے دفاع کے لیے کسی چیز کو تلاشا تھا۔ معاً اس کی نظر کچن کی سلیب پہ چاول پکانے کے بھاری مضبوط چمچے پر پڑی۔ اس نے سرعت سے وہی اٹھا لیا تھا اور اسی محتاط انداز میں دروازے کی اوٹ میں ہو کر کھڑی ہو گئی۔

واش روم کو خالی پا کر وہ جانتی تھی ڈھونڈنے والے نے یہاں بھی آنا تھا۔ وہ ہرگز بھی آسان ہدف نہیں ثابت ہونا چاہتی تھی۔ دیا نے لمبے سائے کا رخ اس سمت ہوتا دیکھا تھا اور دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ چمچے کے دستے پر اپنی کانپتی انگلیوں کی گرفت سخت تر کی اور جس پل وہ لمبا آدمی اندر گھسا، دیا نے پوری قوت سے چمچ گھما کر اس پر آؤ تاؤ دیکھے بغیر وار کر دیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی اندر وہ لوگ دادی سے کیا سلوک کر چکے تھے۔ اس کی دھڑکنوں کا شور اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اور کچھ سنائی ہی نہ دیتا تھا۔ اس پل اس کے خوف پر وحشت کا ہیجان آمیز احساس غلبہ پائے ہوئے تھا۔ وہ جیسے ہر انجام سے بے نیاز مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ آنے والے نقاب پوش کو بھلا کسی بھی عام فرد سے ایسی چابک دستی اور پلاننگ کے ساتھ اس بہادری کی توقع نہیں تھی۔ جبھی کچھ لمحوں کو سکتہ زدہ رہ گیا۔ نقاب اس کے چہرے سے اتر گیا تھا اور سر سے بھل بھل بہتا خون اس کی پیشانی اور گردن کے ساتھ دامن کو بھی رنگین کرتا چلا گیا تھا۔

دیا نے دوبارہ اسی شدت سے اس پر حملہ آور ہونا چاہا مگر تب تک وہ اس لمحاتی سکتے سے نکل کر

بلند آواز میں مغلظات بکتا کسی بھیڑیے کی مانند ہی اس پر جھپٹا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اس کی تحویل میں جاتی اور وہ اسے کوئی نقصان پہنچا سکتا۔ اک بھاری بھرکم دبنگ آواز نے فی الفور مداخلت کر دی تھی۔

"امانت ...... چھوڑ دو اسے۔"

دیا نے اس مداخلت غائبانہ پہ بے ساختہ چونک کر سر گھمایا۔ بھاری تن و توش کا وہ طویل القامت شخص نقاب میں چھپا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ تھیں کہ دیا ایک نگاہ ڈال کر ہی دہل سی گئی تھی۔

"کیوں چھوڑ دوں؟ تم دیکھ نہیں رہے ہو اس نے میرا حشر ......"

دوسرا آدمی زخمی درندے کی مانند ہی غرایا تھا مگر آنے والے نے سرد انداز میں ہاتھ اٹھا کر بیچ میں ہی اس کی بات کاٹ ڈالی تھی۔

"تم باہر چل کر گاڑی میں بیٹھو۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

آنے والے لمبے آدمی نے اپنے مخصوص سرد اور دبنگ انداز میں حکم جاری کیا تھا۔ جبکہ اس کا زخمی ساتھی بے حد خفا نظر آ رہا تھا۔ دیا ان دونوں پر دھیان دیئے بغیر وہاں سے بھاگ کر اندر کمرے میں دادی کے پاس آئی تھی اور ہراساں و دہشت زدہ سی بیٹھی دادی سے چمٹ گئی۔ وہ یوں ساکن تھیں جیسے خوف اور شدید صدمے نے ان کی قوت گویائی سلب کر لی ہو۔

"تم سب واپس چلو۔"

اسی لمبے سرخ آنکھوں والے نے اندر آ کر حکم جاری کیا۔ وہ غالباً ان کا سرغنہ تھا۔ الماری و ٹرنکوں وغیرہ سے سونا نقدی تلاشتے۔ ہنگامہ مچانے والا اور دادی پر گن تانے کھڑا نقاب پوش اس حکم نامے پر ششدر ہو کر رہ گئے۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ یہ ہمارے اصولوں کے منافی ہے کہ ہم ......"

"ڈونٹ وری! ہم یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔"

اپنے ساتھیوں کو تسلی سے نوازتے اس لمبے آدمی نے دیا کو اپنی خوفناک سرد آنکھوں سے جیسے دیکھا تھا۔ اس انداز نے دیا کا دھڑکتا دل یکدم بند کر کے رکھ دیا۔ اس سے قبل کہ وہ اور دادی کچھ سمجھ پاتیں اس لمبے آدمی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بیدردی و سفاکی سے دیا کو اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ دادی بے اختیار چیخیں۔ اس مقام پہ ان پر طاری سکتہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ جبکہ دیا کے حلق سے نکلنے والی چیخ کا گلا بیہوشی کی دوا میں بھیگے رومال نے اس کے چہرے کے نزدیک آتے ہی گھونٹ کے رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد دیا کو لگا تھا ہر شے پر اندھیرے مسلط ہو گئے ہوں اس کی قسمت کی طرح۔ اس کے وجود کی طرح۔

☆ ☆ ☆

رات تاریک اور خاموش تھی۔ رات بھر گرنے والی اوس میں بھیگی سڑک پہ تیزی سے آگے بڑھتی جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں پڑتیں تو شفاف بوندوں سے منعکس ہو کر جگمگا ہو اٹھتیں۔ سڑک کے دونوں اطراف کھڑے درخت بھی یوں ساکن تھے جیسے پتھرا گئے ہوں۔ جیپ میں بیٹھے چاروں نفوس خاموش تھے۔ چہروں پہ ہنوز سیاہ ڈھاٹے تھے۔ صرف آنکھیں روشن تھیں۔ وہ چاروں لمبے قدوں اور بھاری جثے کے مالک تھے۔ مگر جوان میں سب سے طویل القامت تھا وہ سب سے چوکنا تھا۔

حالانکہ اس کے پہلو میں سیٹ پہ پڑی لڑکی بالکل بے سدھ تھی۔ اسے احتیاطاً بیہوش کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک ڈاکوؤں کا گروہ تھا۔ جو آج پہلی بار کسی جگہ سے زیورات اور نقدی کی بجائے اس گھر کی عزت چرا لایا تھا۔ اور ایسا ان کے سردار نے کیوں کیا تھا اس بات کو اس گروہ کے باقی تینوں افراد سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان کے سردار کی نظریں گاہے بگاہے بیہوش لڑکی پر اٹھتیں تو وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوب جاتا۔

چاروں اپنی جگہ پر لب بستہ تھے اور گاڑی بہت سرعت سے آگے بڑھتی جاتی تھی۔ چرچ کی سیاہ عمارت کے پیچھے چاند ان کی جیپ کی رفتار کے ساتھ محو سفر لگتا تھا۔ باقاعدہ تعاقب کرتا ہوا۔ دن کے وقت مال کی شکل اور ہوتی ہے۔ مگر اس وقت عمارتیں بہت گرانڈیل، سڑکیں کشادہ اور بتیاں بہت روشن تھیں۔ اکا دکا ہی کوئی گاڑی نظر آتی تھی۔ پوسٹ آفس کی سرخ وسفید سرکاری عمارت سے لے کر کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک۔ رات کے اس پہر صرف سائن بورڈ اور لائٹس روشن تھیں۔ فضا میں تہجد کی اذان کی پکار پھیل رہی تھی جب ایک گجر موٹر سائیکل پر دودھ کے کین لادے کچھ فاصلے سے گزرا۔

گاڑی کے شیشے مکمل طور پر سیاہ تھے۔ باہر سے اندر کا منظر دیکھنا خاص طور پر ناممکن تھا۔ پھر وہ شہر کے مضافات بھی بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے نقاب پوش لمبے آدمی نے گہرا سانس بھر کے گن سائیڈ پر رکھ کر چہرے پہ بندھا رومال اتار دیا۔ اپنے سر کے گھنے لمبے بالوں کو سہلایا پھر بڑھی ہوئی شیو کو کھجاتا ایک بار پھر بیہوش دیا کو تکنے لگا۔ اس کی نظریں بے چین اور مضطرب تھیں۔

وہ جانتا تھا اس کے اس عمل سے اس کے ساتھی اس سے بہت خفا ہیں۔ وہ خود اپنی اس حرکت پہ بہت حیران تھا۔ اپنی بار پہ ششدر تھا۔ یہ لڑکی جتنی بھی پرکشش تھی مگر اس کا یوں ضبط کھو دینا بہت عجیب تھا۔ وہ اسے دیکھ کر دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ..... جو بہت بڑی اور خوابناک تھیں اور ہونٹوں کو بھی ..... جن کی رنگت یاقوت کی طرح تھی۔ اس کے کھڑے ہونے۔ اٹھنے بیٹھنے کے انداز میں انوکھا سا وقار تھا۔ وہ کتنی فرصت سے اسے سوچ سکتا تھا۔ حالانکہ اس کو دیکھے کتنا کم ٹائم ہوا تھا مگر دل پہ

واردات ہونے میں تو بہت ہی عجلت ہوئی تھی۔ وہ جو ہمیشہ چھینتا آیا تھا لوٹتا آیا تھا۔ خود کیسے لمحوں میں لٹ گیا تھا۔

امانت کو اسی نے کسی دوسرے فرد کی تلاش میں بھیجا تھا۔ اندر موجود بڑھیا کے لیے دو بندے کافی تھے۔ جب ہی وہ احتیاطاً امانت کے ساتھ ہولیا تاکہ کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نپٹنا پڑے تو آسانی رہے۔ اپنے ساتھیوں کی نسبت وہ بے حد محتاط اور چوکنا ہوا کرتا تھا۔ اپنی اسی سوجھ بوجھ کے باعث وہ آج تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ امانت کو واش روم کی سمت جاتے دیکھ کر اس نے کچن کا رخ کیا تھا۔

کچن کے آگے سے گزرتے اسے کھڑکی کی جالی سے اندر جاتی روشنی میں لہراتا آنچل اور لمبی چوٹی نظر آئی تھی۔ وہ وہیں تھم گیا۔ وہ لڑکی ترچھے زاویے سے کھڑی تھی۔ پھر اس کے دیکھتے ہی اس نے آگے بڑھ کر وہ چمچہ اٹھایا تھا۔ وہ لازمی اس کی حکمت عملی پہ غور کرتا اور اس سمت آتے امانت کو خبردار بھی کرتا اگر جو اس کے حواس سلامت رہے ہوتے۔

چٹکی ہوئی چاندنی جیسا روپ رکھنے والی اس لڑکی میں ایسا کیا تھا جو پہلی نگاہ میں ہی اس کی سدھ بدھ چھین کر لے گیا تھا۔ یہ وہ قطعی سمجھنے سے قاصر رہا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی حسین لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں۔ اس کی زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین، طرح دار اور فیشن ایبل حسنا ئیں آئی تھیں۔ مگر وہ ہمیشہ روڈ اور لاتعلق رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی وقت گزاری کو عورت کی صحبت اختیار کرتے اور اسے دعوت دیتے مگر وہ ہر بار طرح دے جاتا۔

مگر اب اس کے وہی ساتھی جو عورت سے اس کی بیزاری اور گریز سے آگاہ تھے اس کے اچانک فیصلے کے پیچھے محرک سوچ رہے تھے۔

"مال تو تم نے اٹھانے نہیں دیا۔ اس لڑکی کو اٹھا کر لانے کی کیا تک بنتی تھی؟ بتانا پسند کرو گے مستقیم!"

راجو کا ضبط بالآخر جواب دے گیا۔ اس کی نظریں کاٹ دار تھیں اور لہجہ تند و تیز تھا۔ خلیفہ مستقیم نے چونک کر اسے دیکھا اور گہرا سانس کھینچتے ہوئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"اگلے ڈاکے سے میں اپنا حصہ نہیں لوں گا۔ وہ مال سب میں برابر تقسیم ہوگا سوائے میرے۔"

یہ اس بات کا جواب تھا۔ عجیب فیصلہ تھا۔ راجو نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کوئی بہت کڑی ہوئی بات کہنے سے بمشکل روکا۔ وہ اس وقت مستقیم کو طیش دلانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کے غصے کی خطرناکی سے آگاہ تھا۔ پھر ان کا سردار ہونے کی بنا پر اس کا حکم ماننا اور اس کے فیصلے کا احترام کرنا بھی ان پر لازم و ملزوم

تھا۔

"بشیر کو فون ملا۔ اسے کہہ ہمارے پہنچنے سے قبل گھوڑے سمیت منتظر ملے۔"

اس کا مخاطب اب بھی راجو ہی تھا۔ اس کی بھاری بھرکم آواز جیپ کے ماحول میں گونجی۔ اس نے تعمیل میں جیب سے موبائل فون نکالا اور اس کا پیغام آگے اسی سپاٹ انداز میں منتقل کرنے لگا۔ خلیفہ مستقیم قدرے مطمئن ہو کر سیٹ پر ریلکس انداز میں نیم دراز ہو گیا۔ اب وہ پھر اس بیہوش لڑکی کو تکنے لگا تھا۔ اب کی مرتبہ اس کی نگاہوں میں پہلے کا سا تفکر نہیں تھا۔ بلکہ ایک انوکھی چمک تھی۔ جسے اس کے ساتھیوں نے حیرت سے دیکھا تھا۔ آج وہ ہر لحاظ سے گویا انہیں حیران کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اس جیسے بے حس کھردرے جذبات سے عاری شخص نے جیپ کو لگنے والے جھٹکے کے نتیجے میں ڈھلک کر سیٹ سے نیچے گرتی ہنوز بیہوش لڑکی کو اس طرح سنبھالا تھا کہ گویا اپنی گود میں بھر لیا۔ جیپ اب کچی سڑک چھوڑ کر پکی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس طویل سفر کا اختتام جس جگہ پہ جا کر ہوا وہ ایک بے حد ویران علاقہ تھا۔ جہاں دور دور تک آبادی اور ذی روح کا نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ ایک عجیب وحشت انگیز سناٹا چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ ایک طویل و عریض قطعہ ارضی جس پہ اگے لاتعداد درختوں اور خورد رو جھاڑیوں نے اسے جنگل کا روپ دے ڈالا تھا۔ جیپ وہیں آ کے رکی تھی۔ کھٹاک کھٹاک دروازے کھلے اور شفق کی لالی سے ابھرتے سورج کے گولے کے ساتھ وہ چاروں بھی جیپ سے باہر نکل آئے۔ راجو نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر ایک بے ہیت مگر مخصوص آواز نکالی جس کے نتیجے میں جنگل میں سرسراہٹ گونجنے لگی۔ ساتھ ہی گھوڑے کی ہنہناہٹ بھی۔ جھاڑیوں کو ہٹا کر خشک پتوں پر چلتا گھوڑے کی لگام تھامے کچھ توقف سے درختوں کے جھنڈ سے اک ویسا ہی بھاری جثے کا آدمی سامنے آ گیا۔

"کون جائے گا گھوڑے پر؟"

آنے والے کے سوال پر راجو نے تلخ تاثرات کے ساتھ خلیفہ کی جانب اشارہ کیا۔ آنے والے نے پلٹ کر اپنے سردار کو دیکھا جو ان کی سمت متوجہ نہیں تھا۔

"اسے اسیاپے کا کیا کرنا ہے؟ کہو تو واپسی پر ندی میں پھینک آؤں۔"

راجو کا اشارہ ہنوز بیہوش دیا کی جانب تھا۔ لہجہ خار کھایا ہوا تھا۔ جو ظاہر کرتا تھا اس کا موڈ ابھی بھی بری طرح خراب ہے۔ آج ان کے درمیان اک تناؤ کی کیفیت تھی تو وجہ یقیناً دیا کی موجودگی کا باعث تھا۔ خلیفہ مستقیم نے پلٹ کر سرد مگر تادیبی نظروں سے راجو کو دیکھا تھا۔ راجو یکدم ہونٹ بھینچ گیا۔

ایسی تادیبی کا مطلب وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں۔ سب ہی مستقیم کی اس نظر سے خائف رہا کرتے تھے۔ وہ خاموش تھا مگر اس کا موڈ سرد مہر ہی تھا۔ اسی موڈ کے ساتھ خلیفہ مستقیم نے آگے بڑھ کر جیپ کے کھلے دروازے سے جھکتے دیا کو احتیاط اور نرمی کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ امانت کے ساتھ ساتھ حسام اور راجو کو بھی گویا سانپ نے سونگھ لیا تھا۔ وہ برسوں قبل کا واقعہ ابھی تک بھولے نہیں تھے۔

جب صائمہ بائی نے جو اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی تھی ہر ممکن طریقے سے اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اک رات جب ان کے ہاں عیش و طرب کی محفل عروج پر تھی۔ صائمہ کو جانے کیا سوجھی کہ رقص چھوڑ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔ وہاں موجود ان سب کی سیٹیوں اور قہقہوں کا گلا اس وقت گھٹ گیا تھا جب خلیفہ مستقیم نے صائمہ کو ایک جھٹکے سے خود سے الگ کرنے کے بعد زناٹے دار طمانچے سے اس کے حواس واپس ٹھکانے پر پہنچائے تھے۔

"یہ تمیز تمہیں آئندہ بھی میرے قریب آنے سے روکتا رہے گا۔ ہر کوئی ضروری نہیں کہ نفس کا اتنا غلام ہو کہ تم جیسی عورتوں کے ہاتھوں کھلونا بن جائے۔"

اس کے لفظ لفظ میں پھنکار تھی۔ نفرت تھی۔ وہ تن فن کرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ اور اپنے پیچھے بیر تیجی بھرا سناٹا چھوڑ گیا۔ وہ سب اس کی پرہیز گاری اور مضبوط اعصابی کے قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر صائمہ ان کی دل جوئی اور ہمدردی کے باوجود بھڑک رہی تھی اور وہ محفل بدمزگی کے باعث یونہی ختم کر دی گئی۔ راجو اس وقت بھی مستقیم پر بہت خفا ہوا تھا۔

"مانا تم زاہد خشک ہو۔ مگر ہمارا بھی کام خراب کر دیا۔ یار مجھے نہیں لگتا اب وہ واپس آئے کبھی۔"

"تو نہ آئے۔ میں لعنت بھی نہیں بھیجتا اس پر۔"

وہ جواب میں اسی شدید لہجے میں غرایا تھا۔ راجو نے عاجز ہو کر اسے دیکھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو خلیفہ مستقیم! اس عورت کے تعلقات صرف ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ سیاستدانوں اور پولیس افسروں کے بھی دل بہلاتی ہے۔ شدید خطرہ مول لے لیا ہے تم نے۔"

اب کے خلیفہ نے جواب نہیں دیا۔ اس نے جانا تھا راجو کچھ اتنا بھی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اگر وہ انتقام پہ اترتی تو انہیں گرفتار کرا سکتی تھی۔ ٹھکانے کا پتہ ہی تھا۔ بھلے وہ بہت محتاط تھے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر بیہوش کر کے یہاں لائے تھے۔

"تو اس کا یہی حل ہے کہ تم آئندہ اسے نہ بلوانا۔"

اس کے پاس آسان حل موجود تھا۔ راجو جھنجھلانے لگا۔

"ہم ہر کسی پر اعتماد بھی نہیں کر سکتے ہیں۔"
"اعتماد کرنا اتنا ضروری نہیں ہے۔ نہ ہی یہ شیطانی کھیل رچانا۔"
اب کے خلیفہ مستقیم کا لہجہ واضح طور پر طنزیہ ہوا تھا۔ راجو کا چہرا سرخ ہو گیا۔
"مسٹر خلیفہ مستقیم یہ فطری تقاضا ہے۔ ہماری شادیاں نہیں ہو سکتیں۔ ہم اپنی اس خواہش کو
نہیں مار سکتے۔"
وہ اس سے بڑھ کر زہر خند ہو رہا تھا۔ خلیفہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔
"میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی کسی برائی سے
چاہے۔"
خلیفہ کے دو بدو جواب دینے پر راجو کو آگ سی لگ گئی تھی۔
"بہت ضبط ہے تمہیں خود پر۔ مگر میں دیکھوں گا تم ساری عمر اس پرہیز پر قائم رہو گے۔"
اب کہ اس کا انداز خلیفہ کو بھی برا لگ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی سرخیاں اتر
آئیں۔
"میں کبھی گناہ کا یہ راستہ اختیار نہیں کروں گا۔ ویسے بھی عورت ذات کی حقیقت میرے نزدیک
اتنی نہیں کہ اسے اس طرح اپنی کمزوری بنالوں۔"
اس کا لہجہ نفرت کی آنچ سے دہک رہا تھا۔ اور اس نفرت سے تو وہ سب آگاہ تھے۔ ہاں اس کی
وجہ معلوم نہیں تھی کہ وہ کب کسی کے سامنے کھلتا تھا۔ وہ کبھی کسی کو اتنی جرات بھی نہیں دیتا تھا کہ کوئی
کے اندر جھانک سکے۔
"تم گھوڑے پر بیٹھو خلیفہ! میں کرا دیتا ہوں لڑکی کو سوار۔"
دیا سمیت گھوڑے کی پشت پر سوار ہونا مستقیم کے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا جسے محسوس کر
کے ہی حسام اس کی مدد کے خیال سے آگے بڑھا تھا۔ خلیفہ مستقیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا۔
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"
اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی۔ جو حسام کو بہت شدت سے محسوس ہوئی۔ مستقیم ان
کیفیات سے بے نیاز رکاب میں پاؤں اڑا کر گھوڑے پر سوار ہوا تھا اور دیا کو کسی ننھی بچی کی
بہت سہولت سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ایڑھ لگانے سے قبل اس نے اسی سنجیدگی سمیت
حیران ساتھیوں کو دیکھا پھر راجو کو اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔
"احتیاط لازم ہے۔ جلد واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچو۔ میں منتظر ہوں۔ فی امان اللہ!" ا

اس نے لگام کھینچ کر گھوڑا آگے بڑھا دیا تھا۔
"یہ واقعی خلیفہ مستقیم تھا؟ زاہد خشک متقی پرہیزگار۔"
گھوڑے کے ٹاپوں کی دور ہوتی آواز کو سنتا حسام اسی حیرت زدگی کے عالم میں بولا تھا۔
"نہیں ۔۔۔ اس کا بھوت تھا۔"
امانت اب بے ڈھنگے پن سے ہنس رہا تھا۔ حسام نے کاندھے جھٹکے اور جیپ میں بیٹھ کر اسے
اسٹارٹ کرنے لگا۔ دوسری جانب اپنے مخصوص ٹھکانے پر پہنچ کر خلیفہ نے گھوڑا روک لیا تھا۔ پہلے راجو
اترا۔ پھر دیا کو سنبھالے احتیاط سے مستقیم۔
"کیا کرو گے اس لڑکی کا؟"
راجو نے درخت کے تنے سے گھوڑے کی رسی باندھتے بالآخر اہم سوال کر لیا تھا۔ مستقیم جو
درختوں اور کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتا آگے بڑھ رہا تھا اس سوال پر تھم کر اسے تکنے لگا۔ اس کی
آنکھوں میں گہری مسکراہٹ کا رنگ تھا۔
"میں اسے وہاں سے تمہاری بھابھی بنانے ارادے سے ساتھ لایا ہوں۔ یہ تم سب کے
لیے قابل احترام رہے گی ہمیشہ۔ اس صورت بھی کہ میں مر کیوں نہ جاؤں۔ باقی سب کو بھی بتا دینا۔"
اس نے اپنی بات مکمل کی اور جنگل کے وسط میں درختوں کو کاٹ کر بنائی گئی اس رہائش گاہ کے
بند دروازے کو کھول کر اندر چلا گیا راجو حیرت و غیر یقینی سے ساکن وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھ کھلی تو کتنی دیر یونہی پڑی غائب دماغی کی کیفیت میں ماحول کی اجنبیت کو تکتی رہی۔
اسے قطعی یاد نہیں آ سکا تھا کہ وہ کہاں ہے یا اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نے خفیف سی حرکت دے کر
اپنے چہرے کو گھمایا۔ وہ سنگل نواڑی پلنگ تھا جس پر گلابی پھولوں والی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس
بستر پر وہ بالکل چت لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر حتیٰ کہ چھت پر بھی سفید رنگ پھیرا گیا تھا۔
جو کہیں کہیں سے اکھڑ چکا تھا اور اس کے پیچھے پلستر کی دیوار کے بجائے لکڑی کے مضبوط تختے کیلوں کی
مدد سے جڑے نظر آتے تھے۔
کمرے کا اکلوتا دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ دروازے کے ساتھ درمیانے سائز کی ایک میز رکھی
ہوئی تھی جس پر موجود شے کو سفید رومال سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایسی کوئی
شے نہیں تھی جس پر اس کی نگاہ پڑتی۔ اس کے حواس دھیرے دھیرے بحال ہوئے اور ذہن جاگنے لگا تو
یادداشت کے پردے پر وہ دھندلے سے عکس لہرا گئے۔ وہ ہولے ہولے سہی مگر خود پر بیت جانے والی

قیامت سے آگاہ ہوئی تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہوش میں تو آ گئی تھی مگر صدمے نے اس کی
ذہنی حالت مخدوش کر کے رکھ دی تھی۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت اور بے بسی کے ساتھ ساتھ نمی بھی بہت تیزی سے چھلک
چلی گئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل کچھ مزید ڈوب گیا کہ اس کا دوپٹہ اس کے پاس نہیں تھا اس
سراسیمگی کے عالم میں خود کو سمیٹا اور خوف زدہ نگاہوں کو دوپٹے کی تلاش میں دوڑایا۔ جو اسے پلنگ
سرہانے پڑا نظر آ گیا تھا۔ اس نے لپک کر اپنی شال اٹھائی اور خود کو اچھی طرح کور کر لیا۔ پھر بستر
اتر کر دروازے کی جانب لپکی۔ دروازہ یقیناً باہر سے بند تھا۔ جسے کھٹکھٹاتے اور کسی کو مسلسل
پکارتے وہ ہچکیوں سے رونا شروع کر چکی تھی۔ اور جب اس کا گلا مسلسل رونے اور چیخنے سے چھل
تھا۔ تب اس نے اس روح میں اترتے سناٹے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنی تھی۔ اس سے قبل
وہ سنبھل کر پیچھے ہٹتی ہلکے سے کھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔

یہ وہی طویل القامت تھا۔ جس کی آنکھوں میں محض اک نگاہ ڈال کر وہ سہم گئی تھی۔ اس پل
اسے روبرو پا کے اس پر عجیب سی ہیبت طاری ہوتی چلی گئی تو بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔

"ک..... کون ہو تم؟ یہاں کیوں لائے ہو مجھے؟"

آنسو پونچھ کر اس نے کتنی لاچاری کیفیت میں سوال کیا تھا۔

"جو کسی کے گھر میں بنا اجازت بھی دھڑلے سے گھس جائیں لوگ انہیں ڈاکو کہتے ہیں۔ پر
البتہ نام میرا خلیفہ مستقیم ہے۔ ہاں کیوں لایا ہوں کا جواب ہے۔ شاید تم مجھے اچھی لگی ہو۔ بس تمہیں
بار دیکھنے کی خواہش میں میں تمہارے گھر والوں کو زحمت دینا نہیں چاہتا تھا۔"

اطمینان وسکون سے کہتا وہ جیسے مبہم سا ہی مسکرایا تھا۔ اور پلنگ کی پٹی سے ٹک کر اسے بغور
شغل فرمانے لگا۔ کیا شاہانہ انداز گفتگو تھا۔ دیا کے اندر سے غیض وغضب اور اشتعال کی تند لہر
تھی جو سارا خوف اور مصلحت بہا کر لے گئی۔

"گھٹیا، خبیث، کمینے انسان! تم جیسوں کو تو لفظ عزت وحرمت کے ہجے بھی معلوم نہیں
گے۔ نفس کے اگر اتنے ہی غلام ہو تو پھر کسی ایسی جگہ کا در کھٹکھٹایا ہوتا جہاں تم جیسے سیاہ عمل لوگ
ہوس پوری کرنے جاتے ہیں۔"

بے بسی اور لاچاری کی انتہاؤں پر پہنچ کر وہ روہانسی ہو کر چیخ پڑی تھی۔ جبکہ دوسری جانب
درجہ اطمینان بھری کیفیت تھی۔

"مگر مجھے کوئی ایسی ویسی تھرڈ ریٹ نہیں ایک شریف زادی درکار تھی۔ تم اطمینان رکھو

شادی کروں گا تم سے۔"

اپنے تئیں اس نے گویا دیا کو مطمئن کیا تھا مگر اسے تو جیسے آگ لگ گئی تھی۔

"میں تھوکنا بھی پسند نہ کروں تم پر۔ دو ٹکے کے معمولی انسان! اوقات کیا ہے تمہاری؟"

اس ڈھٹائی کے اعلیٰ مظاہرے نے دیا کا دماغ ہی سلگا ڈالا تھا۔ مستقیم کو خود پر بے تحاشہ ضبط کرنا
پڑا۔ توہین کے شدید تر احساس نے اس کا چہرا یکدم بے تحاشا سرخ کر ڈالا تھا۔

"دیکھو لڑکی کیا نام ہے تمہارا....."

"جو بھی ہو۔ تم سے مطلب؟ بس مجھے واپس چھوڑ کے آؤ۔"

وہ جواباً پھاڑ کھانے کو دوڑی۔ اس کا غصہ ہر گزرتے لمحے بڑھ رہا تھا۔ صدمے پر طیش اور جنون
ہر لمحہ غالب آتا جا رہا تھا۔ یہ خیال یہ احساس ہی سنگین تر تھا کہ وہ کسی کی معمولی خواہش کی بھینٹ چڑھا
دی گئی ہے۔

"بہتر یہی ہے کہ اب تم واپسی کو بھول جاؤ۔ مستقیم اک بار جس چیز کو نگاہ بھر کے دیکھ لے۔ جس
کی انجانے میں بھی خواہش کر بیٹھے۔ وہ چیز ہمیشہ کے لیے خلیفہ مستقیم کے قبضے میں آ کر اس کی غلام بن
جایا کرتی ہے۔"

"مستقیم کا لہجہ سفاکانہ تھا۔ دیا کے ہٹ دھرم انداز نے گویا بھڑکا کے رکھ دیا تھا اسے پل بھر
میں۔ دیا کے اعصاب پر جیسے کوئی طاقتور بم گر کر پھٹا تھا۔ وہ اندر تک ہل کر رہ گئی۔ رنگ فق ہوا مگر وہ
بہرحال اس لمحے خود کو کمزور ثابت کر کے ہمیشہ کی ہار اپنے نام کرانا نہیں چاہتی تھی۔ اس اچانک
حادثے نے اسے یکدم کتنا مضبوط اور نڈر بنا دیا تھا۔ ہر خطرے سے کھیلنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ
اپنی ہمت پہ خود حیران ہوتی اگر غور کرتی تو۔ جبھی جواباً بولی نہیں غرائی تھی۔

"میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ جیتی جاگتی انسان ہوں۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ مجھے واپس
چھوڑ کر آؤ۔ ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔"

اس کے لہجے کی تندی میں تنبیہ بھی تھی۔ جسے محسوس کر کے خلیفہ مستقیم بے ساختہ مسکرایا۔ اس کی
مسکراہٹ ایسی ہی تھی جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی بے تکی مگر معصوم فرمائش پر مسکرا دے۔ دیا نے اس
مسکان کو محسوس کرتے ہی ہونٹوں کو سختی سے بھینچا تھا۔ خلیفہ مستقیم اپنی جگہ سے اٹھا اور نپے تلے قدم اٹھاتا اس
کے نزدیک آ گیا۔ دیا اسے اپنی جانب بڑھتے پا کر اضطراب کی کیفیت میں غیر شعوری طور پر الٹے
قدموں پیچھے ہٹتی دیوار سے جا لگی تھی۔ اب اس کے اور خلیفہ مستقیم کے بیچ فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔
وہ سانس روکے، آنکھیں پھیلائے ہراساں سی بے بس انداز میں اسے تکنے لگی۔

"دیکھو پیاری لڑکی! تمہاری واپسی کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ ساری کشتیاں جل گئی ہیں۔ واپسی کو سرے سے بھول جاؤ۔ بس خلیفہ مستقیم کو یاد رکھو۔ اب تمہاری زندگی کو مجھ پر شروع ہو کر مجھ پر ہی ختم ہونا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہنسی خوشی اس حقیقت کو تسلیم کر لو۔ ورنہ مجھے اپنی بات زبردستی منوانا پڑے گی۔ اور وہ طریقہ اتنا مہذب نہیں ہوگا۔ مان جاؤ لڑکی کہ پہلی بار تو مجھے دل نے اکسایا ہے کہ کسی سے محبت کر کے دیکھوں۔"

بات کے اختتام پہ وہ اس کے صدمے، دکھ اور اذیت کی کیفیت میں ذرا سے کھلے ہونٹوں کو چھو کر دانستہ مسکرایا جبکہ اس کی نظروں کی جنوں خیزی کو سہتی، اسے گستاخی پہ پوری طرح آمادہ پاتی دیا کو بے بسی اور لاچاری کے شدید احساس نے آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ خلیفہ مستقیم نے اسے یوں بکھر کر روتے دیکھا تو گہرا سانس بھر کے فاصلہ بڑھایا۔ وہ پلٹ کر جا رہا تھا جب دیا بھاگ کر اس کے راستے میں آئی تھی۔

"دیکھو...... یہ ظلم مت کرو۔ میں تمہیں تمہاری سب سے عزیز ہستی کا واسطہ دیتی ہوں۔ رحم کرو مجھ پہ۔ یہ ذلت برداشت نہیں ہوگی مجھ سے۔ مر جاؤں گی میں۔"

بچوں کی طرح رو کر ہچکیاں بھرتے وہ اس کی منت کر رہی تھی۔ کوئی راہ نہ کھلی پا کر وہ کسی بھی ممکن طریقے سے اس اندھیری ذلت بھری بندگلی سے نکل بھاگنے پر کمربستہ تھی۔ خلیفہ مستقیم نے جھلتی نظروں سے اسے کچھ دیر تک دیکھا تھا۔

"خلیفہ مستقیم اتنا بے وقعت نہیں ہے کہ اتنی چاہت اور محبت سے کسی کو اپنانے کی خواہش ظاہر کرے اور وہ یوں بے احتیاطی اور نخوت بھرے انداز میں منہ پھیر لے۔ تمہیں میری اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔"

اس کے لہجے میں توہین کے احساس نے تپش بھر دی تھی۔ ماتھے کی تیوریاں اور آنکھوں سے چھوٹتے شعلے دیا کے غیض کو مزید ہوا دینے کا باعث بنے۔

"تو تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اتنی ازراں ہوں کہ تم مجھے اپنے نفس کی تسکین کی خاطر اٹھا لاؤ اور میں اسے اپنی خوش بختی سے تعبیر کر کے قہقہے لگاتی پھروں...... اور سنو تمہاری اہمیت کا ہی تو اچھی طرح اندازہ ہوا ہے مجھے۔ اک ڈاکو کی کیا حیثیت کیا عزت ہوتی ہے سب کی نظروں میں جاننا چاہو گے؟ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لوگ تمہیں اور ایسا کرنے میں وہ بالکل حق بجانب ہیں تم اسی قابل ہو۔"

وہ کسی آتش فشاں لاوے کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ لہجے کا زہریلا پن اور بلا کی نفرت کے ساتھ تحقیر آمیز استہزائیہ انداز خلیفہ مستقیم کو آپے سے باہر کر کے رکھ گیا۔ ہاں یہی تو تھی اس کی حقیقت یہی تھا وہ تلخ سچ جسے اک عرصے تک وہ ہضم نہیں کر پایا تھا۔ اور ان گزشتہ چند سالوں میں جب جب بھی کسی نے اس کے سامنے آئینہ رکھا تو اس سے اپنی صورت کی سیاہی برداشت کرنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی احساس ذلت کے سبب اس پر خون سوار ہو گیا۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس نے بنا کسی لحاظ کے اک زنانے کا تھپڑ دیا کے گال پہ دے مارا تھا۔

"آئی ڈونٹ کیئر...... سو بار دیکھیں وہ مجھے نفرت کی نظر سے۔ مجھے ہرگز کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سب لوگ خلیفہ مستقیم کے جوتے کی نوک پہ ہیں مگر تم...... تم مجھ سے لازمی محبت کرو گی۔ ضرور کرو گی۔ اس لیے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ اور جو میں چاہوں ویسا ہونا ضروری ہے۔ ہر صورت ہر قیمت پہ۔ ورنہ میں آگ لگا دیا کرتا ہوں۔ ہر اس شے کو جو میری مرضی کے مطابق نہ ہو۔ میں تمہیں بھی جلا ڈالوں گا۔ سنا تم نے؟ سنا؟"

وہ یقیناً حواسوں میں نہیں تھا۔ عجیب مجنونانہ ابلتا ہوا طیش تھا۔ دیا تو حق دق رہ گئی تھی۔ رونا بھول کر سہمی ہوئی خوف سے پھیلی نظروں سے اسے تکنے لگی۔ پورا جسم خزاں زدہ پتے کی مانند کانپتا تھا۔ خلیفہ مستقیم کتنی دیر ٹہلتا اور گہرے سانس بھر کے خود پر قابو پاتا رہا۔ پھر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے اس نے اپنی لہو رنگ دہکتی آنکھوں کو اس کے ہنوز خائف اور سہمے ہوئے چہرے پہ ٹکا کر غضبناک مگر مدھم آواز میں اسے اگلی تنبیہ کی تھی۔

"میں کل تک کا وقت دیتا ہوں تم سوچ لو اچھی طرح۔ پھر فیصلہ کرنا۔ مگر یاد رہے فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے۔ اب میں کل ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ کھانا رکھا ہے کھا لینا۔"

وہ پلٹ کر باہر نکلا اور دروازہ بند ہو گیا۔

"یہ تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ مجھ سے میری انا، میرا وقار اور میرے والدین چھین کر تم چاہتے ہو میں تمہیں خوشی دوں۔ تم جیسے لٹیرے کو؟"

اس نے دروازے کے باہر موجود خلیفہ مستقیم کو ہی سنوایا تھا جیسے بہت چیخ کر۔ مگر وہ پلٹ کر اندر نہیں آیا۔ اس نے اس کے دور ہوتے قدموں کی آہٹ سنی اور بے بسی کو اپنا گھیراؤ کرتے پا کر گھٹنوں کے بل زمین پہ گر گئی۔ اسے لگ رہا تھا اس کا وجود آہنی زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جنبش نہیں کر سکتی۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ بے ساختہ و بے اختیار گھٹ گھٹ کر روتی چلی گئی تھی۔

☆......☆......☆

وہ نیم تاریک کمرا تھا۔ جس کی واحد کھڑکی باہر کی طرف سے مضبوطی سے بند تھی۔ اسے وہاں محصور ہوئے کتنا عرصہ بیتا تھا وہ حساب رکھنا بھی چاہتی تو یہ ممکن نہیں تھا۔ اس دوران کئی بار اس کے

لیے کھانے کی ٹرے لائی گئی۔ لانے والا ہر بار خلیفہ مستقیم ہوتا تھا۔ وہ اسے دیکھتی تو نفرت سے منہ پھیر کے بیٹھ جاتی۔ یہاں تک کہ وہ پلٹ کر واپس نہیں چلا جاتا۔ اس وقت بھی وہ اس کے لوٹ جانے کی منتظر تھی کہ وہ قدم بڑھاتا اس کے نزدیک آ گیا۔ دیا اپنی جگہ پر سمٹی اور اپنی شال کو کچھ اور مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس کا چہرا زرد اور ہراساں تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں اپنا خون خشک ہوتا محسوس کرتی تھی۔ اسے اس وحشی درندے سے بہر حال کچھ بھی اچھی امید نہیں تھی۔

"کیا فیصلہ ہے تمہارا؟"

اس پر نگاہیں نکاتے وہ اس کے ستے ہوئے چہرے کو بغور تکتا ہوا بظاہر رسان سے بولا تھا۔ جواب میں خاموشی تھی۔ نظر اندازی تھی۔ غفلت تھی۔ جو خلیفہ مستقیم کو سلگانے آگ لگانے کا باعث بنی۔

"چلو کھانا کھاؤ۔"

اس نے اتنی زور سے اس کی شال پکڑ کر کھینچی کہ وہ بھی ساتھ گھسٹتی آئی۔ اس کی آنکھیں آن کی آن میں خوف کے باعث پھٹنے والی ہو گئیں۔ مگر خلیفہ مستقیم کے چہرے و انداز میں اب نہ کوئی گنجائش تھی نہ نرمی۔

"سنا نہیں تم نے؟ اگر بھوک سے مرنے کا ارادہ ہے تو اتنی آسانی سے کوئی نہیں مرتا سن لو۔"

وہ حلق کے بل غرایا تو دیواریں لرز اٹھیں۔

"نہیں کھاؤں گی۔"

وہ بھی چیخی مگر آنسو بہہ نکلے تھے۔ خلیفہ مستقیم کی جارحیت بڑھی۔ ساتھ میں غصہ جھنجلاہٹ بے بسی اور تلخی بھی۔ یہ لڑکی اس کے نزدیک اہم تھی۔ خاص تھی۔ وہ اس پر سختی نہیں چاہتا تھا مگر وہ اسے سختی پر اکسا رہی تھی۔

"پاگل پن پر مت اترو۔ میں نے کہا نا تمہاری ساری کشتیاں جل گئی ہیں۔"

"پھر مجھے بھی جلا دو۔ مار دو مجھے بھی۔"

وہ ضبط کھو کر زور زور سے رو پڑی۔ خلیفہ مستقیم کے غصے کی بھڑکتی آگ پر جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار دیئے تھے۔ وہ نظریں چراتا بے ساختہ ہونٹ بھینچ گیا۔

"کوئی خود اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچاتا ہے بیوقوف! تم میرے وجود کا حصہ ہو۔ زندگی کی نوید ہو میرے لیے۔ اتنا بے بس کر دیا تم نے اپنی اک جھلک میں مجھے کہ تمہارے بن جینے کا تصور محال ہو گیا۔ جب ہی تو ساتھ لے آیا تھا تمہیں۔ اپنے اصول اپنے قوانین توڑ کر۔"

وہ کتنی محبت کتنی توجہ سے اس کے آنسو اپنی پوروں پر چن رہا تھا۔ انداز فدیانہ تھا۔ لوٹ کر نہ

جانے والا، دیوانگی کی آخری حدوں کو چھوتا، عقیدت مندانہ سا، مگر دیا بدک کر فاصلے پر ہوئی تھی۔۔

"مت چھوؤ مجھے اپنے ناپاک غلیظ ہاتھوں سے۔ مار ڈالا تمہاری اس حرکت نے مجھے۔ اب ساری زندگی خود سے نگاہ نہیں ملا سکوں گی۔ جانے دو مجھے۔ میرے ماں باپ نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا کہ اتنی بڑی سزا بھگتیں۔ ایسی ذلت سہیں۔"

وہ اور بھی شدتوں سے رو رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم نے ہونٹ باہم سختی سے بھینچ لیے۔

"ٹھیک ہے۔ اب میں تب ہی چھوؤں گا تمہیں جب تم حلال ہو جاؤ گی مجھ پر۔ آج شام کو نکاح ہے ہمارا۔ تیار رہنا......"

وہ بھاری آواز میں بولا۔ دیا جیسے ہوا میں معلق ہو گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ خلیفہ مستقیم نے اس کے خوف کی زیادتی سے منجمد ہو جانے والے انداز کو دلچسپی سے دیکھا اور زور سے ہنس پڑا۔

"کم آن یار! شادی کا مژدہ سنایا ہے۔ تم تو ایسے پیلی ہو گئی ہو جیسے دار پر چڑھانے کی بات کہہ دی ہو۔ ریلیکس اتنا پیار دوں گا تمہیں کہ سارے خدشے اور خوف بھول جاؤ گی۔ بس دلہن بننے کی تیاری کرو۔ اتنا خوبصورت لباس منگوایا ہے کہ تمہارا حسن دو آتشہ ہو جائے گا اس میں۔"

"تمہیں کیا پتہ۔ دار پر چڑھنے کے ہی مترادف ہے۔ کاش ان شرمناک حالات سے دوچار ہونے سے قبل ہی مر گئی ہوتی میں۔"

اس نے جیسے اور کچھ سنا ہی نہ تھا۔ زار و قطار روتے ہوئے خود کو کوسنے لگی۔ خلیفہ نے البتہ دھیان دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔

"افوہ اب بس بھی کرو یہ رونا دھونا اور اپنی شادی کی تیاری کرو۔ مجھے رات کو فریش دلہن چاہیے۔"

اس کی بات پر دیا ایک دم سے رونا بھول کر خونخوار نظروں سے اسے حقارت آمیز تاثرات سے تکنے لگی۔ جس کی بے حد گہری پرشوق نظروں کی تاب لانا بس کی بات نہیں تھی۔

"کس نے کہا تمہیں کہ میں اس سرنڈر کے لیے تیار ہو گئی ہوں؟ میں تمہارے مذموم ارادوں کو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دوں گی سن لو تم۔"

اس کے چہرے سے چھلکتی رعونت تلخی اور تنفر کو تکتا خلیفہ مستقیم تھم سا گیا۔ اس نے ابرو اٹھا کر کسی قدر سرد اور تنبیہی نظروں سے دیا کو دیکھا تھا۔

"کیا کرو گی تم؟ مثلاً کر بھی کیا سکتی ہو؟"

اس کے نزدیک ہو کر چلانے کی پرواہ کیے بغیر وہ تاؤ دلاتی مسکان لبوں پر سجا کر بولا تھا۔ یہ مسکان جو شکست کا احساس بخشتی تھی۔ دیا بل کھا کر تلملاتے ہوئے انداز میں آگے بڑھی اور اسی انداز میں اسے زور سے دھکا دیا۔ مستقیم اس سے ایسی توقع رکھتا تھا نہ اس حملے کے لیے تیار تھا جبھی وہ سائڈ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوا تھا۔ اس کا دھکا لگنے سے اس کے پیچھے پڑی میز پر دھرا گلدان زمین بوس ہو کر دو ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ دیا نے چونک کر گلدان کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ پھر کسی خیال کے تحت اس کی آنکھوں کی چمک خطرناک انداز میں بڑھی۔ اگلے لمحے جیسے اس میں پارہ بھر گیا تھا۔ وہ بجلی کی تیزی سے حرکت میں آئی اور جھک کر بجلی کی سی تیزی سے گلدان کا نوکیلا ٹکڑا اٹھا لیا تھا۔ اس سے قبل کہ مستقیم اس کے ارادے کی سنگینی سے آگاہ ہوتا اس نے اسی جنونی کیفیت کے زیر اثر اپنی کلائی انتہائی بیدردی سے کاٹ ڈالی تھی۔

یہ سب کچھ لمحے کے ہزارویں حصے میں ہوا تھا۔ مستقیم تو اس کی کلائی سے فوارے کی مانند ابلتے خون کو دیکھ کر کئی ثانیوں کو بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا۔ اک دھان پان سی ڈرپوک لڑکی سے وہ کہاں ایسی سفاکانہ جرأت کا تصور رکھتا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ حواسوں میں آ کر کچھ کر پاتا دیا نے اپنی دوسری کلائی بھی اسی انداز میں اُدھیڑ ڈالی۔ مستقیم پہ چھایا یہ سکتہ اک دم ٹوٹا۔ وہ ہڑبڑا کر اس پر جھپٹا تھا اور اس کی دونوں کلائیاں پکڑتے ہوئے اسے ایک زوردار جھٹکا دیتے ہوئے غم و غصے سے لرزتی آواز میں بس یہی کہہ پایا۔

"یہ...... یہ کیا کر لیا ہے احمق لڑکی!؟"

اس کی آواز ڈوبتی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر جیسے عظیم نقصان کا تاثر قائم ہو چکا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے۔ مار ڈالوں گی خود کو مگر تمہارے سامنے بے بس نہیں ہوں گی۔"

اس سے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش میں ہلکان وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ مستقیم شدید طیش سے دوچار ہوا تھا مگر جواب دیے بغیر ہونٹ بھینچ کر اس کی کلائیوں کے زخموں کی گہرائی جانچتے اس کے زخموں پر اپنے ہاتھ سختی سے جما کر اس نے وہیں کھڑے کھڑے چیخ کر امانت کو پکارا تھا۔ اس کے بعد اس کی جانب متوجہ ہوا تو اسے ہارے ہوئے انداز میں دیکھتا شکستہ لہجے میں بولا تھا۔

"اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟"

اس کی آواز غم کی شدت سے بھنچی ہوئی تھی۔ دیا کے چہرے پر استہزا دوڑ گیا۔

"اس سے بھی زیادہ۔ کہیں زیادہ۔"

وہ پھنکارنے لگی۔ اور مستقیم اس کے خوبصورت مگر بے رحم چہرے کو تکتا رہا تھا۔ جہاں

تھی۔ بے اعتنائی تھی۔ اکتاہٹ تھی۔ امانت دستک دینے کے بعد اندر آیا۔ مگر دیا کی ابتر حالت نے اسے واضح طور پر ششدر کر کے رکھ دیا۔ اس کی سوالیہ و استعجابی نظریں خلیفہ مستقیم کی جانب اٹھی تھیں۔ جو اس پل بے حد مضمحل اور نڈھال ہو رہا تھا۔

"اس کی مرہم پٹی کرو امانت۔"

وہ بولا تھا تو بس اتنا۔ اس کی آواز ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ ایسے فاصلے پر جا بیٹھا جیسے کچھ بھی ہو جائے اب ہرگز نہیں بولے گا۔ امانت نے سرد آہ بھری اور اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ جبکہ دیا نے بھی مزید مزاحمت کی نہ ہی اختلاف کہ تسلسل سے بہتے خون نے اس پر نقاہت اور خوف طاری کر دیا تھا۔ امانت اپنے کام سے فارغ ہوا پھر اسے کچھ پین کلرز دے کر کھانے کی تاکید کرتا ہوا اٹھ کر خاموشی سے باہر چلا گیا۔ دیا ساکن اور نڈھال بیٹھی رہی۔ وہ امانت کی طرح اب خلیفہ کے جانے کی منتظر تھی۔ اس پر نقاہت کا شدید حملہ تھا اور وہ سونا چاہ رہی تھی مگر خلیفہ کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔

معاً خلیفہ نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اصل اس کی جان اس وقت ہوا ہوئی تھی جب وہ بستر پر اس کے مقابل آ کر بیٹھا۔ دیا نے چونکتے ہوئے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا جس کی گمبھیر چپ معنی خیز تھی۔ دیا کے اندر سنسناہٹ بڑھنے لگی۔ وہ بے اختیار پیچھے سرکی تھی۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہاری ہر بڑی کوشش میری معمولی پیش رفت کے سامنے بے حد حقیر ہے۔ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں ٹھیک ہے میں بھی جبر کا قائل نہیں ہوں۔ مگر کچھ کھیل جبر اور زبردستی میں بھی لطف دیتے ہیں۔ مجھے چھینا جھپٹ لینا برا نہیں لگتا۔ یہ میرا پیشہ بھی ہے۔ تم جانتی ہو نا؟"

اس کا لہجہ سرد بھی تھا۔ سفاک بھی۔ سنگین و مطمئن بھی تھا۔ بے لحاظ تھی۔ دیا کو اپنے حلق میں کچھ اٹکتا ہوا محسوس ہوا تو وجود پر برف گرتی ہوئی۔ وہ ہر لمحہ جیسے اسی قاتل سفاک برف کے جان لیوا بوجھ تلے دب کر ختم ہونے لگی۔

"ک...... کیا مطلب؟"

وہ ہراسگی کی آخری انتہا کو چھو آئی۔ اس کا رنگ پیلا پڑنے لگا۔ خلیفہ مستقیم نے ایک بھرپور اور معنی خیز نظر اس کے وجود پر دوڑائی۔ پھر اس کی آنکھوں میں اپنی بے رحم آنکھیں گاڑھ دیں۔

"مطلب......" وہ ہنسا پھر اسے بھرپور مگر طنزیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر ہر تیسرے دن میرے ساتھی یہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں مگر میں کبھی شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج میں بھی ہر صورت ان فاصلوں کو مٹاؤں گا۔ بہت آزما چکیں تم میرا ضبط۔

میں نکاح کرنا چاہتا تھا تم سے مگر تمہیں شاید پابند ہونا پسند نہیں۔ ایزی وِش...... اب میں......“
اس کی بات پوری سنے بغیر ہی وہ پھپھک پھپھک کر رو پڑی تھی۔ تمام ضبط تمام حوصلے کھو کر

”یا اللہ...... اتنا بڑا امتحان؟ میں مر کیوں نہ گئی؟ ایسا کون سا گناہ تھا جس کی اتنی کڑی سزا
ایسی سخت آزمائش ہے۔“

خلیفہ مستقیم ہونٹ بھینچے اسے یوں بے حال بے اوسان روتا دیکھتا رہا تھا۔ پھر رسانیت سے
تھا۔

”اسی لیے کہتا ہوں کہ نکاح کر لو مجھ سے...... کم از کم ضمیر کے بوجھ سے تو آزاد رہو گی۔
مجھے من مانی سے تو روک نہیں سکتی تم۔“

وہ یونہی روتی رہی تھی۔ وہ اسے سمجھا نہیں رہا تھا گویا کند چھری سے اسے ذبح کر رہا تھا۔
سفاک انسان تھا۔ جسے صرف اپنا مفاد اپنی خواہش کی پرواہ تھی۔ وہ اسے روتے دیکھتا رہا۔ اس
آنسوؤں میں شکست کا رنگ تھا۔ جس مستقیم جیسے زیرک انسان نے محسوس کیا اور چہرے پہ فتح
مسکان بکھر گئی۔

☆......☆......☆

جو قسمت میں لکھ دیا جائے اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ قسمت جو ازل سے ہی ہر انسان کی طے
گئی ہے۔ پھر وہ کیسے اس سے فرار حاصل کر لیتی۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ رہ ہی نہ
کہ وہ خود کو حالات کے سپرد کر دے۔ اس نے تمام مزاحمت ترک کر دی تھی۔ کہتے ہیں نا
شریف انسان کے پاس سب سے زیادہ قیمتی شے اس کی عزت ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی اس
بچانے کی خاطر نکاح پر آمادہ ہو گئی تھی۔ وہ کام جس کا عام حالات میں اس کے آس پاس تصور
تھا۔ مگر اب اسے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ خلیفہ مستقیم کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ اس
شک نہیں تھا کہ اس کی حرکتوں کے بعد اس کی سنگین ترین باتوں کی بدولت ہی وہ آمادہ ہوئی
کی آخری دھمکی اور آخری بات...... جسے بار بار یاد کر کے وہ بے تحاشہ روئی تھی۔

”اگر یہ تمہاری ضد ہے تو میں تمہیں واپس بھی چھوڑ آؤں مگر سوچو تمہیں کوئی قبول کرے
نہیں۔ ہمارا معاشرہ بہت بے حس اور سفاک معاشرہ ہے محترمہ! یہاں برے کو جو حقیقتاً برا ہو
برا نہیں کہتا مگر جسے حالات برا بنا دیں...... یہ دنیا کبھی معاف نہیں کر پاتی۔ اس کے ناکردہ
کے ناکردہ گناہ ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔ ہمارے طبقے کا المیہ یہ بھی ہے کہ یہ گھر سے بھاگنے والی
بے شرم لڑکی اور اغوا ہونے والی بے بس اور مجبور لڑکی میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ ان کے نزدیک

کی حیثیت ایک برابر ہے۔ سلوک ایک برابر ہے بالکل ویسے جیسے اک طوائف اور اک ڈاکو چاہے وہ
تائب ہو جائیں مگر یہ معاف کرنے پر اس کے سابقہ عمل کو بھولنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اپنی حیثیت کا
یقین کر لو پھر مجھے بتا دو۔“

وہ اس کے سارے راستے بند کر کے فیصلے کا اختیار اسے سونپ رہا تھا۔ تھا کوئی اس سے بڑھ کر
ظالم و سفاک۔ دیا کا دل جلنے اور سلگنے لگا۔ وہ غم ناک نظروں سے مگر نفرت کی نظر سے اسے دیکھے گئی۔
اس وقت پوری روئے زمین پر اس کے نزدیک خلیفہ مستقیم سے بڑھ کر کوئی قابل نفرین قابل مذمت
نہیں تھا۔ پھر ان کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد خلیفہ مستقیم اس کے پاس آیا تو کتنا سرشار تھا وہ من پسند
فتح مندی کے احساس سے۔

”میں تمہاری تیاری کے لیے کسی ماہر بیوٹیشن کا انتظام ضرور کرتا مگر سویٹ ہارٹ میں کوئی خطرہ
مول نہیں لینا چاہ رہا۔ اس بیگ میں تمہارے ڈریس کے علاوہ ضرورت کا دیگر سامان بھی موجود ہے۔
مجھے پورا یقین ہے دیا کہ تم کچھ اور آرائش نہ بھی کرو۔ صرف یہ ڈریس ہی پہن لو تو تمہاری جگمگاہٹ
سے میری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ آج میری زندگی کا سب سے اہم دن ہے دیا! اور اسے میں
بھرپور طریقے سے منانے کا خواہاں ہوں۔ تمہیں ساتھ تو دینا پڑے گا میرا۔ تیار ہو جاؤ ہری اپ!“

وہ چند لمحے رک کر متبسم معنی خیز نظروں سے اسے تکتا رہا۔ پھر اس کی خاموشی کو محسوس کرتا ہوا گلا
کھنکار کر بولا تھا۔

”اس راہداری کے آخری سرے پہ جو واش روم ہے وہ صرف میرے استعمال میں ہوتا ہے۔ تم
وہاں جا کے فریش ہو جاؤ۔ اس پورشن میں اس وقت صرف ہم دونوں ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ گی پھر ہی
باقاعدہ جشن کا اہتمام کیا جائے گا۔“

اپنی بات مکمل کر کے کچھ دیر اس کے تاثرات نوٹ کرتا رہا۔ وہ ساکن و سامت بیٹھی تھی۔ البتہ
آنکھوں کی نمی پلکوں کی دہلیز پھلانگ کر چہرے سے گالوں پر اتر آئی۔ جسے دیکھتا خلیفہ مستقیم سرد آہ بھر کے
رہ گیا تھا۔

”کیوں ہلکان کر رہی ہو خود کو؟ دیکھو جب انسان کے پاس اپنی پسند اور مرضی کا اختیار باقی نہ
رہے تو خود کو حالات اور تقدیر کے سپرد کر کے بے فکر ہو جانا چاہیے۔ مجھے اپنے لیے تم بالکل مختلف
انسان پاؤ گی۔ چلو! کھانا کھاؤ اب شاباش۔“

اس کے انداز میں محبت بھی تھی اپنائیت بھی۔ وہ جیسے ہر صورت اس کا دھیان بٹانا، دکھ دور کرنا
چاہ رہا تھا۔ جو ممکن نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس پل اس کی یہ اہمیت بھی دیا کو خار بن کر چبھ رہی

ہے۔ وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ جبھی بے نیازی کی بکل مارے بیٹھی رہی۔ جبکہ خلیفہ مستقیم اس کا منتظر تھا۔ جب ایسا کوئی ارادہ نہیں دیکھا تو خود بڑھ کر ٹرے اٹھائی اور بستر پر ٹکنے کے بعد اپنے اور اس کے درمیان رکھ لی۔

''کھانا کھاؤ۔''

''میں نے کہا نا مجھے نہیں کھانا۔''

اب کے وہ چیخ پڑی تھی مگر مجال ہے جو خلیفہ مستقیم نے برا مانا ہو۔ اسی اطمینان سے پلیٹ اٹھا کر سالن نکالا اور خود نوالہ بنا کر اس کے منہ کی جانب لے آیا۔ دیا جو اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ اس حرکت پر عین اس لمحے آگاہ ہوئی تو صرف چونکی نہیں سٹپٹا بھی گئی تھی۔

''مم...... میں خود کھا لوں گی۔''

وہ عاجز ہوئی۔ اس کے لہجے میں حجاب آمیز کوفت محسوس کر کے خلیفہ مستقیم مسکرانے لگا۔ اسے ریلیکس کرنے کا باعث وہ حجاب کی جھلک تھی جو پہلی بار دیا کے انداز سے جھلکی تھی۔ بہرحال اس کے احساس میں یہ رشتہ اپنا آپ منوا چکا تھا۔

''میں بھی کھلا دوں گا تو کوئی حرج کہاں ہے یار! شوہر بن چکا ہوں اب تو باقاعدہ۔''

وہ اسے آنکھ مار کر شریر انداز میں بولا تھا۔ دیا کا رنگ پھر سے فق ہو گیا۔ آنسو جیسے حلق میں گرنے لگے۔ وہ ہرگز کھانا کھانے پر آمادہ نہیں تھی۔ مگر محض اس سے جان چھڑانے کی خاطر چند نوالے زہر مار کرنے پڑے۔ جبکہ وہ اسے لو دیتی متبسم نظروں کے حصار میں لیے پیار سے تکتا رہا۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو اس طرح میرے احکامات کی تعمیل کرتی ہوئی۔ اسی طرح تعاون کرتی رہنا۔ زندگی بہت خوبصورت گزرے گی بلاشبہ۔''

اس کا شوخ لہجہ معنی خیز بھی تھا ذو معنی بھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں حسین رنگ تھے۔ دیا کا دل ایک دم سے پھر بھر بھر آنے لگا۔ اس نے فوری طور پر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''پلیز...... تنہا چھوڑ دو مجھے۔''

بھرائی ہوئی آواز میں ملتجی ہو کر وہ جیسے کسی بھی پل رو پڑنے کو تیار ہوئی تو مستقیم نے تڑپ اٹھنے والے انداز میں مصنوعی خفگی سے اسے گھور کر دیکھا۔

''نہ نہ...... میری جان! ابھی تو سنگتوں کے موسم اترے ہیں۔ ابھی سے تنہائی کی باتیں مت کرو پچھلے اتنے دنوں سے یہ صورتحال ہے ہماری۔

اکیلا صبح تک تڑپا مریض شام غم تنہا
نہ تم آئے، نہ نیند آئی، نہ چین آیا، نہ موت آئی

اس کی چمکتی نگاہوں کی خیرہ کن چمک میں شوخ تقاضے لہرانے لگے تو دیا کا ضبط بھی جواب دے گیا۔ ایسے بکھر کر آنسو گرے تھے جیسے گلابی مخمل پہ کرسٹل کے موتی بکھر جائیں۔ وہ جو نٹ کھٹ تھی اور جیسے اس روپ میں خلیفہ مستقیم کے لیے سراسر آزمائش سمیٹ لائی تھی۔ جائز ملکیت۔ تنہائی اور من پسند قربت۔ کیسے ممکن تھا وہ اس بہکا دینے والی صورتحال میں خود پر قابو رکھتا جبھی فاصلہ سمٹا تھا اور وہ کتنی بیتابی کس درجہ توجہ و محبت سے اس کے آنسو اپنے ہونٹوں پر کسی تبرک کی طرح چننے لگا تھا۔ دیا کی اب صحیح معنوں میں جان ہوا ہوئی۔ یہ آزمائش آنا تھی جانتی تھی وہ مگر اتنی جلدی...... وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ جبھی بے بسی بیچارگی کے ساتھ ساتھ دکھ کے شدید احساس سمیت اس کی گرفت میں زور سے پھڑ پھڑائی۔

''مم مجھے باتھ لینا ہے۔''

جان چھڑانے اور اس کا دھیان بٹانے کو اسے بروقت بہانہ سوجھا۔ خلیفہ مستقیم نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا اور مسکراہٹ دبائی۔

''امیزنگ! اس کا مطلب تمہیں مجھ سے بھی زیادہ جلدی ہے۔ گڈ گڈ! یار سچ بتاؤ کہیں ابھی سے تو مجھ سے محبت نہیں کرنے لگیں؟''

وہ بے حد و بے حساب شوخی و شرارت لہجے میں سمو کر بولا تو دیا کے رکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔ اور خلیفہ مستقیم پہ چھائی ترنگ اور سرمئی اترنے لگی۔ گہرا سانس بھرتا وہ اسے چھوڑ کر سیدھا ہوا۔

''جاؤ...... میں جانتا ہوں جان چھڑانا چاہتی ہو مجھ سے۔ مگر احمق لڑکی یہ ممکن کہاں ہے؟''

اب وہ سنجیدہ تھا۔ سنجیدہ تو دیا بھی تھی بلکہ غمزدہ اور رنجیدہ بھی۔ جواب دیئے بنا رخ پھیر کے کھڑی رہی۔ مستقیم نے خود اس کا لباس نکالا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واش روم تک لے کر گیا۔

''جان مستقیم جلدی کرنا۔ سب ہمارے منتظر ہیں سنو...... کہیں تمہارے ارادے تو خطرناک نہیں؟''

وہ رکا تھا اور اسے بغور تکنے لگا۔ انداز تشویش زدہ تھا۔ ایسا کہ دیا بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

''خودکشی کا...... بھاگنے کا...... یا پھر اندر بند ہو کر بیٹھ جانے کا۔ دیا اک بات یاد رکھنا۔ مستقیم ہارنے کے لیے نہیں بنا۔ اگر تم نے کچھ بھی غلط کیا تو...... بہت برا ہو گا۔ اتنا کہ تم تصور بھی نہیں رکھتیں۔''

وہ اسے سرزنش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں یکا یک پھر دہکنے لگی تھیں۔ دیا کو اس سے خوف محسوس ہوا تو بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ کسی قدر غصے میں اسے سامنے سے دھکیل کر واش روم میں بند ہو گئی۔ دروازہ اک دھماکے سے بند ہوا تھا۔ مستقیم ذرا سا کھسیا کر رہ گیا۔

اور جب وہ اس سرخ لباس میں اس کے سامنے آئی تو اپنے انداز کی تمام تر بے دلی، یاسیت سوز کے باوجود اس لباس کی خیرہ کن چمک دمک سے بڑھ کر اس کے اپنے سراپے کی خوبصورتی اور نزاکت کمال درجے کی غضب ڈھا رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم کو اس سے نگاہیں ہٹانا دشوار ہو گیا تھا۔

''مائی گاڈ...... تم خوبصورت ہو میں جانتا تھا۔ مگر اس قدر حسین ہو یہ تو ہرگز اندازہ نہیں تھا۔''

وہ لپک کر آیا تھا۔ اسے سہارا دیا اور اسے چلنے میں دشواری کا باعث بنتے اس کے لہنگے کو آگے سے تھوڑا سا اٹھا لیا۔ دیا جو پہلے ہی رو رو کر نڈھال تھی۔ اس کا بازو اپنی کمر کے گرد حمائل محسوس کر کے خود کو اس کی پرحدت پناہوں میں پا کر بالکل شل ہو کر رہ گئی۔ اسے لگا تھا وہ اسی لمحے ضبط کھو کر حواس بھی کھو دے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ابھی اسے بہت سے تکلیف دہ مرحلے طے کرنے تھے۔

☆......☆......☆

یہ ایک کھلا میدان تھا۔ جس کے درمیان میں آگ کا بڑا الاؤ روشن کیا گیا تھا۔ اونچی بلند ترچار دیواری کی منڈیروں پر ٹوٹا کانچ بکھرا ہوا تھا۔ ان کے پار دیو ہیکل درخت تاریکی میں ڈوبے ساکت کھڑے تھے۔ فضا میں جنگلی حشرات الارض کی آوازوں کی ہیبت تھی۔ یہاں باربی کیو کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ الاؤ پہ دو سالم بکرے بھونے جا رہے تھے۔ الاؤ کے گرد بہت خوبصورت ترتیب کے ساتھ کرسیاں بچی تھیں۔ مستقیم اسے سہارا دیئے اپنے ہمراہ لایا تو اس کے ساتھیوں نے بھنگڑا ڈال ''ساڈے گھر آئی بھرجائی'' کی تانیں اڑا کر اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ خلیفہ مستقیم نے اسے ایک کرسی پر نرمی و احتیاط سے بٹھا دیا۔ وہ یوں اسے چھو رہا تھا۔ ایسے ہاتھ لگا رہا تھا جیسے وہ موم سے بنی یا کانچ سے بنائی گئی ہو۔ جسے ذرا سی سختی نقصان دے سکتی ہے۔ اس کا سسکتا ہوا دل آنسوؤں میں ڈوبنے لگا۔

''گو کہ میرا زخم ابھی بھرا نہیں ہے بھاوج مگر میں آپ کو معاف کرتا ہوں۔ آج سے آپ ہماری ماں بہن کے درجے پر فائز ہوئیں۔ خلیفہ مستقیم ہمارا لیڈر ہی نہیں ہمارا ایسا شیر ہے جس کے بغیر ہماری طاقت کچھ بھی نہیں۔ نئی زندگی کے اس آغاز پر ہماری تمام دعائیں اور نیک تمنائیں آپ دونوں کے نام۔''

امانت نے باآواز بلند اعلان کرنے کے انداز میں کہا تھا۔ اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے سلامی کے طور پر کچھ دیا تھا۔ مستقیم منع کرتا رہ گیا مگر وہ سب باری باری آ کے اسی طرح اسے دعا

سے نوازتے اور تحائف دیتے رہے۔

''آج کی رات کو ہم نے خوبصورت بنانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمیں امید ہے بھرجائی آپ کو یہ سب پسند تو ضرور آئے گا۔''

امانت نے پھر بلند آواز میں اسے مخاطب کیا اور فل سائز ڈیک کا بٹن آن کرنے سے پہلے مسکرایا تھا۔

''بھاوج یہ گانا خلیفہ مستقیم کی جانب سے آپ کو ڈیڈی کیٹ کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے۔''

اس کے ساتھ ہی نہ صرف ڈیک کا شور اٹھا تھا بلکہ وہ سب بھی منہ سے آوازیں نکالتے بھنگڑا ڈالنے لگے تھے۔ خلیفہ مستقیم نے گردن موڑ کر مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں حیرانی کا تاثر لیے یہ تماشا ملاحظہ کر رہی تھی۔

''اچھا ہے نا سب؟''

اس کا متوجہ کرنے کا بھی اپنا انداز تھا۔ اپنا کاندھا اس کے کاندھے سے دھیرے سے ٹکرا دیا تھا مگر وہ بے خیال تھی پوری طرح ہل کر رہ گئی اور خالی نظروں سے اسے تکنے لگی۔

''یہ سب کہہ رہے ہیں ہماری جوڑی بہت حسین ہے۔ کیا خیال ہے کچھ تصویریں نہ ہو جائیں۔ ویسے تو تم نے مجھے دیکھنا نہیں ہے۔ شاید تصویریں دیکھ کر جان سکو کہ ہم دونوں کا کپل کتنا پرفیکٹ ہے۔ یوں...... جیسے اک دوجے کے لیے بنے ہیں ہم۔''

اس کا لہجہ سرشاری اور خمار لیے ہوئے تھا۔ اس کی مچلتی مسکان اس کی شوخ نظریں سب اس کی خوشی اور دیا کی دائمی بربادی کی گواہ تھیں۔ دیا کا دل نیچے گہرے پاتال میں گرنے لگا۔ عظیم نقصان کا احساس دل و جان کو ریزہ ریزہ کرنے کا باعث بننے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی نمی سے چمکنے لگیں۔

معاً حسام اور راجو رقص چھوڑ کر بھاگتے ہوئے آئے اور خلیفہ مستقیم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

''یہ محفل آپ کے ہی اعزاز میں سجی ہے جناب! کچھ حصہ آج آپ بھی ڈال لیں۔''

وہ بغیر کسی پس و پیش کے ان کے ساتھ بھنگڑے میں شامل ہو گیا۔ وہی گانا پھر ریپیٹ ہو رہا تھا۔

کوئی دل پہ قابو کر گیا اور عشقا دل میں بھر گیا
آنکھوں آنکھوں میں وہ لاکھوں گلاں کر گیا اوے
ربا میں تو مر گیا شیدائی مجھے کر گیا کر گیا
ربا میں تو مر گیا ، شیدائی مجھے کر گیا کر گیا

دیا ساکن نظروں سے اس کی خوشی اس کی ترنگ دیکھتی رہی اور اپنا دل خون ہوتا محسوس کرتی

رہی۔

اب دل چاہے خامشی سے ہونٹوں پہ میں لکھ دوں پیاری سی باتیں کئی
ہو کچھ پل میرے نام کرے کرے میں بھی اس کے نام نکھوں ملاقاتیں کئی
پہلی ہی تکنی میں بن گئی جان پہ ، نیناں نیناں اس دل پہ چھا گئے
اب جاؤں کہاں پہ یہ دل رکا ہے وہاں پہ
جہاں دیکھ کے مجھے وہ آگے بڑھ گیا اوے
شیدائی مجھے کر گیا کر گیا
ربا میں تو مر گیا شیدائی مجھے کر گیا

وہ اک وجد کی کیفیت میں تھا جیسے ،گانے کے بول حسب حال یوں تو وہ سب کے سب
اونچے لمبے قدوں کے بھرپور سراپے کے مالک تھے مگر اس میں شک وشبہ نہیں تھا کہ خلیفہ مستقیم ان میں
سب سے نمایاں تھا ہر ہر لحاظ سے۔ وہ بہت وجیہہ بھی تھا اور طویل بھی۔ اس نے پہلی بار دھیان سے
اسے دیکھا تب ہی یہ انکشاف بھی ہوا تھا۔ یقیناً شادی کے سلسلے میں یہ اہتمام تھا کہ نہ صرف بالوں
کی کٹنگ کرائی گئی تھی بلکہ تازہ شیو بھی اس کے چہرے کو نکھار کے رکھ گئی تھی۔ خدوخال کی دلکشی اور
انگیزی پوری طرح اجاگر تھی۔ صاف ستھری رنگت گفتگو کے انداز اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی بھی چغلی
کھاتے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ اس راستے پہ دانستہ آ گیا تھا یا کوئی اور محرک؟ وہ بتا چاہے۔ بتا خود
اسے دیکھتے اسے سوچے گئی جبکہ وہ گنگنا رہا تھا۔

موسم کے آزاد پرندے ہاتھوں میں ہیں اس کے

یاد وہ بہاروں کی ہے
سردی کی وہ دھوپ کے جیسی
گرمی کی شام سی ہے
میرے پیار کا موسم بھی ہے
لگے میری محرم بھی ہے
جانے کیا کیا تو آنکھوں میں وہ پڑ گیا اوے
ربا میں تو مر گیا شیدائی مجھے کر گیا کر گیا
کوئی دل پہ قابو کر گیا اور عشق تا دل میں بھر گیا
آنکھوں آنکھوں میں وہ لاکھوں گلاں کر گیا اوے

وہ بے حد خوش تھے اور اب بھنا ہوا گوشت کھانے میں مصروف تھے۔ ساتھ میں شراب کی بوتلیں
کھل رہی تھیں۔ دیا کا دل گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا جب ایک نرے اٹھائے خلیفہ مستقیم اس کی
جانب آ گیا۔

"خود کھاؤ گی یا میں ہی کھلاؤں؟"

اس کی آنکھیں مسکرا کر چھیڑ رہی تھیں۔ دیا نے جلتی آنکھوں سمیت منہ پھیر لیا۔ وہ اس کے
مقابل بیٹھا بھی کتنا بھرپور کیسا چھایا ہوا لگ رہا تھا۔ دیا تو بالکل گڑیا لگنے لگی تھی اس کی ایسی نمایاں ہوتی
ہائیٹ کے سامنے۔ اس کی ذہنی رو جیسے بھٹکنے لگی۔

"اونٹ کی طرح قد نکال رہی ہے۔ کیا آسمان کو ہاتھ لگا کر دم لے گی۔"

امی کو پتہ نہیں کیوں اسے بڑھتے دیکھ کر ہول اٹھنے لگتے اور بابا کو امی کی نظر لگ جانے کا خدشہ
لاحق ہو جایا کرتا۔

"ہر وقت ٹوکا نہ کریں بیگم میری بچی کو۔"

"اونہہ۔۔۔ امی کو کیا پتہ۔ اسمارٹ اور لمبی لڑکیاں ہر جگہ کیسے نمایاں ہوتی ہیں۔ آپ کالج آ کر
میری فورا دیکھیے گا۔ لڑکیاں رشک کرتی ہیں میری ہائیٹ پر۔"

وہ اترا کر کہتی اور بابا کا سیروں خون بڑھ جاتا۔ جبھی اس کی تائید میں لمحہ بھر کی تاخیر نہ کرتے۔

"تو اور کیا۔ تمہاری ماں کو کیا پتہ بیٹے!"

وہ بھی ساتھ مل کر امی کو زچ کرنے لگتے اور وہ کتنا زچ ہو بھی جایا کرتی تھیں۔

"بس کالج تک ہی ہے یہ نور۔۔۔ ارے شادی بھی کرنی ہے اس کی کہ نہیں؟ اتنا اونچا کا اپنے
خاندان میں تو کوئی نہیں۔ یہ تو سب مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ ہے کوئی تک چھ فٹ ہو رہا ہے اس کا
قد۔"

امی بھی کہاں ہار ماننے والی تھیں۔ دیا بابا کے سامنے جھینپ جاتی۔ جبکہ ان کا اطمینان قائم دائم
رہتا۔

"بے فکر رہو۔ اس کے لیے بر تمہیں نہیں ڈھونڈنا۔ جس اللہ نے میری بچی کو پیدا کیا ہے اسے قد
دیا ہے اسی نے اس کا جوڑ بھی اتارا ہو گا۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ میاں قد میں ان سے چھوٹا ہو۔ پھر کتنی عجیب لگے گی ان کی جوڑی۔"

ذیشان کھی کھی کر کے ہنسنے لگتا اور وہ روہانسی ہو جاتی۔ لپک جھپک اسے مارنے کو دوڑتی۔

"خبردار۔۔۔ منحوس، یہ بات دوبارہ نہ کہنا۔ کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔"

زیشان کے ساتھ لائبہ بھی دانت نکالنے لگی۔

"بجو کیا سچ مچ تمہیں چھوٹے قد کے مرد پسند نہیں؟"

"نہیں لیکن میرے ساتھ تو مجھ سے زیادہ ہائیٹ کا ہی بندہ سوٹ کرے گا نا۔"

وہ شرما کر کہتی اور مسکرائے جاتی۔ گلابی چہرے پہ کتنے حسین رنگ بکھر جاتے تھے اور ان رنگوں کو دیکھتے زیشان اور لائبہ با آواز بلند دعا مانگا کرتے۔

"یا اللہ پاک ہماری بجو کو تال اینڈ ہینڈسم دولہا عطا فرمانا آمین۔"

"ثم آمین۔"

وہ شرارت سے کہتی اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ فائز کی آواز پہ وہ ہڑبڑا گئی تو احساس ہوا چہرا آنسوؤں سے تر تھا۔ اسے احساس ہوا دعا مانگتے وقت دعا کی کاملیت کا خیال رکھنا کتنا ضروری ہوا کرتا ہے۔ کاش یہ شخص اتنا شاندار اور مکمل نہ ہوتا مگر اچھا اور نیک انسان ضرور ہوتا۔

"چلو آؤ۔ اب ان کی بدتمیزیاں بڑھیں گی ہی۔"

خلیفہ مستقیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظروں کا مرکز اب وہ نہیں راجو وغیرہ تھے۔ جو فل مستی کے موڈ میں تھے۔ اک دوسرے پہ شراب چھینٹے اور شرارتیں کرتے ہوئے۔ دیا نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اک راہداری سے گزار کر وہ اسے جس کمرے میں لے کر آیا تھا وہ اس کمرے کی نسبت [illegible] تھا۔ جس میں اب تک دیا کا قیام تھا۔ کمرے کا ماحول نیم تاریک تھا۔ جس کے دروازے سے قدم رکھتے ہی مستقیم نے نائٹ بلب روشن کر دیا تھا۔ گڑیا کی شکل کا یہ سرخ بلب تھا جو عام نائٹ بلب کے مقابلے میں بہت کم روشنی دے رہا تھا۔ اتنی کم روشنی کہ کمرے میں دور تک دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ سامنے بستر پر جانے کس رنگ کی چادر تھی وہ نہیں جان سکی کہ پورا بستر گلاب کی پتیوں سے ڈ[illegible] ہوا تھا۔ ماحول میں گلاب اور موتیے کی مسحور کن مہک تھی۔ اس کا دل آنے والے لمحات کے خیال سے ڈوبنے لگا۔ وہ اتنے مضبوط اعصاب کی تھی نہ ہی خدا کی خاص ہستی۔ پھر اتنی بڑی آزمائش۔ اس کا [illegible] جانے کس کس ملال سے سسکنے لگا تو دو موتی پھر اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ جنہیں مستقیم نے دیکھا اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ دھر کے اپنا مقابل کر لیا تھا۔

"ایسا مت کرو دیا! تم میری اندھیری زندگی میں واقعی روشنی بن کر داخل ہوئی ہو۔ مجھے اس خو[illegible] کو خوشی سے محسوس کرنے دو۔ میرے ساتھ اس طرح ریلیکس فیل کرو جیسے کوئی بھی نئی نویلی دلہن اپ[illegible] شوہر سے پہلی بار مل کر سکتی ہے۔ میں نے تمہیں جس طرح بھی حاصل کیا ہے مگر اتنا یقین رکھو کہ [illegible]

تمہیں اپنی قربت اپنی محبت سے نہال کر دوں گا۔ ایک بار... بس ایک بار تم میرے نام ہو جاؤ۔ پھر بے فکری ہی بے فکری ہے۔ یونو واٹ دیا! میں نے اپنی اب تک کی زندگی میں ہر طرح کی عورت کو دیکھا ہے۔ پاس سے گزرنے والی عورت کا بھی شجرۂ نسب بتا سکتا ہوں۔ جانتا ہوں شریف عورت کچے رنگوں کی طرح نہیں ہوتی کہ ہاتھ دھوئے اور رنگ غائب۔ وہ تو جب رنگتی ہے تو گاڑھے رنگ میں رنگتی ہے۔ کبھی نہ اترنے والے پکے رنگ۔ تمہارے جیسی لڑکی کو اسی لیے تو شریک سفر کیا ہے جان مستقیم کہ تم جیسی عورت سے کسی قسم کی بے وفائی کا خطرہ نہیں ہوتا اور تمہیں پتہ ہے۔ جب کوئی عورت کسی مرد سے بے وفائی کرتی ہے تو گویا مرد کی سب سے بڑی توہین کرتی ہے۔

اس کی بے وفائی اس بات کا اعلان ہوتی ہے کہ اس مرد میں کوئی کمی تھی۔ جو اس نے کسی دوسرے میں ڈھونڈنا چاہی۔ اور کم از کم میں تو یہ توہین افورڈ نہیں کر سکتا۔"

وہ کہتا رہا۔ دیا صم بکم بیٹھی رہی۔ گویا کچھ سنا ہو نہ سمجھا ہو۔ مستقیم نے اسے بغور دیکھا پھر مسکراہٹ دبا کر اس کا چہرا اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

"ادھر دیکھو دیا! میری طرف یار! اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں۔ اک دور تھا جب بہت لڑکیاں مرتی تھیں میری وجاہت پہ۔"

وہ کسی قدر شرارت سے کہہ رہا تھا۔ دیا کی بے بسی کی انتہا نہ رہی تھی جیسے جیسی آنکھوں کی سطح پہ چمکتی نمی گالوں پر پھیل آئی۔ جسے مستقیم نے ہونٹوں سے سمیٹا تھا۔ پھر درمیانی فاصلہ سمیٹتے ہوئے اس کے بے حد نزدیک آ گیا اور بوجھل سرگوشی اس کی سماعتوں میں انڈیلی تھی۔

"آج میری قربت میں رونے والی لڑکی آنے والی کل میں میری پناہوں میں آسودہ بھی ضرور ہوگی ان شاء اللہ۔"

دیا کے اندر تک اضطراب بھرنے لگا۔ وہ جتنی وحشت زدہ تھی مستقیم اسی قدر کیف میں ہو رہا تھا۔ اس کا بوجھل لہجہ [illegible] بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اس کے آنسو چنتا تھا۔

مجھے قربتوں کی سزا نہ دے میری چاہتوں کا گلا نہ کر
میری محبتوں پہ نہ یوں تڑپ میری زندگی تیرے نام ہے
تیری بے بسی ہے یہ عارضی میرا پیار تھا ہی تیرے واسطے
میں نے پیار کر کے برا کیا مجھے کیا پتہ میں نے کیا کیا
میری جان میں نے کہا تجھے میرا بھرم ہے تو بتا مجھے
کوئی زخم ہے تو دکھا مجھے میری جان ایسے خفا نہ ہو

میں نے کب کہا مجھے پیار دے

وہ سراپا التفات تھا۔ محبت وعقیدت تھا مگر اس کے لیے امتحان تھا۔ سزا تھا آزمائش تھا بس۔ وہ
سفاک تھا۔ مطلب پرست تھا۔ اور کچھ بھی نہیں۔ وہ سو گیا مگر دیا کی ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی
آنسو آہیں سسکیاں کروٹیں بدلتے بدن ٹوٹنے لگا تھا۔ گریہ وزاری سے آنکھیں جل رہی تھیں۔

یہ تھا اس کا نصیب؟

اس نے بار بار یہ سوچا اور جی چاہا دھاڑیں مار کر روئے۔ جنوں کی آخری حد سے گزر جائے
دل پھٹ جائے۔ ہر احساس سے نجات تو حاصل ہو۔ خلیفہ مستقیم کے لیے یہ قربت جتنی بھی سرشاری
آسودگی اور تسکین کا باعث ہو۔ اسے تو ایک ہی احساس ملا تھا۔ پامالی کا احساس، وہ جیسے خود سے بھی
نگاہیں چار کرنے سے قاصر تھی۔ وہ مرد تھا۔ اظہار میں بڑا بے شرم۔ وہ بے بس عورت تھی۔ پامال
گھائل ہوتی ہوئی۔

وہ روتی رہی۔ فجر کا وقت اسے جاگتے ہوا۔ مگر اس کے دل میں نماز کی ادائیگی کا خیال تک نہ
سکا۔ اتنی ہی شاکی تھی وہ صرف اپنے نصیب سے نہیں نصیب لکھنے والے رب سے بھی۔ یہ اس
گمراہی کی طرف پہلا قدم تھا۔ حالانکہ شب کے اختتام پہ وہ ہمیشہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے
کرتی تھی۔ مگر اس وقت خفگی کے بھرپور احساس سمیت پڑی سسکتی رہی۔ قسمت سے شاکی ہوتی
اور پھر جانے کب سو گئی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کا رب ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کا منتظر ہے کہ
مانگے اور وہ عطا کرتا چلا جائے۔ اسے مانگنے والے ہاتھ بہت محبوب ہیں۔

☆ ☆ ☆

یہ اس کی شادی کی اگلی صبح تھی۔ جب وہ اٹھی تو خلیفہ مستقیم کمرے میں نہیں تھا۔ اسے دیکھنے
کوئی خواہش بھی نہیں تھی دیا کے اندر۔ بستر میں جیسے لیٹی تھی لیٹی رہی۔ اعصاب پہ سستی اور کسل
کے ساتھ یاسیت کا غلبہ تھا۔ وہ جیسے خود سے بھی روٹھی ہوئی تھی۔

"اٹھ جاؤ بیگم صاحب! آج ناشتہ اکٹھا کریں گے ہم۔"

وہ اندر آ گیا تھا۔ اب اس کا لحاف کھینچ کر باقاعدہ پکار رہا تھا۔ دیا نے ان سنی کی تھی اور
ویسے پڑی رہی۔ خلیفہ مستقیم نے گہرا سانس کھینچا پھر پائنتی سے گھوم کر اس کے پہلو کی جانب آ
اگلے لمحے وہ لحاف میں اس کے ساتھ آن گھسا تھا۔ دیا کو سراسیمہ کرنے کا باعث اس کی
جسارتیں تھیں۔ وہ جیسے تڑپ کر نہ صرف فاصلے پہ ہوئی بلکہ بستر سے نکل گئی۔ مستقیم اس کی بوکھلاہٹ
دیکھتا ہنستے ہوئے دوہرا ہونے لگا۔

"دیکھا ... اپنی بات منوانے کے کتنے گر آتے ہیں مجھے۔ محبت کرنی سیکھو لڑکی ہم سے۔"
ایک آنکھ دبا کر وہ جتنے شریر انداز میں بولا تھا۔ دیا کی غم و غصے اور تنفر سے اس قدر بری حالت
ہونے لگی۔ حد تھی یعنی بے حسی کی۔ اس کا بس کہاں چلتا تھا سوائے آنسو بہانے کے۔ اور خلیفہ مستقیم
اسی قدر تھکا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ کتنی دیر کچھ بولنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔

"کیوں اتنا رو رہی ہو دیا! ابھی سے سارے آنسو بہا لو گی تو میری موت پہ کیا کرو گی؟"
اس کا لہجہ عجیب تھا۔ دکھ کی گہری آنچ سے پگھلتا ہوا۔ اذیت و کرب سے بوجھل۔ مگر دیا کی
جھنجھلاہٹ اور خفگی اس پل کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ جبھی بغیر لحاظ رکھے اس پہ چڑھ دوڑی۔

"اگر تمہیں اپنی موت کا ایسا ہی گہرا یقین تھا تو میری زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"
تنفر سے بھرپور۔ تضحیک آمیز حقارت زدہ لہجہ۔ خلیفہ مستقیم کے وجیہہ چہرے کو یکدم کتنا پھیکا کر
کے رکھ گیا تھا۔ ایک سکتے کی سی کیفیت طاری ہوئی تھی اس پر۔ شاید اسے دیا سے اس درجہ بے مروتی
اور تلخی کی توقع نہیں تھی مگر اس نے خود کو سنبھال لیا اور کھسیا کر ذرا سا ہنسا تھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ

ایسا کرتے ہیں تم پہ مرتے ہیں
ہم نے یوں بھی تو مر ہی جانا ہے"

اور دیا روہانسی ہوتی چلی گئی تھی۔

"یہاں سے چلے جاؤ خلیفہ مستقیم! ورنہ میں کچھ کر گزروں گی بتا رہی ہوں۔"
وہ آنکھیں نکال کر چیخی اور خلیفہ بجائے خائف ہونے کے اس پر فدا ہوتا چلا گیا تھا۔

"کر گزرو جو کرنا چاہتی ہو۔ مارنا چاہتی ہو مجھے مار ڈالو۔ اف تک نہیں کروں گا قسم سے۔
آزمائش شرط۔"

وہ اسے بازوؤں میں بھر کے کتنے رسان سے گویا تھا اور دیا کچھ کہے بغیر نڈھال انداز میں اس
کے سینے پہ سر رکھے بے تحاشہ روتی چلی گئی۔ خلیفہ مستقیم نے اس کے سر کو بہت محبت اور نرمی سے چھوا
پھر بے حد رسانیت سے گویا ہوا تھا۔

تجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم
تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میرے تخیلات کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تیری آنکھیں، تیرے عارض، تیرے ہونٹ

کیسی انجان سی معصوم خطا کرتے ہیں
خلوت بزم ہو یا جلوت تنہائی ہو
تیرا پیکر میری نظروں میں ابھر آتا ہے
کوئی ساعت ہو کوئی فکر ہو کوئی ماحول
مجھ کو ہر سمت تیرا حسن نظر آتا ہے
دھوپ میں سایہ بھی ہوتا ہے گریزاں جس دم
تیری بانہیں میرے میری گردن میں اتر آتی ہیں

"مجھے آزما لو دیا! میں ہمیشہ تمہیں یونہی چاہوں گا۔ تم ہمیشہ میرے لیے خاص رہو گی۔ پلیز موڈ ٹھیک کرلو اب اپنا۔"

وہ ملتمس تھا اور دیا تھکتی جا رہی تھی۔ وہ فریش ہوئی تو مستقیم نے اسے ناشتہ دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دوا کھلائی اور سہارا دے کر پھر سے بستر میں لٹا دیا۔

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے میں جانتا ہوں۔"

اس پر لحاف برابر کرنے کے بعد وہ مسکرا کر کہتا اس کا ماتھا چوم کے خود باہر چلا گیا۔ دیا نے جلتی ہوئی آنکھیں موند لیں۔ وہ اتنی نقاہت محسوس کر رہی تھی کہ اب آنسو بہانے کی ہمت بھی نہیں رکھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اس علاقے اور اس گھر کا میں بے تاج بادشاہ ہوں دیا! یہاں مستقیم کا حکم چلتا ہے۔ سب کچھ میرے سمیت صرف تمہارا ہے۔ یہاں تم جیسے چاہو اپنی مرضی سے رہو۔ کسی کی ہمت نہیں کہ مداخلت کر جائے۔ تم ملکہ ہو یہاں کی۔"

قطار در قطار تن کر کھڑے درختوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے مستقیم نے اسے مخاطب کر لیا تھا۔ وہ صبح اٹھ کر باقاعدگی سے جاگنگ کیا کرتا تھا۔ آج زبردستی اسے بھی ساتھ گھسیٹ لایا۔ دیا نے من کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اسے اس سے اس کی باتوں سے مطلب تھا نہ دلچسپی۔ مگر مستقیم برا نہیں مانتا تھا۔ نہ اس کی ناگواری کو نہ نظر اندازی کو۔ وہ واقعی اس کے لیے یکسر مختلف انسان ثابت ہوا تھا۔ سراپا محبت، سراپا عاجز۔ یہ اس کا انوکھا اور دلکش روپ تھا۔ مگر دیا اسے بس اک بے رحم اور بے حس و کٹھور ڈاکو کے حوالے سے ہی جانتی تھی۔ یہی نقش گہرا تھا۔ وہ اسے ہی گہرا رکھنا چاہتی تھی۔ یا پھر وہ اس سے نفرت کے علاوہ کوئی دوسرا رشتہ دوسرا تعلق استوار کرنے پر آمادہ تھی نہ تیار۔ تبھی بے حسی اوڑھ لینا چاہتی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے دیا! محبت اپنا آپ ضرور منواتی ہے۔ مجھے یقین ہے میں اک دن تمہیں اپنی محبت سے جیت لوں گا۔"

وہ چلتے چلتے رکا اور اس کے سامنے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ دیا نے اسے اب کے دانستہ نظر انداز کیا اور کترا کر نکلنا چاہا۔ مگر خلیفہ مستقیم نے پھر لپک کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

"جتنا مرضی اس نظر اندازی کی مار مار لو دیا! مگر تم مجھے ہر راستے پر اپنا منتظر پاؤ گی۔"

اس کا لہجہ اطمینان چھلکاتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر کسی درجہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔ جواباً دیا کی نظریں سپاٹ تھیں، سپاٹ رہیں۔ البتہ لہجہ زمانے بھر کی تلخی اور نفرت کے ساتھ کدورت بھی سمیٹ لایا تھا۔

"زندگی ہر بار تمہاری من پسند سوغات تمہاری جھولی میں ڈالے یہ ضروری تو نہیں۔ خوش فہمیوں کا دائرہ اتنا وسیع مت کرو کہ پھر مایوسی کا سامنا کرنے پر ٹوٹ پھوٹ کے مرحلے سے گزرنا پڑے۔ میں بتا چکی ہوں تمہیں میرے دل میں تمہارے جیسے گھٹیا انسان کے لیے ہرگز بھی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایسے شخص کو میں اپنی ذات سے خوشی دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہو۔ میرے اپنے رشتے، میرے احساسات یہاں تک کہ میری شناخت بھی۔"

وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرا ڈھانپ کر بلک اٹھی تھی اور خلیفہ مستقیم بے چین، بے قرار ہونے لگا۔ وہ جتنا اسے بہلانے، جوڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی قدر ناکامی ہوا کرتی۔ بے بسی نقطہ عروج پہ تھی۔

"مرنے کی حد تک شرمندگی محسوس کرتی ہوئی جب یہ خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ میں ایک ڈاکو کی بیوی ہوں۔ کاش مر گئی ہوتی میں اس سے پہلے ہی۔"

وہ سسک سسک کر بے حال ہوئی جاتی تھی۔ مستقیم گم صم کھڑا تھا۔ اس کے دل میں عجیب سا ملال چٹکیاں بھرنے لگا۔ شاید نہیں یقیناً وہ اس لڑکی کے ساتھ واقعی زیادتی کر گیا تھا۔ کوئی بھی باعزت لڑکی اس کی سنگت میں خوشی محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ وہ واقعی مفاد پرست تھا۔ اس نے صرف اپنا سوچا۔ اس لڑکی کے نفع و نقصان کو سرے سے نظر انداز کر ڈالا۔

"تم بھول کیوں نہیں جاتی ہو اس سب تلخ حقیقت کو۔ تم سمجھوتہ بھی تو کر سکتی ہو دیا! وہ لڑکیاں بھی تو سمجھوتہ کرتی ہیں جن کے سسرال والے سخت مزاج ہوتے ہیں۔ ان سے ان کے والدین سمیت سارے رشتے چھڑا دیتے ہیں۔ مگر وہ اپنی گرہستی کو بچانے کی خاطر یہ قربانی دیتی ہیں۔"

اس کا انداز ناصحانہ تھا اس کے باوجود دیا کو جیسے آگ لگ گئی تھی۔ اس نے سرخ آنکھوں سے

مستقیم کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"مگر میں یہ قربانی کیوں دوں؟ کیوں کروں یہ اک ڈاکو کے لیے سکری فائز؟ مجھے تم نے میرے والدین سے مانگا نہیں۔ شرمناک انداز میں مجھے اپنے ساتھ اٹھا لائے۔ لوٹا ہے مجھے میرے بابا! امی، دادی، بھائی اور بہن کیسے کیسے نہ تڑپتے ہوں گے۔ میرے نام سے۔ انہیں صبر نہیں آتا ہوگا لوگوں کی نظریں، ان کی باتیں کیسے سہی ہوں گی انہوں نے ...... ؟ ان باتوں کا تمہیں بھلا کیا اندازہ۔"

وہ اتنی مشتعل تھی کہ اسے دھکا دیتے ہوئے چیخی۔ خلیفہ مستقیم اسے ہونٹ بھینچے دیکھتا رہا۔ دیا تو البتہ اشتعال تھما تھا نہ غم و غصہ، جبھی مزید اسے کھری کھری سنائے گئی۔

"مگر تم کیوں سوچو گے۔ مرد جو ٹھہرے۔ تمہارے لیے کسی بھی عورت کو یوں اپنی انا اور مردانگی کی بھینٹ چڑھا دینا بے حد معمولی بات ہے۔ بہت زعم ہے نا تمہیں اپنی طاقت، اپنی وجاہت کا؟ جبھی تم نے مجھے یوں پامال اور بے مول کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ فیصلے کی تلوار سے ذبح کرتے تمہیں ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ تم کیا جانو تمہارے اس سفاکانہ عمل نے مجھے کیسے کیسے نہیں تڑپایا اور زندہ درگور نہیں کیا۔ مگر میں بتاؤں کہ تم قابل محبت نہیں قابل نفرت ہو۔ مت رکھو مجھ سے محبت کی طمع۔ تم وہ ہو جس نے اپنی اسی مردانگی کے زعم میں مجھے سولی پر لٹکا دیا ہے۔ دو گھڑی کی محبت کے عوض عمر بھر کی وفاداری و اعتبار کی خواہش رکھتے تمہیں شرم تو نہیں آتی ہو گی۔ تم نے غور کیوں نہ کیا خلیفہ مستقیم کہ تمہاری اس جبری قربت میں میرے لیے سوائے اذیت کے اور کچھ نہیں ہے۔

بات سنو خلیفہ مستقیم عورت امرت کا چھلکتا پیالہ نہیں ہے کہ جب چاہا اسے ہاتھ میں پکڑ کر منہ سے لگا لیا۔ نہ پرفیوم کی بوتل کہ اٹھایا اور خود پر جی بھر کے چھڑک لیا اور مہکنے لگے۔ سوچنا کبھی کہ وہ بھی ایک دل رکھتی ہے روح اور احساسات رکھتی ہے۔ اسے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے خاص طور پر تم جیسے نفس پرست بے حسوں کو۔

بات کے اختتام تک وہ پھپھک کے روتی پلٹ کر اندر بھاگ گئی تھی۔ خلیفہ مستقیم ایسے کھڑا تھا جیسے پتھر کا ہو گیا ہو۔

☆......☆......☆

وہ اپنے دھیان میں اندر آیا تھا۔ وہاں فرشی نشست پر راجو اور امانت کے ساتھ شائلہ کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہا۔ صبیح پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئی تھیں۔ اس کی کڑی نظریں امانت پر تھیں جو ان نظروں کا مفہوم سمجھتا ہوا اسی تیزی سے وضاحت پیش کرنے لگا تھا۔

"شک مت کر یار! اسے میں نے نہیں بلوایا۔ خود آئی ہے یہ۔ بیشک پوچھ لے۔ تیرے سامنے بیٹھی ہے۔"

شائلہ جو اس کی طرف ہی متوجہ تھی اور بہت زیادہ گہری حیرانی سے اسے تک رہی تھی دانستہ کھنکاری۔

"خیریت ...... بڑے چمک رہے ہو۔ قسم سے دل ڈانواں ڈول ہو گیا ہے میرا۔"

وہ ہنس رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم کو کلین شیو دیکھنے کا پہلا تجربہ تھا اس کا اور بہت دلکش وہ واقعی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"تمہیں منع کیا تھا یہاں آنے سے۔"

خلیفہ کا موڈ بے حد برہم ہو رہا تھا۔ انداز کی سنجیدگی خوفناکی میں ڈھل رہی تھی مگر وہ کہاں خائف ہونے والی تھی۔

"تم سے ملنے، تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔ خبر ہی نہ تھی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ قسم سے قیامت لگ رہے ہو اور سنو خوامخواہ کی پابندیاں نہ لگایا کرو سمجھے۔ کچھ دے نہیں سکتے تو منواؤ بھی مت بس نہیں رہ سکتی میں تمہارے بغیر۔"

وہ اٹھ کر مخصوص انداز میں اس سے گلے ملی تھی۔ خلیفہ کی تمام تر ناگواری کے باوجود۔ اور جب خلیفہ نے اپنی سابقہ رکھائی و بے اعتنائی سے اسے جھٹکے سے خود سے الگ کیا وہ دکھ بھری ہنسی ہنسنے لگی تھی۔

"ابھی تک ویسے ہو۔ کٹھور، بے حس اور پتھر۔ کبھی میرا دل کرتا ہے تمہیں بددعا دوں مستقیم! تمہیں کسی سے ویسی ہی جینے مرنے والی محبت ہو جائے جو مجھے تم سے ہے۔ تم بھی ویسے ہی تڑپو جیسے مجھے تم تڑپاتے ہو۔"

اس کے کوسنوں کو خلیفہ نے کہاں اہمیت دینی تھی مگر راجو ضرور بے ڈھنگے انداز میں ہنسنے لگا تھا۔

"سمجھو شائل پھر تمہاری آدھی بددعا پوری ہوئی ہے۔ محترم کو عشق تو ہو گیا ہے مگر یہ تڑپنے والے نہیں ہیں۔ شادی کر کے موج اڑا رہے ہیں۔ بہتر ہے اب تم بھی امانت بیچارے کی محبت کو شرف قبولیت بخش دو۔"

راجو کی بات نے صحیح معنوں میں شائلہ کو دھچکا لگایا تھا۔ وہ شاکڈ ہو کر نکر نکر تینوں کو تکے گئی۔ خلیفہ مستقیم ازل سے بے نیاز تھا جبکہ راجو کی آنکھوں کا یقین اس کا دل اذیت سے بھرنے لگا۔

"یہ سچ ہے مستقیم؟"

وہ جیسے رو پڑی تھی یہ سوال کرتی ہوئی۔

"تم نے شادی کر لی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ کون ہے وہ لڑکی؟ اگر تمہیں کرنی تھی تو پھر میں کیوں نظر نہ آئی تمہیں۔ بولو۔"

غم، غصے اور رنج کی شدید کیفیت میں وہ اس کا گریبان پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ گستاخی تھی مگر اسے احساس ہی کہاں رہا تھا۔

"وہ تمہارے جیسی نہیں ہے۔ تمہارے جیسی عورت۔ مجھے ڈیزرو بھی نہیں کرتی تھی۔ پھر تم کیسے ہو سکتی تھیں اور سنو..... آج کے بعد اس قسم کی احمقانہ جذباتیت دکھانے کی غلطی نہ کرنا۔ آخری بار تنبیہ کر رہا ہوں۔"

خلیفہ مستقیم کا غراتا ہوا لہجہ جیسے شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے جھٹک کر وہ تنفر بھرے انداز میں پلٹ کر چلا گیا۔ شائلہ مشہور فلم سٹار تھی۔ حسن ایسا کہ لگتا تھا ہاتھ لگنے سے میلی ہو جائے گی۔ وہ امانت کو جاننے والی تھی۔ امانت کے توسط ہی خلیفہ مستقیم سے ملاقات ہوئی تھی اور پہلی نگاہ میں ہی اللہ جانے اسے خلیفہ مستقیم میں کیا بھا گیا تھا کہ یوں سب کچھ اس کی خاطر داؤ پر لگا دیا تھا۔ اپنا کیریئر اور عیش چھوڑ کر وہ وہیں ان کے ڈیرے پر آ گئی تھی۔ ہر دم امانت کے ساتھ لگی وہ دراصل خلیفہ مستقیم پہ صدقے واری ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں ان کا سردار ماکھا تھا۔ خلیفہ کو شائلہ کے یوں ساتھ آ رہنے پر اعتراض ہوا تھا مگر وہ اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مگر جب اسے شائلہ کے جذبات و ارادوں کا پتہ چلا تب وہ خاص طور پر اس سے بدکنے لگا۔

پھر جب سرداری کا تاج اس کے سر پہ سجا تو سب سے پہلے اس نے شائلہ کو وہاں سے چلتا کیا تھا۔ اس بات پر بہت ایشو بھی اٹھا تھا۔ امانت بہت بھڑکا تھا اور بدگمان بھی ہوا تھا۔ مگر خلیفہ کسی طور عورت پہ اعتماد کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ان کا اختلاف اتنا بڑھ گیا تھا کہ امانت شائلہ کی خاطر ان کا گروپ چھوڑنے کے درپے ہو گیا تھا۔

"یہ تمہارا ذاتی فیصلہ ہوگا امانت! مگر میں اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گا۔ یہ عورت صرف اس صورت ہمارے ساتھ رہ سکتی ہے اگر تم اس سے نکاح کرو گے۔ مجھے صرف اسی صورت میں انکار نہیں ہوگا۔"

اور ان کے دیگر ساتھیوں نے بھی خلیفہ کے فیصلے کا ساتھ دیا تھا۔ شائلہ نے امانت سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"تم کیوں نہیں کر لیتے مجھ سے شادی خلیفہ مستقیم!"

وہ اس کے سامنے سوالی بنی کھڑی تھی اور خلیفہ مستقیم کے چہرے پر کرختگی چھا گئی۔

"میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

وہ اسے دیکھ نہیں رہا تھا۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ شائلہ کا دل خون ہونے لگا۔

"میں انتظار کر لیتی ہوں۔ جب تم..."

"بے کار ہے۔ لاحاصل۔ میں کبھی تمہاری امید پر پورا نہیں اتر سکتا۔"

اس کا انداز زہر خند تھا۔ وہ آج بھی اسی طرح تھا۔ بے حس اور مغرور۔ جبھی تو وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ اپنی بے بسی پہ۔ امانت اسے چپ کراتا عاجز ہونے لگا۔

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟ مجھ سے بھی زیادہ؟"

اس نے آنسو پونچھتے سسکیاں بھرتے سوال کیا۔ امانت سرد آہ بھر کے متاسفانہ نظروں سے اسے تکنے لگا۔

"خلیفہ مستقیم جیسے بندے کی چوائس صرف حسن تو نہیں ہو سکتا احمق لڑکی! ایسا ہوتا تو وہ کبھی تمہیں نہ ٹھکراتا۔"

امانت کے ناصحانہ انداز پر اس کی دلگیری میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"وہ پارسا ہے یا اس کے ماتھے پہ لکھا ہے۔ جو خلیفہ صاحب نے پڑھا اور شادی کر لی۔"

وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ امانت نے اسے تادیبی نظروں سے گھورا۔

"خلیفہ مستقیم اپنی مرضی کا مالک ہے شائل! تم اپنی فرسٹریشن یہاں نہیں نکالو۔ وہ خفا ہوگا۔ بہتر ہے تم واپس چلی جاؤ۔ پھر کبھی آ جانا۔ آؤ چھوڑ آؤں میں تمہیں۔"

امانت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ وہ نڈھال سی اٹھی تھی۔

"کیا کروں گی دوبارہ یہاں آ کر۔ کیا بچا ہے بھلا اب باقی۔ اک کام کرو گے؟ مجھے اس کی بیوی سے ملا دو۔ چاہے دور سے سہی، اک نظر دیکھوں تو سہی اس کا نایاب انتخاب۔"

شائل کے انداز میں عجیب سی حسرت اور نارسائی کا احساس اتر آیا تھا۔ وہ بے بسی کا خاص رنگ جو یکطرفہ محبت کا خاصا ہوا کرتا ہے۔ ہیجان اور لازمی جزو ہوا کرتا ہے۔

"خلیفہ مستقیم! اس بات کو پسند نہیں کرے گا شائل! تم دنیا نہ کرو۔ چلی جاؤ اب بہتر ہے۔"

امانت نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے سمجھانا شروع کیا وہ گہرا سانس بھر کے سرگوشی میں جنبش دینے لگی۔

"راستے ہی نہیں۔ سرمایہ حیات بھی کھو گیا ہے امانت احمد! تم جانتے تو ہو اس ایک شخص کی خاطر میں نے..."

''بھول جاؤ سب۔ وہ تمہاری منزل تمہارا ٹھکانہ کبھی نہیں بن سکتا تھا۔ وہ اور مزاج کا آدمی ہے۔ ہم سب یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔''

شمائل کی آنکھوں میں بے بسی نمی کی صورت چمکنے لگی۔ وہ سر جھکا چکی تھی۔ انداز کی یاسیت بے حد گہری تھی۔

''میری امید پہلے کب ٹوٹی تھی جواب ٹوٹے گی۔ اسے بتا دینا میں پھر آؤں گی۔ اس وقت تم چلو میرے ساتھ۔ اکٹھے ڈنر کریں گے۔ ساتھ دو گے نا میرا؟''

اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ امانت کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ ہولیا تھا۔

☆......☆......☆

سارا دن سرد ہوائیں چلتی رہی تھیں۔ فضا میں تیرتا کہرا موسم کی شدتوں کا گواہ تھا۔ اسی حساب سے رات سرد اور برفیلی تھی۔ باہر ہواؤں کے جھکڑ چلتے تھے۔ یخ بستہ ہوائیں درختوں کے پتوں کو بھی ٹھٹھرائے دیتی تھیں۔ فضا کی نمی گویا اس بات کا اعلان کرتی محسوس ہوتی تھی کہ رات کو بارش ہوگی۔ مگر کمرے میں خوشگوار حدت تھی۔ پلنگ پر وہ ڈبل پلائی کا کمبل اوڑھے سکڑی سمٹی لیٹی تھی مگر جسم پھر بھی ٹھنڈک کے باعث اکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جنگل کی یہ سردی بڑی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی اس کے لیے۔ مستقیم نے کچھ دیر قبل آتش دان میں آگ دہکائی تھی۔ جب ہی کمرے میں میٹھی میٹھی پر حدت فضا کا تاثر قائم ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔ آتش دان روشن تھا۔ اور کمرے میں موجود ملگجے اندھیرے پر نارنجی روشنی کا آتشی سا خوابناک تاثر بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ خلیفہ کو بستر کی جانب آتے پا کر اس نے بے رخی کے ساتھ پھر سر تک کمبل کھینچ لیا۔

''ابھی تک خفا ہو مجھ سے تم؟''

اس کے برابر آ کر وہ بے حد نرمی سے اس کے بال سہلانے لگا۔ دیا نے بے حد تنفر بھرے انداز میں اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا تھا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے ویسوں سے خفا یا ناراض ہونے کی۔''

اس کا انداز چھچھلا ہوا بے حد نروٹھا پن لیے تھا۔ مستقیم نے مسکراہٹ دبائی۔

''پھر ہر روز میرے آنے سے پہلے کیوں سو جاتی ہو۔ جبکہ جانتی بھی ہو کہ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کر سکتا۔''

وہ شکوہ کر رہا تھا۔ مگر بے حد محبت سے۔ مان سے۔

''سمجھدار کو اشارہ بھی کافی ہوتا ہے۔''

دیا نے ننھی منی ناک چڑھا کر نخوت سے جتلایا۔

گویا ''اشاروں کو سمجھتی ہو تم؟''

وہ یکا یک شوخ ہوا۔ پھر اسی قدر شریر انداز میں اس کی جانب جھک کر سرگوشی میں بولا تھا۔

''محبت سے اشارہ کب کر گی جان مستقیم!''

نیوی بلیو سوٹ میں اس کی سرخ و سفید رنگت انگارہ کی مانند دہک رہی تھی۔ شعلہ تھا اس کا حسن جو جلا کر خاکستر کرتا تھا۔ وہ بھی خاک ہونے کو تڑپ رہا تھا۔

''قیامت تک بیٹھے رہنا انتظار میں۔ حسرت ہی رہے گی ان شاء اللہ!''

وہ اتنا چڑی تھی کہ بے ساختہ چیخ پڑی۔ مستقیم نے تھم کر اسے کچھ دیر بغور دیکھا تھا۔ پھر لاپرواہ انداز میں کاندھے اچکاتے ہوئے اسے ایک دم سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

''میں انتظار کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ گواہ رہو۔ سوتے میں ڈسٹرب نہیں کیا۔ ال منیرڈ ہونے کا طعنہ بھی نہیں دے سکتیں۔''

وہ کھلکھلا رہا تھا۔ گویا اپنی کامرانی پر سرشار ہو۔ جبکہ دیا کے اندر غضب کا طیش، قیامت خیز مزاحمت ابھری تھی۔ مستقیم اس کے بپھرے ہوئے انداز کو دیکھتا حیران ششدر ہونے لگا۔ وہ ہر صورت اس سے اپنا آپ چھڑا لینے کے درپے تھی۔ زبانی کلامی جیسے مرضی طبیعت صاف کر لیتی تھی وہ اس کی۔ مگر اس طرح اس انداز میں اس نے کبھی مستقیم کی نفی نہیں کی تھی۔ ایسا احتجاج پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ وہ اسی باعث ٹھٹھک گیا تھا۔

جب تمہارے پاس ہر قسم کی عیاشی کے مواقع تھے تو میری زندگی کیوں برباد کی؟ بولو؟''

وہ اس کی گرفت ڈھیلی پاتے ہی سرعت سے اس کا حلقہ توڑتی بستر سے اتر کر دور کھڑی ہوئی غرانے کے انداز میں بولی۔ مستقیم تو جیسے حق دق رہ گیا تھا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' وہ چکرایا ہوا لگ رہا تھا۔

دیا نے شعلہ برساتی نظروں سے اسے دیکھا اور آتش دان کے قریب صوفے پر جا بیٹھی۔

''اتنے معصوم ہو نا تم۔'' اس کے پھنکار ڈالنے والے انداز پہ مستقیم ہونٹ بھینچ گیا۔

''جو بھی شکایت ہے۔ بہتر ہے کھل کر اظہار کرو۔''

''پھر کیا کرو گے تم؟'' اس نے طنزیہ نظروں کی کاٹ سے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔

''غلط فہمی دور کروں گا تمہاری یار!'' ان نظروں کے جواب میں وہ وضاحت دیتا جھنجلایا۔

"مجھے ہرگز بھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے تمہارے گلے کا ہار... ہوئے اب مکر جاؤ کہ یہ جھوٹ ہے۔ اونہہ بڑی صفائی پیش کرتے تھے کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ میرے... ساتھی کرتے ہیں یہ کام۔"

وہ چیخ رہی تھی۔ سلگ رہی تھی۔ مستقیم نے گہرا سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ رخ پھیر... بستر پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ دیا جو اس کی جانب سے وضاحت کی منتظر تھی اس درجہ بے نیازی... جھلنے لگی۔ اس نے تیچھی نظروں سے اسے دیکھا۔ دیا کا دل اسے بھی ساتھ ہی آگ لگانے کا چاہا... بزدھو کے باز تھا وہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔

"اب بولتے کیوں نہیں ہو تم؟"

اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ جبھی مٹھیاں بھینچ کر چلائی۔ اس کے صبیح اور نوخیز چہرے پر عجیب سی بے بسی تھی۔

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے دیا!"

"تم بکواس کرتے ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ جھوٹے ہو۔"

دیا نے درمیان میں ٹوکا اور بھڑک کر پھنکاری۔

☆......☆......☆

دوسرا حصہ

خلیفہ مستقیم نے ہونٹ بھینچ کر جیسے خود پر ضبط کیا۔ اس قسم کی بدتمیزی اسے ہضم کرنا دشوار ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ لڑکی اس کی بات الگ تھی۔

"یہاں آؤ واپس۔"

خاصی تاخیر سے اس نے بے حد سنجیدگی سے اسے پکارا تھا۔

"مجھے کچھ دیر نہیں بیٹھنا ہے۔"

دیا نے آنسو حلق سے اتار کر روٹھے پن سے جواب دیا۔ خلیفہ مستقیم اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اس ... کتنی ضدی اور ہٹ دھرم ہو رہی تھی۔

"کب تک؟ مجھے سونا بھی ہے۔"

"تو سو جاؤ۔ مجھے لوری سنا کر تو نہیں سلانا تمہیں۔"

وہ جھلا اٹھی۔ کتنا غصہ آ رہا تھا اسے مستقیم پر۔ جبکہ وہ پتہ نہیں کیوں زور سے ہنس دیا تھا۔

"اس سے بھی بڑھیا کام کرتی ہو۔ جو مجھے خمار سے بھر دیتا ہے۔"

اس کا لہجہ گستاخی کی حد تک بے لگام اور بے مہار تھا۔ تمام تر غصے کے باوجود دیا کا گلابی مائل حسین و دلفریب نقوش سے سجا چہرہ اس کھلی بات پہ ایک دم سے دہک کر سرخ ہوا۔ اس کی لانبی پلکیں لرز جھکیں۔ وہ چہرے کا رخ پھیر گئی۔ کانوں سے جیسے دھواں نکلنے لگا تھا۔ اس کی نظریں ہی ایسی تھیں۔ سے سرتاپا رنگ دیا کرتی تھیں۔

"یار بیوی پہلے مجھے سلا دو۔ پھر وہاں بیٹھی رہنا۔"

اس نے گہرا کش لے کر سگریٹ پھینکا اور جیسے بیزار ہو کر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے پکارا۔ دیا نے ... خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"پلیز! مجھے تنگ مت کرو۔ میں آل ریڈی ڈسٹرب ہوں۔"

اس نے بڑی ناگواری دبائے بغیر کہا تو مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر اس نے دوبارہ اپنا تکیہ سیدھا کیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ دیا اسے گاہے بگاہے دیکھتی بلکہ گھورتی رہی اور کلستی

رہی۔ بار بار وہی اک منظر نگاہ کے سامنے آن ٹھہرتا تھا۔ جب وہ بے حد خوبصورت عورت اس دیکھتے دیکھتے مستقیم کے گلے لگ گئی تھی۔ کیسا بے تکلف انداز تھا۔ آخر وہ پہلی بار تو اس سے ایسا مظاہرہ نہیں کر رہی ہوگی۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اگر وہ آج راستہ بھٹک کر ادھر نہ آ نکلتی تو اس کا بھید بھی نہ کھلتا اس پر۔ اسے مستقیم سے پہلے سے زیادہ نفرت محسوس ہونے لگی۔ کتنا ظالم تھا وہ دیر وہ وہیں بیٹھی اپنی قسمت کا ماتم کرتی رہی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی بستر پہ آئی کہ کرسی پر اک سے بیٹھنا بھی اک آزمائش تھی مگر سکون یہاں بھی کہاں تھا۔

وہ سوتے میں خراٹے لینے کا عادی تھا اور دیا بے آرام ہوا کرتی۔ اس وقت بھی مستقیم خراٹے۔ اسے کروٹوں پر کروٹیں بدلنے پر مجبور کرتے رہے۔ اسے ایک دم سے لائبہ یاد آ گئی بات کو یاد کرتے اسے پتہ بھی نہ چلا وہ کب رو پڑی تھی۔ اس کی بددعا اسے لگ گئی تھی۔ وہ واقعی لیتا تھا۔ دیا نے آنسوؤں سے دھندلاتی نظروں سے اسے دیکھا۔ بے خبری اور سکون کی نیند سو ایسا بدمعاش اور غلط انسان نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے خوبرو بے تحاشہ حسین چہرے عجیب سی ملاحت، نرمی اور روشنی سی پھیلی تھی۔ جو اسے حسین سے حسین تر بنا کر دکھا رہی تھی۔ لانبی ہوئی گھنی پلکوں والی بادامی آنکھیں، کثرت سگریٹ نوشی کے باعث عنابی پڑتے سرخ ہونٹ پیشانی پر بکھرے ریشمی بال اور شیر جیسا مضبوط آہنی لمبا تڑنگا غضب کی مردانگی سمیت دراز سراپا تو کہیں بھی کمی نہیں تھی۔

"آہ...... کاش! یہ اتنا ہینڈسم نہ ہوتا۔ مگر ایک مہذب انسان ہوتا۔"

اس کا دل ماتم کناں رہا۔ جانے کتنی دیر وہ یونہی روتی رہی۔ دل کا بوجھ ذرا سا ہی کم ہوا یہ رونا تو عمر بھر کا تھا۔ اس نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"میں جتنا بھی رو لوں۔ تڑپ لوں۔ اب میری قسمت نہیں بدل سکتی۔"

اس نے مایوسی اور تنفر سے سوچا اور ایک بار پھر کروٹ بدلی۔ مگر مستقیم کے خراٹے طرح زچ کر کے رکھ گئے تو جھنجھلا کر اٹھتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ ڈالا۔

"ک...... کیا ہوا؟ خیریت؟"

وہ ہڑبڑا کر جاگا آواز اور آنکھیں دونوں ہی خمار آلود تھیں مگر سرخ آنکھوں میں ساتھ تشویش کا بھی رنگ گہرا تھا۔ دیا پہ ایک انکشاف بہت شدت سے ہوا۔ کہ اس کی آنکھیں سے زیادہ گہری اور خوبصورت ہیں۔ وہ بے اختیار ان حواس چھین لینے کی صلاحیت سے مالا صفت آنکھوں سے نظریں چرا گئی۔

"انہیں۔"

"یار دنیا سے اٹھنے کو کہہ رہی ہو تو پلیز ذرا ٹھہر جاؤ ابھی۔ ایکچولی میں نے ابھی تو تمہیں جی بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

وہ کسی قدر بوجھل آواز میں کہتا اس کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا۔ دیا کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ پرے ہٹو۔"

وہ اسے دھکیلنے کے انداز میں بتا رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم آہستگی سے ہنس دیا۔

"اس بدتمیزی میں سارا عمل دخل رومانس کا ہے جان مستقیم! ویسے جگایا کیوں تھا مجھے؟"

"خراٹے مت لو۔ مجھے نہیں آتی نیند اس طرح۔"

دیا نے نہ چاہتے ہوئے بھی وضاحت دی۔ آخر جان بھی تو چھڑانا تھی۔ وہ اسے کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے حق میں نہیں تھی۔

"جو حکم سرکار، نہیں لیتے۔"

وہ سر تسلیم خم کر کے مسکرا دیا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ سٹپٹا سی گئی۔

"مستقیم! یہ کیا فضول حرکت ہے۔ چھوڑو مجھے۔"

اس نے بھرپور احتجاج میں چیخ کر کہا تھا۔ مگر اس پر اثر ہی نہ ہوا تھا جیسے۔

"سچی بتاؤ۔ اس وجہ سے نہیں جگایا مجھے؟ میں جانتا ہوں میری بیوی بہت پیارے اور نرم دل کی مالک ہے۔ مجھے اتنی سختی سے ڈانٹا تھا۔ اب ازالہ کرنا چاہتی ہے۔ کہیں مجھ سے محبت سی تو محسوس نہیں کرنے لگی۔"

اس کا انداز شوخ و شنگ تھا۔ وہ اس پر جھکا سوال کر رہا تھا۔ دیا نے دکھ بھری نظریں اٹھائیں۔ اس کا پرکشش چہرہ بے حد نزدیک تھا۔ شرارت آمیز تبسم سے چھلکتی شوخ نگاہیں اور دل آویز مسکان سے سجے ہونٹ۔ وہ خوش تھا۔ بہت خوش وہ اک بار پھر جیتنے جو جا رہا تھا۔ دیا کے دل میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ ایسی آگ میں وہ اسے جلانے کے درپے ہونے لگی۔ آخر وہی صرف کیوں جلے۔ گھٹن اور نفرت کا شدید احساس ابھرا تو اس کے اندر سے جو سب کچھ بہا کر لے جانے کے درپے ہو گیا۔

"چھوڑو مجھے...... چھوڑ دو۔"

وہ چیخی اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر اسے دھکیلتی اس کی گرفت سے مچل کر نکل گئی۔ اگلے لمحے وہ چھلانگ مار کر بستر سے کود گئی تھی۔ مستقیم تو اس کے اس درجہ شدید ردعمل پر بھونچکا رہ گیا تھا۔ نازک سراپے اور ریشمی بکھرے بالوں کے ساتھ بنا دوپٹے کے وہ کیسی قیامت ڈھا رہی تھی۔ مستقیم کا رومینٹک

موڈ بری طرح غارت ہوا۔

"اب کیا ہوا ہے تمہیں؟"

وہ غصے سے کہتا اٹھ کر بیٹھا۔ دیا کے چہرے کے زاویئے بگڑنے لگے۔

"جب تمہارے پاس اپنی طلب پوری کرنے کو میرے علاوہ بھی ذرائع ہیں تو ضروری نہیں کہ تم مجھے اس آزمائش سے دوچار کرو۔"

وہ پھنکار کر بولی۔ خلیفہ نے بے ساختہ ہونٹ بھینچے۔ گویا وہ اس بات کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں دیا کہ میرا اس سے ......"

"میں بھی تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے تمہاری بات کا اعتبار نہیں۔ بہتر ہے دور رہو مجھ سے۔"

وہ سلگتے کوئلے کی مانند تڑخ کر چیخی۔

"تمہاری بے شرمی بہت اچھے انداز میں کھلی ہے مجھ پر۔ اپنے ساتھیوں کے سامنے کس ڈھٹائی سے اسے گلے لگائے کھڑے تھے۔"

اس کا جلا بھنا لہجہ طنزیہ بھی تھا تمسخرانہ بھی۔ خلیفہ مستقیم نے ٹھنڈا سانس کھینچا۔

"تو گویا محترمہ جاسوسی کر رہی تھیں میری۔"

وہ جیسے ایک دم کسی نتیجے پر پہنچ کر مسکرایا۔

"اونہہ ...... میرے جوتے کو بھی ضرورت نہیں۔"

دیا ننھا سا ناک نخوت سے سکوڑ کر بولی تھی۔ خلیفہ مستقیم نے ابرو اٹھا کر بغور اس کے تاثرات جانچے۔

"پھر اعتراض اور جھگڑا کس بات پر کر رہی ہو؟ گلے لگانے پر یا دوستوں کے سامنے لگانے پر؟"

اب وہ جیسے خود بھی اسے مزید جلانے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔ دبی ہوئی مسکان گواہ تھی اس بات کی۔ جسے دیا نے دیکھا تو آگ لگ لگ گئی تھی اسے۔

"مجھے کسی بات پہ اعتراض نہیں۔ تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔"

اس نے یکا یک لاتعلقی اور بے نیازی اوڑھ لی۔

"ہاں مگر صرف تمہارے معاملے میں۔"

مستقیم نے اس کی جانب پیش رفت کی اور پھر اسے بانہوں میں سمیٹا۔ وہ تو جیسے ماہی بے آب کی مانند مچل تڑپ اٹھی۔

"چھوڑو مجھے۔ خبردار جو ہاتھ لگایا۔ اس کے پاس جاؤ اب بھی۔"

"کہا نا میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ویسے بیوی معاملہ کیا ہے؟ جیلس ہو رہی ہو؟"

مستقیم کو لطف آنے لگا تھا اسے ستا کر چھیڑ کر۔ وہ چپ چاپ اس سے اپنا آپ چھڑاتی رہی۔

"جیلسی تو محبت کی علامت ہوا کرتی ہے۔ سچ بتاؤ مجھ سے محبت کرنے لگی ہو؟"

مستقیم نے اس کے ہر لحظہ غصے سے سرخ پڑتے چہرے کو شرارتی مگر گستاخانہ نظروں سے دیکھا۔

"رہو خوش فہمی میں مبتلا۔"

وہ اس سے اپنا آپ چھڑا کر فاصلے پہ جا بیٹھی۔ اور حقارت بھرے انداز میں کہا۔

"یہاں واپس آؤ بستر پر دیا!"

اب کی بار وہ بولا تو اس کا بے حد سنجیدہ لہجہ اسی قدر ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر دیا نے کہاں پرواہ کی۔

"نہیں آؤں گی۔ کیا کر لو گے؟"

"زبردستی کروں گا۔ بیوی ہو تم میری۔ میری خواہشات اور ضروریات کا خیال رکھنا تمہاری اولین ذمہ داری ہے جسے بھول رہی ہو تم۔"

وہ جیسے اسے جتلا رہا تھا۔ لہجے میں اب کے ناراضی بھی تھی۔ اور خفیف سی تلخی بھی۔ دیا بپھر نے لگی۔

"جانتی ہوں اور میں نے رکھا تھا تمہاری ضرورتوں کا خیال۔ تم گواہ ہو کہ میں نے کبھی ہاتھ نہیں جھٹکا تھا تمہارا اپنی تمام تر نفرت و ناپسندیدگی کے باوجود۔ مگر اور نہیں خلیفہ مستقیم! اگر تمہاری تسکین اور کے بھی سامان موجود ہیں تو میں کیوں یہ مشقت سہوں۔"

وہ بھرائی آواز میں چیخنے لگی تھی۔ خلیفہ مستقیم اسی قدر بدمزا ہوا۔

"بکواس مت! میں کہہ چکا ہوں میرا اس سے ہرگز بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔"

وہ بری طرح جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔

"یقین کس کو ہے تمہاری بات کا۔"

وہ جواباً گہرے تمسخر سے بولی۔ خلیفہ مستقیم کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے اس غصے میں بڑھ کر اسے پکڑنا چاہا تھا کہ وہ تیزی سے اچھل کر پھر فاصلے پر ہو لی۔

"ہرگز بھی زبردستی نہیں ہو گی مستقیم! ورنہ تم بھگتو گے۔"

اس نے دھمکانے کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا تو خلیفہ مستقیم کا چہرا توہین اور سبکی سے سرخ پڑنے لگا۔

"چیلنج نہیں کر دیا! خوامخواہ معاملہ مت بگاڑو۔ شاباش بات مانو میری۔"

وہ پچکار کر اسے سمجھانے لگا۔ دیا نے اسی تنفر آمیز انداز میں زور سے سر جھٹک دیا۔

"چیلنج تو میں نے کر دیا ہے۔ مجھے ایسے شخص کے لمس سے بھی نفرت ہے جس کی اسی گھٹیا حرکت کو میں محبت کا جنون سمجھ کر سمجھوتہ کر رہی تھی۔ دل میں گنجائش پیدا کر کے تمہیں قریب آنے سے نہیں روکا۔"

وہ بے حد تیز لہجے میں بول رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم احساس شکست سے پاگل ہونے لگا۔

"تمہیں پتہ ہے نا، کہ میں ہارتا نہیں ہوں۔ بے کار الجھ رہی ہو مجھ سے۔"

اب کے اس نے بھی اپنی صفائی دینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور مقصد کی بات کی۔

"اب تم ہار دو گے مستقیم! دیکھ لینا۔"

دیا کے لہجے میں جوابا تاؤ دلائی کیفیت تھی۔ تمسخر تھا۔

"اوکے فائن! ابھی پتہ چل جاتا ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کی جانب آیا۔ انداز بے حد جاحانہ تھا۔ دیا بے اختیار پیچھے سرکی۔

"خبردار خلیفہ! اک قدم بھی میری جانب مزید نہ بڑھانا۔ میں بتا رہی ہوں میں ہرگز لحاظ نہیں کروں گی۔ سنا تم نے؟ اب کوئی مجبوری نہیں ہے میرے ساتھ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔"

وہ بدستور پیچھے ہٹتی اسے باور کرانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"سن لیا۔ جو کرنا ہے کر لو۔"

خلیفہ مستقیم نے اس کی کلائی پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچا۔ دیا اس صورتحال کے لیے خود کو تیار کیے ہوئے تھی۔ جبھی پلک جھپکتے میں فروٹ کی ٹوکری سے جھپٹ کر چھری اٹھا لی۔ اس کی یہ حرکت خلیفہ کی نظر میں نہیں آسکی تھی۔ جبھی وہ اسے گرفت میں لے چکا تھا۔ دیا نے چھری والا ہاتھ بلند کیا۔ خود کو نشانہ بنانا چاہتی تھی مگر اس کوشش میں ناکام اس طرح ہوئی کہ خلیفہ نے بالکل اچانک اس کا رخ پھیر لیا تھا۔ چھری اس جھونک میں پوری قوت سے مستقیم کے ہاتھ کو کاٹتی چلی گئی تھی۔ خلیفہ تو حق دق ہوا ہی تھا خود دیا بھی چکرا سی گئی۔ بلکہ بوکھلاہٹ دیکھنے والی تھی۔ خلیفہ کی گرفت ڈھیلی پڑی تھی۔ وہ ششدر سا کبھی دیا کبھی اپنے زخمی ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ دیا کا سارا غصہ سارا طنطنہ بھی ہوا ہو چکا تھا۔ وہ سکتہ زدہ سی اس کے کٹے ہوئے ہاتھ سے سرعت سے بہتے خون کو پتھرائی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔

"رک کیوں گئیں؟ آج ساری حسرتیں نکال لو اگلی پچھلی۔ ہاتھ نہیں پکڑوں گا تمہارا، ویسے بھی غلط جگہ پہ وار کیا ہے۔ شہ رگ کاٹتیں یا پھر پیٹ میں مار دیتیں۔ لمحوں میں کام تمام ہوتا اور تمہاری جان چھوٹتی۔"

وہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے بہت رسان بہت تحمل سے بات کر رہا تھا۔ نہ غصے میں تھا نہ ناراض۔ اس کے برعکس سرد مہری تھی لہجے میں۔ دیا کا فق چہرا متغیر ہونے لگا۔ وہ ابھی تک خوفزدہ آنکھوں سے اس کا بہتا خون دیکھ رہی تھی۔ معاً وہ سنبھلی اور بستر پہ پڑا اپنا گلابی دوپٹہ لپک کر اٹھایا اور اس کے ہاتھ پہ لپیٹنے لگی۔

"مم... میں نے تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہا تھا۔ مم... میں تو... بلیوی می تو..."

"میں جانتا ہوں۔"

وہ اس کی بات کاٹ کر بہت جذب سے گویا ہوا۔ دیا نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری۔ "بہت گہرا کٹ ہے۔ خون ضائع ہو رہا ہے خلیفہ۔"

اس کے انداز میں گھبراہٹ و تشویش تھی۔ مستقیم کچھ کہے بغیر اسے دیکھے گیا۔ جو کچھ دیر قبل یکسر مختلف روپ میں تھی۔ اللہ جانے کون سا اصل تھا۔ مگر یہ بہت پیارا لگا تھا اسے۔

"اب کیا کرو گے؟ اسپتال جانے میں تو..."

"کیا سچ میں تمہاری اس فکرمندی اور تشویش سے دیا محبت کرنے لگی ہو مجھ سے؟"

اس کی پریشانی تشویش گھبراہٹ سے بالکل برعکس بات کر رہا تھا وہ۔ دیا گم صم سی ہو کر آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"چلو خیر ہے۔ اس آزمائش میں نہیں ڈالتا تمہیں۔ امانت ہے نا۔ میں اس سے مرہم پٹی کرا لیتا ہوں۔ تم پریشان نہیں ہو۔"

وہ اس کا سر تھپک کر نرمی سے کہتا پلٹ کر باہر نکل گیا۔ دیا چادر گھسیٹ کر اوڑھتی اس کے پیچھے لپکی تھی۔

☆.....☆.....☆

"بہت گہرا کٹ تھا یار! اتنی بے احتیاطی؟ ہوا کیا تھا؟"

امانت اپنا میڈیکل باکس کھولے اس کے ہاتھ کو ٹانکے لگا رہا تھا۔ جو انگوٹھے کے درمیان سے آدھی ہتھیلی تک کٹ چکا تھا۔ امانت نے اس کی خاموشی کے جواب میں جب بے خیالی میں تیسری مرتبہ سوال کیا تو خلیفہ مستقیم کی معنی خیز نظریں بھرپور شرارت لیے دیا کی جانب اٹھ گئیں۔

"یار یہ راز داری کی بات ہے۔ تمہاری بھابی خفا ہوں گی اگر تفصیل بتا دی تو۔"

دیا اس جواب پہ بے اختیار ہونٹ بھینچ گئی۔ اس کا چہرا گلابی سے یکلخت سرخ پڑ گیا تھا۔ کچھ

کیے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی کہ امانت کو مسکراہٹ چھپاتے اس نے دیکھ کر صاف سبکی محسوس کی تھی۔

"ٹھہرو جانِ من! اکٹھے چلتے ہیں۔ مت سمجھو یہ معرکہ ختم ہو گیا۔ وہیں سے آغاز ہو گا اور یقیناً فتح آپ کے شوہر نامدار کی ہو گی۔ ان شاء اللہ۔"

اس کا لہجہ شوخ تھا۔ مجال ہے جو اتنے گہرے زخم کی تکلیف کا احساس ہو اس کے چہرے پہ اس کے کسی انداز میں۔ دیا کا بس نہیں چلا۔ اس کا منہ بند کر دے کسی طرح۔ وہ سخت غصے میں پیر پٹختی کمرے میں واپس آئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ بھی چلا آیا۔ دیا نے دیکھا اور ناراضی کے اظہار کو منہ پھیر لیا۔

"آ جاؤ بیوی! تم سے مجھے ابھی دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔"

وہ دھپ سے اس کے مقابل آ کر بیٹھا۔ پھر اسے آنچ دیتی متبسم نظروں سے دیکھا تھا۔

"یار تم سے کتنے رنگ ہیں تمہارے۔ مگر سچی بات ہے ہر رنگ پہلے سے جدا مگر بے حد حسین۔ سچ بتاؤں تم مجھے اب بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اس وقت تو اور بھی زیادہ لگ رہی تھیں جب میرے لیے فکرمند تھیں۔"

"مجھے بے حد چیپ لگتے ہیں وہ مرد جو اپنے پرسنلز اپنے فرینڈز سے شیئر کرتے ہیں۔"

وہ تلخی سے گویا ہوئی۔ ناراضی کی وجہ جان کر خلیفہ مستقیم نے کاندھے جھٹک دیئے تھے۔ آنکھیں شرارت بھرے انداز میں چمکنے لگیں۔

"تو تمہیں بس یہ بات اچھی نہیں لگی؟ باقی سب تو ٹھیک ہے نا؟"

وہ اس کی آنکھوں میں اپنی متبسم آنکھیں گاڑھے گویا تصدیق کرا رہا تھا۔

"غلط خیال ہے۔ میں ابھی بھی اپنی پہلی بات پر قائم ہوں۔"

اس نے نروٹھے پن سے جواب دیا تو خلیفہ مستقیم نے ٹھنڈا سانس بھر لیا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ انرمی سے سہلایا اور ہونٹوں کے قریب لے جا کر کس قدر محبت سے چوما تھا۔

"دیا! کسی بھی عام عورت کو فریب دینا، اسے اپنی جانب متوجہ کرنا کسی مرد کے لیے وہ بھی خوبرو مرد کے لیے ہرگز مشکل کام نہیں۔ مگر وہ عورت جس سے وہ عشق کرتا ہے۔ اس میں اسے سچے موتیوں کی سی جھلملاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ پھر تو جس عورت سے مرد عشق کرتا ہے وہ ہی اس کے لیے دنیا کی سب سے حسین عورت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے سامنے دنیا کی ہر خوبصورتی ماند پڑنے لگی ہے۔ اس کے لیے اس ایک عورت میں پوری دنیا سمٹ کر آ جاتی ہے اور یہ عورت شمائلہ جسے تم نے آج میرے ساتھ دیکھا ... تمہیں شاید یقین نہ آئے تم سے بہت پہلے میری زندگی میں شامل ہو چکی ہے۔

مگر میں نے تب بھی اسے کبھی اہمیت نہیں دی۔ پھر اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ خود مجھے پسند کرتی ہے۔ مجھے اپنی جانب مائل کرنے کو اس قسم کی حرکتیں کرنا اس کا معمول ہے۔ اس کے باوجود کہ اسے کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس بات کی گواہی تمہیں یہاں کا ہر فرد بھی دے گا اور خود شمائلہ بھی اگر تم چاہو تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔"

وہ کتنے رسان کتنی نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ گویا اسے اپنے حق میں رام کر رہا تھا۔ دیا نے ہونٹ بھینچ لیے۔ دل نہ بھی مانتا تھا تب بھی اس نے مزید بحث نہیں کی۔

"جناب آپ کو یقین آیا میری بات کا؟ تم میرے لیے وہ عورت ہو جو محبوبہ قرار پاتی ہے۔ جس میں ستاروں کی روشنیاں پھوٹتی ہیں۔ میں تمہاری آمد سے قبل تک تمہارے انتظار میں خود کو سنبھال کر رکھتا رہا ہوں۔ تم خود سوچو دیا! اگر تم پارسا تھیں تو میں کیسے پلید ہو سکتا تھا۔ اللہ کا وعدہ ہے۔ پاک عورتوں کے لیے پاک مرد۔ یار تمہیں مجھ پر اتنا شک کیوں ہے؟ مجھے تو تمہاری معصومیت پاکبازی پہ ذرا برابر بھی شبہ نہیں کہ انتخاب ہی اس بیس پر ہوا تھا تمہارا۔"

وہ مسکرا کر اسے معتبر کر رہا تھا۔ دیا کی لانبی پلکیں جھک گئیں۔ وہ حیران تھی۔ گم صم بھی۔ وہ کتنی خوبصورت باتیں کرتا تھا۔ اتنا غلط انسان ہو کر بھی۔ اس کا یقین کس درجہ پختگی رکھتا تھا۔ اسے عجیب سی شرمندگی نے آن لیا۔

"چلو آ جاؤ۔ سوتے میں رات بہت ہو گئی ہے۔"

"وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پانی کے ساتھ درد رفع کرنے والی دوا لیتا ہوا اسے مخاطب کر کے بولا۔ دیا اب بھی کچھ نہیں بولی۔ آ کر بستر پر اپنی جگہ لیٹ گئی۔

"یہاں آ جاؤ۔ میرے کاندھے پر سر رکھو۔ ورنہ مجھے لگے گا تم ابھی تک مجھ سے خفا ہو۔"

دیا نے پھر اسی خاموشی سے اس کی بات مان لی۔ مستقیم اس کی آنکھوں میں جھانک کر نرمی سے مسکرایا۔ دیا اس کی قاتل مسکان سے خائف ہوئی بے اختیار نظریں چرا گئی تھی۔

☆......☆......☆

لایعنی سوچیں اس کا دماغ خراب کرنے لگی تھیں۔ انہی سوچوں سے پیچھا چھڑانے کو اس نے خود کو مصروف کرنا مناسب سمجھا۔ کمرے کی صفائی کا ہی اس نے پہلے ارادہ باندھا۔ بستر کی چادر جھاڑ کر بچھائی جو میلی محسوس ہوئی تو اسے اتار دیا۔ الماری سے دوسری دھلی ہوئی سفید چادر نکال کر بچھا دی۔ فرنیچر پہ موجود گرد کو صاف کیا۔ پھر جھاڑو اٹھا کر فرش صاف کیا۔ اسی کام سے فارغ ہوئی تو کمرے سے نکل آئی۔ اسے بہرحال مصروفیت چاہیے تھی۔ جو عجیب و غریب سوچوں سے چھٹکارا بخش دے۔

ایک طرف آہٹ محسوس کی تو راہ داری عبوری کر کے اسی جانب آ گئی۔
اندر جھانکا تو اندازہ ہوا کچن ہے۔ کوئی رخ پھیرے کھڑا جلتے اسٹو پہ کچھ پکانے میں مصروف تھا۔ دیا متوجہ کرنے کو دانستہ کھنکاری تو وہ جو کوئی بھی تھا بے ساختہ پلٹا۔ اسے دیکھا تو گھبرا کر بوکھلا کر سلام کیا تھا۔ وہ اٹھا۔ نیس سال کا ایک درمیانے قد کاٹھ کا لڑکا تھا۔

"کیا کر رہے ہو یہاں؟"

اس کے لہجے میں غیر محسوس انداز میں مالکانہ حتوق در آیا۔ جسے خود اس نے بھی غالباً محسوس نہ کیا تھا۔

"میں بشیر ہوں جی! یہاں کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور صفائی وغیرہ کی ڈیوٹی ہے میری۔"

"اوکے...... اب تم نکلو کچن سے۔"

اس نے نرمی مگر قطعیت بھرے انداز میں کہا تو بشیر کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل گئیں۔

"جی......"

اس کے انداز میں غیر فہمی واضح تھی۔

"اوہو...... بھئی آج سے کھانا میں پکاؤں گی۔ فکر نہ کرو۔ تمہاری نوکری نہیں چھوٹے گی۔ چ... کے پاس حرام کا پیسہ بہت...... تمہیں تنخواہ دیتے رہیں گے۔"

وہ طنزیہ کہتی اسے کچن بدر کر کے خود اس کی جگہ پہ کھڑی ہو گئی۔ چولہے پہ موجود کو کر میں جھانک... گوشت کا سالن بھننے کے مرحلے میں تھا۔ وہ مصالحہ بھوننے لگی۔ ساتھ میں کچن میں دیگر سامان... اشیاء کا بھی جائزہ لینے میں مصروف رہی۔ ضروریات زندگی کی خوراک کا اتنا وسیع ذخیرہ موجود پا کر... کے ہونٹوں پر تلخ مسکان بکھر گئی تھی۔ اس کے لیے سلاد سبزیاں الگ کی تھیں۔ ساتھ میں سالن... کرتے وہ سلاد کاٹنے لگی۔ جب ہی وہ کھنکارتا ہوا اندر چلا آیا تھا۔ دیا نے گردن موڑ کر محض ایک... اس پر ڈالی پھر اسی لاتعلق انداز میں اپنا کام کرنے لگی۔

"میں واپس آیا تو تم کمرے میں نہیں تھیں۔ فطری گھبراہٹ میں مبتلا ہوتے ہر جگہ دیکھ... تب بشیر نے بتایا تم یہاں ہو۔ تمہیں کیا ضرورت ہے اس مشقت میں پڑنے کی۔"

وہ اس کے نرم سفید موی ہاتھ بہت محبت سے تھامتا ہوا بے حد جذب سے کہہ رہا تھا۔ دیا کا... سپاٹ تھا سپاٹ رہا۔

"کھانا کب تک کھاتے ہو تم لوگ؟"

اس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ نخوت سے پوچھ رہی تھی۔

"آج تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔"

وہ اس کے قریب آ گیا اور اسے پیچھے سے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

"کمرے میں جاؤ۔ کام کرنے دو مجھے۔"

اس کی آنکھوں میں شوخ رنگ لہراتے پا کر دیا نے ناگواری دبائے بغیر برہمی سے کہا۔

"ویسے کام کرتے تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ رئیلی۔ سنا ہے جو بیوی شوہر کے دل پہ حکومت کرنا چاہتی ہے وہ ہی اس کا گھر بھی اچھا سنبھالتی ہے۔ یہ بدلا ہوا انداز۔ یہ کمپرومائزنگ اسٹائل کہیں مجھ سے محبت تو نہیں ہو رہی۔"

اس کا شریر انداز لگاوٹ آمیز تھا۔ دیا کا موڈ اس بروقت کی رانگی سے خراب ہوا تھا۔

"قیامت تک آس لگائے بیٹھے رہنا۔ حسرت لیے ہی مرو گے۔"

وہ پھنکارنے لگی۔ خلیفہ مستقیم کو یہ بھی لفظی چھیڑ چھاڑ جتنا لطف دیتی تھی وہ اس قدر سنگتی مگر اس وقت اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ دیا کا یہ تیکھا اور ترش انداز اسے ہر بار یہی باور کراتا تھا کہ اس کی ہر کوشش شدید ناکامی سے دوچار ہو چکی ہے۔ اس کی محبت بے اثر رہی ہے۔ وہ ہونٹ بھینچے خاموش کھڑا خود پر ضبط کرتا رہا۔ خود کو کمپوز کرتا رہا۔ اس سے قبل کہ کوئی مزید بات کرتا بشیر نے آ کر مداخلت کر دی تھی۔

"صاحب! آپ کو امانت صاحب بلا رہے ہیں بڑے کمرے میں۔"

خلیفہ مستقیم نے گہرا سانس بھر کے دیا کو دیکھا اور ماحول کا تناؤ کم کرنے کو دانستہ مسکرانے لگا۔

"اوہو! ظالم سماج کو کیسے خبر ہو گئی۔ میں اس وقت یار دلدار کے پاس ہوں۔ چلو یار آتا ہوں میں۔"

وہ دیا پہ حسرت زدہ نگاہ ڈالتا ہوا سرد آہ بھر کے لمحہ بھر کو اس کے پاس تھما۔

حاصل عشق کیا بتاؤں میں
قرب بویا تھا ہجر کاٹتے ہیں

دیا نے اس کے لہجے کی تشنگی اور اضطراب کو صاف محسوس کیا تھا مگر کوئی تاثر چہرے پر نہیں آنے دیا۔ وہ ہونٹ بھینچتا ہوا پلٹ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ تب دیا نے سکھ کا بھرا تھا۔

☆......☆......☆

ابر آلود ہوتے موسم نے سردی کی شدت میں ایک دم کچھ مزید اضافہ کر دیا تھا۔ کئی دنوں بعد آج دھوپ نکلی تھی۔ وہ بھی کمزور اور مدھم سی۔ اس نے سویٹر پہنا۔ گرم شال لپیٹی۔ موزے چڑھائے اور

باہر نکل آئی۔ اسے پتہ تھا ان سب کے ساتھ آج مستقیم بھی دیر تک سوئے گا کہ کل کی رات خلیفہ مستقیم سمیت سب ویسے بھی غائب رہے تھے اور ابھی کچھ دیر قبل لوٹے تھے۔ وہ جان سکتی تھی یہ جانا کس مقصد کا جانا تھا۔ دل میں وہی درد ہلکورے لینے لگا تھا۔ ایک اور گھر برباد ہونے جا رہا تھا اور وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر رہی تھی۔ بہت چاہا ذہن بٹ جائے مگر وہ سو نہیں پائی تھی۔ اور ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ رات کا جس پل آخری پہر بھی اختتام پذیر تھا جب ان کی آہٹیں سنائی دی تھیں۔ خلیفہ مستقیم اندر کمرے میں آیا تو اسے کھڑکی کی جانب رخ پھیرے دیکھ کر چونکا۔

"آج جلدی اٹھ گئیں تم؟"

وہ اسے متوجہ کرنے کو کھنکارا۔ دیا نے خفیف سا چونک کر لمحہ بھر کو گردن موڑ کر اسے دیکھا ضرور مگر کوئی تاثر دیے بغیر پھر سے سیدھی ہو گئی۔ خلیفہ مستقیم نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھ دیے۔ وہ ساکن کھڑی رہی۔

"میں رات بھر نہیں سوئی ہوں۔"

اس کے لہجے میں طنز نہیں بے بسی تھی۔ لاچاری اور کرب تھا۔ مستقیم بہت زور سے چونکا۔

"کیوں؟"

اس کا انداز استفہامی ہی نہیں الجھن آمیز بھی تھا۔ مگر وہ کسی احساس کے تحت یکدم پرجوش ہو تھا۔

"ارے..... کہیں تم میری کمی تو محسوس نہیں کر رہی تھیں۔ یار یہ تو بہت ہی اچھی تبدیلی ہے۔ یعنی تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہونے لگی ہے۔"

رات بھر جاگی نیند کے خمار سے سرخ ہوتی آنکھوں میں امید کی روشنی کا اجلا پن کتنی سرعت سے پھیل گیا تھا۔ چہرا جوش و مسرت سے تمتماتا ہوا تھا۔ مگر دیا کا موڈ ہنوز آف تھا۔ بلکہ کچھ مزید بگڑ گیا۔

"کہاں گئے تھے تم؟"

وہ دانت پیس کر اذیت کے پل صراط طے کرنے لگی۔

"یار! جانتی تو ہو تم۔ روزی روٹی کے وسیلے....."

"بکواس مت کرو۔ بہت بڑے جھوٹے ہو تم! لوٹتے ہو لوگوں کو اور سمجھتے ہو تم نے کمائی کی ہے؟"

وہ پھٹ پڑی تھی۔ خلیفہ مستقیم نے تھم کر سنجیدگی کی نگاہ سے اس کا یہ لال بھبوکا چہرا دیکھا۔ گہرا سانس کھینچا اور بستر کی جانب بڑھتے ہوئے کسی قدر رسان سے گویا ہوا تھا۔

"تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے۔ الٹا جھگڑ رہی ہو۔ رنگیلی بیوی آج پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے رہ گئے ہیں۔ بڑی مشکل سے جان بچی۔ ورنہ آج لازمی بیوہ ہو جائیں تم۔"

تکیہ کھینچ کر کے لیٹتے ہوئے وہ اپنے تئیں اسے بہت ہولناک خبر سنا رہا تھا۔ دیا کے چہرے پر زہر خند پھیل کر رہ گیا۔

"کاش ایسا ہو جاتا۔ کسی طرح سہی۔ جان تو چھوٹ جاتی تم سے۔"

اس کا دماغ غم و غصے کی زیادتی سے ابل رہا تھا۔ جبھی ہرگز الفاظ کی سنگینی پہ دھیان نہ دیا۔ مگر مستقیم کا رنگ ضرور پہلے بے تحاشا پیلا ہوا پھر اسی لحاظ سے سرخ پڑ گیا۔ ایسے لگنے لگا اس کی آنکھوں سے ابھی خون ٹپک پڑے گا۔

"اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے دیا!"

وہ خاصی تاخیر سے بولا۔ تب بھی اس کا لہجہ مدھم اور ٹوٹا ہوا تھا۔ بلکہ کسی حد تک بے حد عجیب۔ دیا نے جواباً کچھ کہے بغیر پھر آگ اگلتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور ہونٹ سکوڑ لیے۔

"آخر کیسے یقین کرو گے اس ایک بات کا تم؟"

اس کا لہجہ ہنوز طنز کی آگ میں جھلسا ہوا تھا۔ خلیفہ مستقیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک نسبتاً چھوٹا مگر جدید طرز کا ریوالور نکال کر اس کے آگے بستر پر پھینک دیا۔

"یہ لوڈڈ ہے شاید اس وقت اس میں چار پانچ گولیاں ہیں۔ تمہیں پوری اجازت ہے۔ تم مجھے مار کر اپنی اس حسرت کو پورا کر لو۔"

وہ خطرناک حد تک سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ دیا نے اسے تنفر سے دیکھتے ہوئے نخوت بھرے انداز میں سر جھٹکا۔

"مسٹر خلیفہ مستقیم! مجھے ایسا کرنا ہوتا، تو خود کو تمہارے ہاتھوں پامال ہونے دیتی؟"

یہ بدترین لہجہ مستقیم کو بیدردی سے کاٹ کر رکھ گیا۔ اس نے بہت شدت سے ہونٹ بھینچ لیے۔ ایک بار پھر اسے بہت زیادہ ضبط کرنا پڑا تھا خود پہ قابو رکھنے میں اکھڑے تیکھے ترش تاثرات لیے کھڑی یہ لڑکی اپنی تمام تر بدتمیزی، گستاخی اور بے لحاظی کے باوجود اسے بہت عزیز، بہت پیاری تھی۔

"میں نے نکاح کیا ہے تم سے دیا!"

اس نے صرف دفاع نہیں کیا۔ احتجاج بھی بلند کیا۔ عجیب سی بے بسی چھلک رہی تھی اس پل اس کے چہرے سے۔

"ہاں بالکل! لیکن واضح رہے گن پوائنٹ پر۔"

وہ زور سے پھنکاری۔ اور خلیفہ مستقیم لاجواب ہو کر رہ گیا تھا۔ دیا اسی غصیلے موڈ میں کمرے سے نکل گئی۔ کچن میں آ کر ناشتہ تیار کیا اور پھر کمرے میں واپس آ گئی۔ وہ کروٹ کے بل لیٹا شاید سو رہا تھا۔ دیا نے اس پر نگاہ غلط انداز ڈالے بنا اپنے جوتے پہنے اور دروازے سے نکل آئی۔ اس کا رخ بیرونی دروازے کی جانب تھا۔ یہاں فطری حسن جابجا بکھرا ہوا تھا۔ سرو قامت سرسبز و شاداب درخت، ہری بھری گھاس، ڈھیروں کے حساب سے جنگلی پھول، تاحد نگاہ پھیلی ہریالی، پرندوں کی سریلی آوازیں، پھولوں کی دلفریب بھینی بھینی خوشبو، سب سے بڑھ کر تنہائی اور خاموشی۔

وہ ایک درخت کے چوڑے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دل بے حد اداس تھا۔ آنکھوں کے گوشے نم ہوتے جا رہے تھے۔ زندگی کا ایسا رخ سامنے تھا جس کا ہر پہلو تکلیف دہ تھا۔ وہ خود فریبی کی چادر اوڑھنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی جاتی تھی مگر حقیقت کی کربنا کی ہر طرح سے اپنا احساس دلاتی تھی۔ اس کا دل چاہا کسی مہربان کاندھے پر سر رکھ کر بہت سارا روئے۔ سکون اور نیند سب کچھ تو حرام ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار یہ بے بسی ایسے اشتعال انگیز احساس میں ڈھلتی کہ اس کا جی چاہتا سچ مچ مستقیم کو قتل کر دے۔ کیسا نفس پرست انسان تھا۔

خود غرض، سفاکی اور بے حسی کی انتہا تھی اس ظالم شخص کی کہ محض اپنے مردانگی کے غرور کی تسکین کی خاطر پسندیدہ ہستی کو جیسے بن سکا حاصل کر لیا۔ ملکیت کا ٹھپہ لگا کر اپنے سنہرے پنجرے میں قید کر ڈالا۔ فتح کے اظہار کے لیے غرور کی حد، برتری کی انتہا کہ ایک جیتے جاگتے وجود کو استحقاق کی زنجیروں میں جکڑ کر بے بس کر دیا جائے۔ یہ ملکیت کا ظالمانہ طریق کار ہی اسے وحشت زدہ رکھتا تھا۔ نفرت کو سِسکاتا رہتا۔

"رونے کے واسطے یہ جگہ کچھ ایسی بھی محفوظ اور متاثر کن نہیں کہ تم جب جی چاہے منہ اٹھا کر یہاں چلی آؤ۔ بتا بھی چکا ہوں پہلے کہ یہ جنگل خطرناک اور خونخوار قسم کے جانوروں سے بھرا پڑا ہے۔ دیا! تمہیں آخر مجھ سے میری ہر بات سے اختلاف کر کے کیا تسکین ملتی ہے بتاؤ؟"

سوکھے پتوں پر پہلے اس کے قدموں کی بھاری آہٹ ابھری تھی۔ پھر خفا خفا سی آواز بھی گونج اٹھی۔ دیا نے آنسو بھری مگر جھنجلائی نظروں سے اسے بے دریغ گھورا۔ کبرے میں جھلسی بدرنگ گھاس جس میں سے خشک زمین کے تڑخے ہوئے ٹکڑے جھانک رہے تھے۔ وہ مضبوط قدم جمائے اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑا تھا۔

"تم آخر میری جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہو؟"

وہ بدمزگی سے چیخی۔

"اللہ سے دعا کرو۔ وہ سمیع الدعا ہے۔ جی بھر کے بددعائیں دو۔ اس بار بچ گئے ہیں۔ اگلی بار زندہ سلامت واپس نہ آئیں۔ ہمیشہ کے لیے جان بھی چھوٹ جائے گی اور تمہارے دامن پر کوئی داغ بھی نہیں پڑے گا۔"

گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس خود بھی گلابی گلابی نظر آتی یہ کچی کلیوں سی نازک لڑکی جو پہلی نگاہ میں ہی دل موہ چکی تھی اب اس کا دل قدم قدم پہ توڑنے لگی تھی۔ اس کے جنگ آمیز انداز پر جواباً وہ بھی غصیلے موڈ میں آ کر بولا تو دیا نے اسے بہت طنزیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"اگر میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو آج یوں قسمت کو نہ رو رہی ہوتی۔"

بات تلخ تھی تو لہجہ تلخ ترین۔ خلیفہ مستقیم نے ہونٹوں کو باہم بھینچ کر اپنا طیش دبایا۔ پھر قدرے توقف سے بولا تو لہجہ اس کے ضبط کا گواہ یعنی دھیما اور مدھم تھا۔ نرم تھا۔

"اندر چلو دیا پلیز! بہت تھکا ہوا ہوں میں۔ اس وقت یہاں تمہارا پہرا نہیں دے سکتا۔"

"تو مت دو۔ کہا کس نے ہے ایسا کرنے کو۔ جاؤ سو جا کے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ جو کر سکتے ہو کر لو۔"

اس نے ہونٹ سکوڑ کر برہمی سے جواب دیا تھا۔ لہجہ گستاخی اور ہٹ دھرمی سمیت بہت تیز بھی تھا۔ خلیفہ مستقیم اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ برا ماننے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا جبھی ہارے ہوئے انداز میں ٹھنڈا سانس کھینچا۔

"کر تو بہت کچھ سکتا ہوں مگر کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ

ناحق قبضہ نہ کیجیے خود پر
آپ اپنے نہیں ہمارے ہیں

"اس کی بھاری گنگناہٹ پہ دیا نے بے اعتنائی سے چہرے کا رخ پھیر لیا۔ گویا وہ اس کی بات پہ ہرگز کان دھرنے پہ آمادہ نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے ظالم لڑکی! بیٹھو جب تک تمہارا جی چاہے، مجبوری ہے، دل کا معاملہ جو ہوا مگر اک بات دھیان سے سن لو۔"

وہ رکا پھر گہری بے حد آنچ دیتی ہوئی نظروں سے ہوا کے دوش پر اڑتی اس کے بالوں کی موٹی لٹوں کو دیکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

سہی جائے نہ جھونکے کی رقابت ہم سے
ہوا سے کہہ دو تیرے رخسار سے ہٹ کر گزرے

اس ذومعنی لہجے پہ دیا کسی طرح بھی اپنی بے نیازی اور کٹھور پن کو قائم نہیں رکھ سکی۔ اس کا چہرہ گلابی سے سرخ ہوتا تمتمانے لگا۔ وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی مگر نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے دہکتی جا رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم اس کے عین سامنے سفیدے کے چوڑے تنے سے ٹیک لگا کر ٹانگیں سیدھی کر کے تقریباً نیم دراز ہو گیا۔ جبکہ دیا اس کی اس حرکت پہ ایک پل کو ششدر رہ گئی تھی۔ خود وہ گرم کپڑوں، گرم شال کے ساتھ سویٹر بھی پہنے ہوئے تھی۔ پھر بھی سردی اتنی شدید تھی کہ گویا ہڈیوں میں موجود گودے کو بھی جما رہی تھی۔ مگر اس کے برعکس خلیفہ مستقیم نے اس وقت جینز پہ صرف بنیان پہنی ہوئی تھی۔ یعنی جیسے تھا ویسے ہی اس کی تلاش میں اٹھ کر چلا آیا تھا۔ اس نے ترچھی نگاہوں سے اس کے آہنی وجود کو دیکھا جو جتنا بھی مضبوط سہی بہرحال گوشت پوست کا ہی بنا تھا۔ سردی تو اسے بھی لگ رہی ہوگی مگر......

''کیا یہ واقعی مجھ سے ایسی بے بس کر دینے والی محبت کرتا ہے؟''

اس نے پہلی مرتبہ اس نکتہ پہ سوچا اور کچھ عجیب سے احساسات کا شکار ہونے لگی۔ اور محض اس سے اس سے وابستہ احساسات سے دھیان ہٹانے کو رخ پھیر لیا۔ جانے کتنی دیر بیت گئی۔ پتہ نہیں اپنا ضبط آزما رہی تھی یا اس کا......

اب وہ چھینکنے لگا تھا۔ مگر استقامت ہنوز اپنی جگہ تھی۔ آسمان پر بادل مزید گہرے ہو رہے تھے سورج کی جو جھلک نظر آئی تھی وہ بھی مکمل طور پر بادلوں کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ ہواؤں کی شوریدگی اور سردی بھی بڑھنے لگی معاً دیا نے خشک پتوں پر سرسراہٹ سنی۔ مگر رخ پھیرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن اس وقت اس کے حلق سے بے ساختہ کربناک چیخ نکل گئی تھی۔ جب کسی درخت کی شاخ پر جھولتے بن مانس نے ایک دم سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ کچھ اور بھی زور سے چیختی متوحش ہو کر اتنی تیزی سے پیچھے ہوئی کہ توازن کھو کر سر کے بل نیچے گر گئی۔

خلیفہ مستقیم جو اونگھنے لگا تھا اس کی چیخ کی آواز پہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔ اور صورتحال سمجھتے ہی برق رفتاری سے اٹھ کر بن مانس کے پیچھے لپکا۔ ساتھ ہی جیب سے پسٹل نکال لیا تھا۔ مگر فائر کرنے کی نوبت نہیں آ سکی۔ بن مانس قلانچیں بھرتا آن کی آن میں گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

''آر یو او کے؟ چوٹ تو نہیں لگی کہیں تمہیں دیا!''

وہ واپس پلٹتا ہوا اس کے نزدیک آ کر کتنی فکرمندی کس درجہ تشویش سے سوال کر رہا تھا۔ وہ بے حد سنک بدحواس تھی۔ مستقیم نے نرمی سے اسے سہارا دے کر اٹھنے میں مدد دی۔

''آئی ایم سوری یار! پتا نہیں کیسے آنکھ لگ گئی میری۔''

کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود وہ کتنا شرمندہ تھا اور معذرت کر رہا تھا۔ دیا نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اٹھنے کے بعد کپڑے جھاڑتے ہوئے خوفزدہ نگاہوں سے جنگل کی سمت دیکھنے لگی۔ جبکہ مستقیم اسے دیکھ رہا تھا۔

''آؤ...... اندر چلو پلیز!''

وہ اسے اب بھی کچھ جتلائے بغیر نرمی سے اسے قائل کر رہا تھا کہ اس پر وحشت کے غلبے کو محسوس کر چکا تھا۔ اپنا ہاتھ ڈھارس بندھانے کو اس نے دیا کے شانے پر رکھا تو جانے کس جذبے کے تحت وہ سرک کر اس کے بالکل نزدیک آ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے از خود ان فاصلوں کو گھٹایا تھا۔ مستقیم خوشگوار حیرت میں گھر کر اسے تکنے لگا مگر وہ متوجہ نہیں تھی اور ہنوز سہمی ہوئی تھی۔ خلیفہ مستقیم یونہی اسے اپنے بازو کے حلقے میں سمیٹے اندر لے آیا مگر وہ بیڈ روم کے دروازے پر آ کے رک گئی تھی۔

''تم جاؤ اندر...... مجھے کچن میں کچھ کام ہے۔''

مستقیم کی سوالیہ نظروں سے نظریں پھیر وہ آہستگی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔ تازہ چائے بناتے اس نے آملیٹ اور پراٹھے بھی تیار کیے تھے۔ چائے کا مگ اور ابلے انڈے۔ ٹرے میں ناشتے کے لوازمات سیٹ کر کے اس نے ٹرے اٹھائی۔ جس وقت وہ دوبارہ کمرے میں آئی مستقیم کمبل میں دبکا تقریباً غنودگی میں جا چکا تھا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ کر اس کا کمبل کھینچا۔

''اٹھو۔''

''کیا ہے یار بیوی!''

مستقیم نے سرخ دہکتی ہوئی آنکھیں کھول کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔

''ناشتہ کر لو پہلے۔ پھر سو جانا۔''

وہ اس کی خمار آلود آنکھوں کی تباہ کن سحر انگیزی سے نظریں چرا کر بولی۔ مستقیم نے کسلمندی سے گردن میں جنبش دی۔

''نہیں...... ابھی نہیں...... مجھے بس سونے دو۔ بہت تھکن ہے۔''

وہ پھر کمبل میں گھسا۔ آواز نیند کے غلبے کے باعث کچھ اور بھاری اور گھمبیر ہو کہ جیسے ماحول پر دیا پر بھی کوئی فسوں طاری کرنے لگی۔ دیا نے اس کا پھر کمبل گھسیٹا اور اسے جھنجھوڑنا چاہتی تھی مگر کلائی پہ ہاتھ رکھتے ہی حرارت محسوس کر کے بے ساختہ چونک کر اسے بغور تکنے لگی۔

''پہلے ناشتہ کر لو اور...... تمہیں بخار کب سے ہے۔''

اسے ٹس سے مس نہ ہوتے پا کر اب کی مرتبہ دیا نے غصے میں سارا کمبل گھسیٹ لیا۔ مستقیم کو سرد

آہیں بھرتے ہوئے کسی گمراہ لحنا پڑا تھا۔

"پہلے زخم لگاتی ہو۔ پھر مرہم رکھتی ہو۔ میری بیوی بہت انوکھی ہے یار! مگر مجبوری یہ ہے کہ پیاری بہت لگتی ہے ظالم!"

اس کے ہاتھ سے مگ لیتے ہوئے وہ اسے زچ دیتی نظروں سے تکتا بظاہر ہنس کر کہہ رہا تھا۔ دیا نہ جانے کیوں جز بز سی ہو گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اسے آخر اس سے ہمدردی کیوں محسوس ہوئی۔ دیر اس سوال کو لے کر الجھتی رہی۔ جبکہ مستقیم اسے گہری نظروں سے دیکھتا ناشتہ کرتا رہا تھا۔

"آ جاؤ زوجہ! کر لو ناشتہ تم بھی یار! حسرت لے کر نہ مر جاؤں کہ میری بیوی کبھی مجھے اس قابل ہی سمجھ لیتی۔"

وہ اسے دعوت بھی دے رہا تھا تو اپنے مخصوص شوخ و شنگ بے حد رومینٹک انداز میں، جس سے دیا کی جان جلتی تھی۔

"تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

وہ ابھی تک اس سوال کے جواب میں چکراتی تھی۔ اپنا دھیان بٹانے کو بولی۔

"کون سی بات جان من!"

اس کی سرخ ڈوروں سے سجی خوابناک آنکھوں میں استعجاب تھا۔ دیا کچھ اور جھنجلا گئی۔ تڑخی۔

"جب سے تمہیں دیکھا ہے یار! میں سمجھتا تھا تمہیں حاصل کر لوں گا تو دل قرار پا لے گا۔ مگر یہ اب بھی میری طرح پاگل ہے۔ دیکھو اب تمہاری محبت، تمہاری توجہ، تمہاری چاہت کا طلبگار ہے۔ بات کرنے کی؟ نرا دیوانے کا خواب۔"

پتہ نہیں وہ کتنا سنجیدہ تھا۔ البتہ اس کی نظروں میں عجیب سی تشنگی ضرور تھی۔ دیا نے بے تحاشہ غصے سے گھورا۔

"پھر فضول گوئی......"

مستقیم کو جیسے کسی نے ہنٹر دے مارا ہو۔ ایسے ہی تڑپا تھا وہ۔

"ہاں...... تم تو فضول گوئی ہی کہو گی۔ ظالم کٹھور لڑکی وہ کیا کہا ہے کہ کسی شاعر حضرت نے ہی خوب کہا ہے کہ......

خاک ہو جائیں گے ہم
تم کو خبر ہونے تک

وہ جیسے کراہا تھا۔ دیا جھنجلا کر رہ گئی۔

تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ گویا پتھر سے سر پھوڑنا۔ بہرحال امانت سے کہو تمہیں دوا دے دے۔ شام تک طبیعت بہتر ہو ہی جائے گی۔

وہ نخوت سے کہتی اٹھنے لگی تھی کہ جب بڑی سرعت سے مستقیم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ توجہ...... یہ ہمدردی اور یہ احساس مندی۔ یار اگر میں خوش فہم نہیں ہوا تو یہ محبت کی ابتداء ہے نا؟"

وہ سرمئی رہا تھا۔ مگر روشن آنکھوں میں آس کے کتنے دیپ جل رہے تھے۔ دیا نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ کتنی دیر منتظر رہا مگر اس کی چپ نہیں ٹوٹی۔ یہاں تک کہ مستقیم کی آنکھوں کے جلتے سارے دیپ ایک ایک کر کے بجھ گئے۔ اس نے گہرا استاسفانہ سانس بھرا پھر ٹرے سے چائے کا مگ اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

"ایک گھونٹ ہی بھر لو۔"

دیا اس عجیب و غریب مطالبے پر حیران رہ گئی۔ مگ تمر بخائی خالی تھا۔ محض پیندے میں تھوڑی سی چائے تھی۔

"کیوں؟ یہ تبرک ہے جو لازمی پیئوں میں۔"

وہ بری طرح چڑ گئی۔

"تم تبرک سمجھ کے پی لو۔ میرا مقصد تو تمہیں اپنا جھوٹا کھلانا ہے۔ سنا ہے اس سے محبت بڑھتی ہے۔"

وہ ہرگز بھی غیر سنجیدہ نہیں تھا۔ دیا جو چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ سر جھٹک کر طنزیہ مسکرائی۔

"محبت ہو گی تو بڑھے مسٹر مستقیم! پہلے محبت تو پیدا کریں۔"

اس کا انداز ایسا تھا کہ مستقیم کا چہرا دھواں ہو کر رہ گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی اسے تکتا رہا تھا۔

"محبت کیسے بڑھے گی دیا!"

"محبت ایسے فضول سوال مت پوچھا کرو۔"

اس نے روکھے پن سے دھتکارنے کے انداز میں جواب دیا اور اسے دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ مستقیم ساکن بیٹھا رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر کا کھانا بنا کر اس نے بشیر کو بتا دیا تھا۔ بشیر ہی ان کا کھانا دوسرے کمرے میں لگاتا تھا۔ وہ
بہت کم امانت وغیرہ کے سامنے جاتی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی۔ اس حصے کی جانب وہ سب
آنے سے گریز برتا کرتے۔ بشیر کو بھی وہ ضرورت کے وقت آواز دیتی تب ہی وہ ادھر آتا تھا۔ مستقیم
بھی اسی حصے میں باقی سب کے ساتھ ہوا کرتا۔ یہ سب اسے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ا
کے لیے یہ سہولت کا خیال رکھنے والا خلیفہ مستقیم ہی تھا۔

گیلے ہاتھ دوپٹے کے پلو سے خشک کرتی وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو مستقیم کو ہنوز سوتے پا
اس عجیب سی وحشت ہونے لگی۔ دن ڈھل رہا تھا۔ وہ صبح کا سویا ہوا تھا پھر طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی
اس کے کہنے کے باوجود ضدی ایسا تھا کہ دوا نہیں لی تھی۔

"اپنے ہاتھ سے کھلا دو۔"

اسے اس کا مطالبہ یاد آیا۔

"میرا ابھی دماغ خراب نہیں ہوا۔ پتہ نہیں کب چھوڑو گے یہ احمقانہ حرکتیں۔"

وہ اتنا جھنجھلائی تھی کہ اسے سخت سست سنائے گئی۔

"احمقانہ حرکتیں دیوانے کرتے ہیں۔ میں بھی تو دیوانہ ہی ہوں تمہارا۔"

مجال ہے جو اس کی سخت اور غصیلی باتوں سے ماتھے پر شکن آئی ہو۔ اتنی ہی محبت سے جواب
تھا۔

"مرضی ہے تمہاری! تکلیف تمہیں کاٹنی پڑے گی۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ دیا اپنے کام میں مصروف اس کے بعد سے جو وہ سر تک کمبل تانے
اب یہ وقت آ گیا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی تشویش گھیرنے لگی۔

"مستقیم....."

اس نے آگے بڑھ کر اسے بے ساختہ پکارا۔ جواب ندارد۔ اس کے دل کو جیسے بے کل
لیا۔ جبھی تیزی سے جھک کر اسے زور سے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

"اُفوہ..... کیا ہو گیا ہے یار! سو تو لینے دیا کرو۔"

اس کی مدھم آواز بے حد بوجھل تھی مگر دیا کو تو اس کی آواز سن کر جیسے سکون سا آنے لگا تھا۔
سرسرا اٹھنے والی وحشت کو جیسے کوئی کنارہ ملا۔ اس میں کیا شک تھا کہ اس جنگل بیابان میں اک
وہی آشنا وہی محرم تھا۔ اسے کچھ ہونے کا خیال بھی دیا کے اندر سراسیمگی بھر جاتا تھا۔ اس کے سا
لحاظ کرتے تھے تو وجہ وہی تھا۔ ورنہ وہ ان کی کچھ نہیں لگتی تھی۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بستر کے نزدیک رکھی کرسی پر آ بیٹھی۔ مستقیم نے انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کمر پہ تکیہ رکھ
لیا۔

قربت کی تیری پیاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں
اک درد دل کے پاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں
گر ہو کچھ امید تو ہو جاؤں پرسکون
اک بے وجہ ہی آس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں

دیا تو جیسے پوچھ کر پچھتائی تھی۔ مستقیم کے لہجے میں خفیف سی شرارت، ازلی شوخی کے ساتھ اک
ان کہا سا درد بھی تھا۔ اس کا جیسے بس ہی نہ چلتا تھا۔ ورنہ کسی بچے کی طرح رو کر بلک کر کسی بھی طریقے
اسے منا لیتا۔ اپنے حق میں ہموار کر لیتا۔ دیا نے کچھ دھیان سے بغور اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ، اس کا
انداز گفتگو۔ اٹھنے بیٹھنے کا مہذبانہ انداز اسے بار بار چونکاتا جا رہا تھا۔

"پڑھے لکھے لگتے ہو۔ اپنی کوالیفیکیشن بتاؤ گے۔"

مستقیم کو اس سے اس سوال کی کہاں توقع تھی۔ جبھی چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بے ساختہ نظریں
چرا گیا۔ وجیہہ چہرے پر جیسے ان ایک ساتھ کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ہر رنگ اذیت اور کرب میں ڈوبا
ہوا تھا۔

"مجھے اک چائے کا کپ مل سکتا ہے؟"

وہ بات بدل گیا تھا دانستہ۔

"میں تمہاری نوکرانی نہیں ہوں سمجھے؟"

اپنی بات کا یوں نظر انداز ہونا اسے تپ چڑھا گیا تھا۔ مستقیم نے اس کے لال بھبوکا چہرے کو دیکھتے
ہوئے بمشکل مسکراہٹ چھپائی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بیوی تو ہو نا۔"

"جس پہ مجھے صرف شرمندگی ہے۔"

وہ جواباً غرائی۔ مستقیم یکدم ساکن ہو کر رہ گیا۔ اک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر وہ اٹھ کر کمرے
سے نکل گیا۔ دیا بعد میں بھی کتنی دیر جھلستی رہی۔ ہونٹ کچل کچل کر زخمی کر لیے۔ آنکھوں میں بے تحاشا
نمی امڈتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

مجھ کو خیال ہے کہ تو میرا خیال ہے — اے مرکزِ خیال تیرا کیا خیال ہے
آتا ہے تو خیال میں کتنے خیال سے — مجھ کو تیرے خیال کا کتنا خیال ہے

وہ کروٹ کے بل بہت خاموش گم صم لیٹی ہوئی تھی۔ جب مستقیم اس کے پیچھے آ کر لیٹا اور
کے کاندھے پر سر ٹکا کر آہستگی سے مگر متبسم لہجے میں گنگنایا تھا۔ وہ کسمسائی اور اس کے حصار سے
چاہا۔ مستقیم نے اس کوشش کو ناکام بنایا اور اس کی کمر میں بازو حمائل کر کے مزید خود سے قریب کر لیا۔
وہ دبکی اور چہرے پر بے بسی سج گئی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ جنہیں مستقیم نے دیکھا تھا اور کچھ
یونہی تکتا رہا تھا۔

"خفا ہو ابھی تک؟"

وہ اس کی نم پلکوں پر ہونٹ رکھ کر سرگوشی میں پوچھ رہا تھا۔ دیا کے اندر موجود بے بسی لاچاری
میں ڈھلی اور بھیگی آنکھیں برس پڑیں۔ مستقیم نے سرد آہ بھری تھی۔

اک شام ڈھلے تم جس کے ملو — بس اتنی حسرت کافی
تم ساتھ رہو ، سانسوں میں بسو — تم پاس رہو ، باہوں میں
بس اتنی عنایت کافی ہے — تم دل میں رہو ، دھڑکن کی
خوابوں میں رہو یادوں کی طرح — اتنی بھی محبت کافی
اتنی بھی محبت کافی ہے

عجیب انوکھی خواہش تھی۔ وہ پھر بے خود ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اسے باہوں کے گھیرے
سمیٹے وہ اپنی وارفتگیوں کے قصے سنانے میں مصروف تھا۔ اور دیا کے اندر رم جھم برسات ہونے لگی
شرم سے زیادہ اس کا اس ناگوار قربت میں اذیت سے برا حال ہوا کرتا۔ وہ مرد تھا۔ اظہار کے
میں بہت بے شرم اور بے باک۔ وہ عورت تھی۔ لمحہ لمحہ کٹتی اور پامال ہوتی ہوئی بے بس عورت
آنسوؤں پہ اختیار تھا۔ سو جی بھر کے بہائی۔

جبکہ خلیفہ مستقیم کو من پسند قربت مخمور و مسحور کر دیتی۔ اس کے اندر باہر آسودگی ہوتی۔
عورت کا لمس کتنا دل آویز اور کس درجہ ہوش ربا ہوتا ہے یہ وہ اچھی طرح جان چکا تھا۔ کیسا مکمل
دیا کا۔ مبہوت کر دینے والا۔ اتنا سحر کار کہ زاہد خشک بھی بہک جائے۔ وہ تو پھر عام سا انسان تھا۔
لگتا دیا کی جانب دیکھنا گویا سورج سے آنکھ ملانا ہے۔ پہلی بار تو وہ اس کا چہرا دیکھتے ہی جیسے
اثر سے منجمد ہو گیا تھا۔ ایسی تشنگی اندر اٹھی تھی جس نے سیرابی کی خواہش سے بے حال کر دیا۔
عالم برزخ میں جلتا بدن جیسے کسی جھرنے کے نیچے آ گیا تھا۔ کتنا سکون تھا اس کی زلفوں کی

میں۔ کتنی آسودگی تھی اس تکمیل میں وہ بلا جھجک دیا سے بھی اظہار کر جاتا۔

"سنا تھا محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ سو فیصد سچ ہے۔ بلاشبہ اس پر کسی کو اختیار نہیں۔ پہلے سنا تھا اب سمجھا ہے تو لگتا ہے جو سنا تھا وہ سچ ہے۔ جو ہونے پہ آ جائے تو خلیفہ مستقیم کو بھی دیا کے سحر میں جکڑ دیتی ہے۔ اور اگر مزید مہربانی کرے تو دیا کو بھی خلیفہ مستقیم کا اسیر بنا سکتی ہے۔ مجھے اپنے دل پہ اختیار نہیں دیا! وہ دن بھی آئے گا جب دیا کو خلیفہ مستقیم سے عداوت نہیں رہے گی بلکہ عداوت محبت میں بدل جائے گی۔"

اور جواب میں وہ اتنی غمزدہ تھی کہ کچھ نہیں کہہ سکی، کچھ بھی دل شکن سا۔ بس اس کی دونوں آنکھوں سے شفاف پانی کا ایک ایک قطرہ امڈا اور پلکوں پر آ کر رک گیا۔

پھر اسی شام کے بعد جو رات آئی اس میں وہ کہیں جانے کو تیار تھا۔ وہ گیا سب ہی اور دیا کا دل مٹھی میں آ گیا۔ وہ اس مذموم ارادے کو جانتی تھی اور لخت لخت ہوئی جاتی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا۔ میں جلد آ جاؤں گا۔"

کمرے سے جانے سے قبل وہ لمحہ بھر کو اس کے پاس رک کر گال سہلاتے بولا تھا۔

"کب جا رہے ہو نا؟" وہ سوالیہ ہوئی۔ مستقیم کے گردن ہلانے پر ہونٹ بھینچ لیے۔

"بشیر ہو گا یہاں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا! چھوڑ کے جا رہے ہو مجھے اگر جو میں بھاگ گئی؟"

وہ سلگتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے طنز کر گئی تھی۔ خلیفہ جو دروازے کی جانب مڑ چکا تھا چونک کر پلٹا اور پھر بے تحاشہ ہنستا چلا گیا تھا۔

"اب کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا ہے جان مستقیم! میں جانتا ہوں ایسا نہیں کرو گی تم!"

اس کے لہجے میں جو تھا وہ دیا کو توہین سے سرخ اور خجالت سے بوجھل کر کے رکھ گیا۔ مستقیم واپس پلٹا اور اس کے قریب آن ٹھہرا اور جھک کر اسے شانوں سے تھام لیا۔ وہ پوری طرح متوجہ تھا۔ دیا دانستہ..... جانب تکنے لگی۔

"میں نے کہا تھا نا تم سے دیا! یاد کرو کہ اک بار میرے نام ہو جاؤ۔ پھر بے فکری ہی بے فکری ہے۔ اب تم میرے نام ہو گئی ہو۔ صرف میری ہو۔ میرے رنگ میں رنگ گئی ہو۔ اب کوئی خدشہ کوئی ملال ہی نہیں۔ میں تب بھی جانتا تھا کہ تم جیسی لڑکی سے بے وفائی کا خطرہ نہیں ہوتا۔ مجھے اندھا اعتماد تھا تو تھا تم پہ جو اب مزید پختہ ہوا ہے۔"

اور دیا اس اندھے اعتماد اس درجہ سراہے جانے پہ سن بیٹھی رہ گئی تھی۔ کیا یہی نہیں تھی اصل

محبت۔ کیا یہی نہیں تھا اصل اعتماد۔ وہ لمحوں میں اسے معتبر کر گیا تھا۔ عین ممکن تھا اپنے دعوے کے مطابق اسیر بھی کر لیتا۔ وہ اندر سے خائف ہونے لگی۔ جبھی اس کے ہاتھ زور سے جھٹک دیئے۔

"اب جاؤ۔ دیر نہیں ہو رہی تمہیں؟"

وہ چیخی۔ گویا اس کیفیت سے چھٹکارا نہ پا کر ہی جھنجلا گئی۔ مستقیم شرارتی انداز میں دھیرے سے ہنس دیا۔

"اگر کسی برے انسان میں بھی کوئی اچھائی دیکھیں یا محسوس کریں تو اس کی تعریف عین ممکن ہے اچھائی کے جذبے کو تقویت دے کر پروان چڑھا دے۔ اسی بہانے تعریف کر دو میری۔ دل خوش ہو جائے گا۔"

وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ دیا اس درجہ درست قیافے پہ صرف ششدر نہیں ہوئی۔ خائف بھی ہو گئی جبھی رخ پھیر لیا۔ یہاں تک کہ وہ مایوس ہوتا پلٹ کر چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو پھر کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

وہ گنگناتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑا شیو بنا رہا تھا۔ آئینے میں دکھائی دیتی دیا پہ ہی گویا اس کی ساری توجہ مرکوز تھی۔ جس کا ارادہ آج کپڑے دھونے کا تھا شاید۔ جبھی بستر کی چادریں اور پردے تک اتار کر ڈھیر بنا رہی تھی۔ مستقیم شیو سے فارغ ہوا تو کپڑے اٹھائے واش روم میں جا گھسا۔ نہا کر سیاہ لباس میں نکھرا ستھرا صاف شفاف روپ لیے باہر آیا تو دیا بڑے ٹب میں سرف گھولے کپڑے بھگو رہی تھی۔

"کیسا لگ رہا ہوں بیوی! ابھی بتا ہی دیا کرو اللہ کی بندی!"

وہ اس کے عین سامنے جم کر کھڑا ہوا پوچھ رہا تھا۔ دیا نے بے خیالی میں نظر اٹھائی۔ سلیقے سے بنے بال جن میں ابھی نمی باقی تھی۔ خوشبوؤں میں مہکتا لباس۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی اپنی دینے والی وجاہت۔ وہ کچھ دیر واقعی نظریں نہیں ہٹا سکی۔

"دیکھا تم پر بھی چل گیا نا میرے حسن جہاں سوز کا جادو۔"

اس کے کھلکھلاتے انداز پر دیا نہ صرف چونکی بلکہ خفت سے بھی سرخ پڑ گئی تھی۔ جبھی بے ساختہ نظر چرائی۔

"شوہر کی تعریف کرنے میں بہرحال کوئی گناہ نہیں ہوتا مومن لوگو! اور کچھ نہیں تو کبھی دل ک

رکھ لیا کرو۔"

اس کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔ دیا رک گئی اور اسے برہم نظروں سے دیکھا۔

"ہر کوئی ظاہری خوبصورتی پر جان دے ضروری نہیں ہے مسٹر خلیفہ مستقیم! تم ظاہری طور پر جتنے بھی پرکشش ہو مگر مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ جانتے ہو کیوں......؟ اس لیے کہ تم باطنی طور پر بے حد غلط اور برے انسان ہو۔ مجرم ہو۔ لٹیرے ہو۔ کاش تم شکل صورت کے لحاظ سے جتنے بھی بدصورت ہوتے مگر ایک سدھرے ہوئے انسان ہوتے۔ مجھے تمہیں قبول لینے میں تامل نہ ہوتا۔"

وہ بولنے پہ آئی تو ہمیشہ کی طرح بنا لحاظ کیے بولی تھی۔

"امیزنگ! تم تو فلسفہ بھی بہت اچھا بولتی ہو یار!"

بغیر شرمندہ ہوئے وہ داد دینے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ پھر سگریٹ سلگا کر دانستہ اس کے منہ پہ دھواں چھوڑا۔ مقصد اسے تنگ کرنا تھا مگر دیا کو زور کی ابکائی آ گئی تھی۔ سرعت سے پیچھے ہٹنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا سی گئی۔ مستقیم نے بروقت نہ سہارا دیا ہوتا تو یقیناً گر گئی ہوتی۔

"دھیان سے میری جان! کیا ہو گیا؟"

اس محبت سے تھام کر خود میں سموتا ہوا وہ نرم گرم انداز میں بولا تھا۔ دیا نے اس کے بازوؤں کا حلقہ توڑ کر فاصلے پہ جاتے ہوئے گہرے سانس بھرتے ہوئے جیسے خود کو کمپوز کرنے لگی۔

"سگریٹ بند کرو۔ اس کی اسمیل سے میرا دل الٹ رہا ہے۔"

اس کے چہرے پر بیزاری و اکتاہٹ ثبت تھی۔ خلیفہ نے کچھ چونکتے ہوئے بغور اسے دیکھا پھر فی الفور سگریٹ بجھا ڈالا۔

"خیریت ہے دیا! اس سے قبل تو سگریٹ کی اسمیل سے تمہاری ایسی کیفیت نہیں ہوئی۔"

"نہیں ہوئی تو اس کا یہ مطلب ہے ساری زندگی ہو بھی نہ۔"

جواباً وہ تقریباً جھلائی۔ اس کے ہر انداز سے بے پناہ درشتی جھلک رہی تھی۔ خلیفہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں اک اسرار پوشیدہ تھا۔

"ہاں بالکل ضروری نہیں کہ ہو بھی نہ۔ یعنی خوش خبری تو انسان کو کسی بھی وقت مل سکتی ہے۔"

اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ جس پر دیا نے مطلق دھیان نہیں دیا نہ غور کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ خلیفہ اس سے مزید اس موضوع پر کھل کر ضرور بات کرتا اگر جو اس وقت اسے حسام کا بلاوہ نہ آ جاتا۔ جبھی وہ کچھ عجلت میں چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

اسی شام چولہے کے آگے سالن پکاتے ہوئے دیا کو پھر اسی انداز میں ابکائیاں آنے لگیں۔
سالن کے نیچے آنچ بھی دھیمی کیے بغیر وہ منہ پر ہاتھ رکھے کچن میں ہی سنک کے اوپر جھک گئی۔ صبح سے
وہ کام میں لگی تھی۔ جو معمولی سا ناشتہ کیا تھا وہ بھی کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود قے تھی کہ
رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ دیا کو خوف محسوس ہونے لگا کہ اس کی انتڑیاں بھی شاید اس کے منہ کے
راستے باہر آ جائیں گی۔ بشیر جو کسی کام کی غرض سے ادھر آیا تھا۔ اسے یوں حال سے بے حال دیکھ کر
الٹے قدموں بھاگا۔ جبھی اگلے چند لمحوں میں ہی مستقیم کسی قدر بدحواسی کے عالم میں دوڑتے ہوئے
قدموں سے اس کے پاس آیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے یونہی سنک پر جھکی ہوئی تھی۔

"دیا...... دیا! کیا ہوا جانم!"

اس نے پیچھے سے اس کے وجود کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اپنی طرف رخ پھیرا۔ اس
کی حالت نے جیسے مستقیم کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا۔ سرخ چہرا آنسوؤں سے جل تھل تھا۔ رنگت
بے تحاشا زرد۔ وہ جیسے لمحوں میں نچڑ گئی تھی۔ مستقیم نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں اور گال پونچھے۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کیا ضرورت تھی یہاں کھڑے ہو کر کام کرنے کی۔ اپنا خیال کیوں
نہیں رکھتی ہو۔ کتنا منع کرتا ہوں یوں خود کو ہلکان کرنے سے۔"

اسے ساتھ لگاتے ہوئے نرمی سے ڈانٹ دیا تھا۔ دیا کو بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ جبھی
کچھ نہیں بولی۔

"آؤ...... اب اندر چلو۔"

وہ اسے یونہی ساتھ لگائے پلٹا تو دیا نے بے اختیار کمزوری مزاحمت کی تھی۔

"نہیں...... سالن جل جائے گا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ ایسا تو کچھ دنوں سے ہو رہا ہے۔
او کے......" اس کا بازو ہٹا کر وہ نحیف سی آواز میں کہہ رہی تھی۔ مستقیم اب کے چونکا۔ اسے اس کی
کی کیفیت از سر نو یاد آئی تو بغور اسے دیکھا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے کچھ دنوں سے؟ یعنی وومیٹنگ؟"

وہ کچھ بے چینی کچھ اشتیاق کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر بولا تو دیا نے اس کے بدلے ہوئے
انداز پہ دھیان دیئے بغیر سر کو بے دلی سے اثبات میں جنبش دے ڈالی۔ جبکہ اس کے برعکس مستقیم
کی کیفیت ہی بدل گئی۔ آنکھیں چمکیں اور جوش مسرت سے رخسار تمتما اٹھے۔

"اور کیا محسوس کرتی ہو۔ مثلاً چکر وغیرہ بھی آتے ہیں ناں؟"

وہ اسے کاندھوں سے تھام کر زبردستی اندر لے آیا تھا۔ دیا اس کے سوالوں پر کتنی حیران ہوئی
تھی۔

"ہاں...... مگر تمہیں کیسے پتا؟"

"مجھے ہی تو پتہ ہے میری جان! کہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔"

جواباً وہ چہکا تھا۔ خوشی و انبساط کے بے پایاں احساس سمیت جھوم سا گیا۔ جبکہ دیا اک لمحے کو
پتھرا سی گئی۔ اسے لگا تھا اس کے اعصاب پر کسی نے طاقتور بم پھینک دیا ہو۔ وہ اک سکتے کی کیفیت
میں مبتلا اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتی رہی تھی۔ اسے اپنی ٹانگیں ہی نہیں اپنا پورا وجود شل ہوتا ہوا
محسوس ہوا تو بے جان سے انداز میں دھپ سے وہیں گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ مگر یہ پہلا موقع تھا
کہ مستقیم کا دھیان اس کی بجائے اس خوشخبری کی جانب تھا۔ جبھی اس کی بدلتی کیفیت نوٹ کیے بغیر
تیزی سے اٹھا۔

"اتنی بڑی خوشی ہے، میں سب کو بتاتا ہوں۔ آج تو جشن ہو گا۔"

وہ اسی جوش و خروش سے کہتا باہر جانا چاہتا تھا کہ دیا کا یہ سکتہ ایک دم چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

"بات سنو! ابھی کیا کہا تم نے؟"

اس نے درشتی سے استفسار کیا تھا۔ اسے ابھی بھی گویا اپنی سماعتوں پہ شبہ تھا۔ یا پھر وہ شبہ میں ہی
رہنا چاہتی تھی۔ مستقیم کے البتہ گمان تلک بھی اس کی کیفیت کی دگرگوں حالت تھی نہ اس کے احساسات
کی۔ جبھی اسی سرخوشی کے انداز واپس اس کے پاس آ گیا۔ پھر اسی جوش مسرت سے مسکرا کر بولا تھا تو
آنکھوں کی مسکان چھل چھل رہی تھی۔

"تمہیں بھی بہت اچھا لگا ناں؟ یہ خبر ہی ایسی ہے کہ بار بار سننے کو جی چاہے۔ مائی لویں یو آر
پرفیکٹ وومانی کنز۔"

وہ اس کی گھبرائی، شپٹائی متوحش آنکھوں میں جھانک کر ہنستے ہوئے بولا تو دیا جیسے بالکل
بے جان ہوتی پیچھے کی جانب چت ہوئی تھی۔ مستقیم کے لیے اس کی پیلی پڑتی رنگت تشویش کا باعث
بنی تھی۔ جبھی کتنا گھبرایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

"دیا! آر یو او کے؟ تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے؟"

وہ ایک دم اس کے سرد پڑ جانے والے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر وہائے اضطراب
چھلکاتی نظروں سے اسے تکتا کتنی پریشانی سے سوال کر رہا تھا۔ دیا نے آنسوؤں سے چھلکی اجنبی نظروں
سے اسے دیکھا اور ایک دم سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"تم کہو۔ ابھی جو تم نے کہا وہ جھوٹ ہے۔ سب غلط ہے۔"

وہ اسے پاگلوں کی طرح جھنجھوڑنے لگی۔ مستقیم حیران تو ہوا مگر اسے بے ساختہ اپنے حصار میں
لے کر نرمی سے تھپکتا مسکرایا۔

''نہیں دیا! یہ سچ......''

''سچ ...... یہ سچ ہے؟''

وہ مچل کر تڑپ کر اس کے حصار کو توڑ کر فاصلے پر ہوئی اور پھپک کر رو پڑی۔

''اگر یہ سچ ہے تو سنو۔ مجھے نہیں چاہیے یہ بچہ...... میں...... میں ایک ڈاکو۔ ایک لٹیرے کی نسل
کو آگے بڑھانے کا گناہ نہیں کر سکتی۔ مجھے اک سنپولیا نہیں جننا۔ کیا بنے گا وہ بڑا ہو کر......؟ ایک
کیا پہچان ہو گی اس کی۔ اک لٹیرے کی اولاد کہلائے گا۔ وہ...... ؟ بولو جواب دو مجھے خود غرض
پرست ظالم بے حس انسان! سوچو ذرا۔''

وہ اتنی وحشت، اتنی بے قراری سے روئی تھی کہ مستقیم کو اسے سنبھالنا دشوار ہونے لگا۔
وہ خود اس پل دیا کے اتنے شدید ردعمل کے جواب میں گہرے ذہنی کرب سے دوچار ہو گیا تھا۔
دیا کے الفاظ نہیں نوکیلے خنجر تھے جو اس کی رگ جاں میں جا اترے تھے اور اسے بیدردی سے کاٹ
رکھ گئے تھے۔ ہونٹ بھینچے، ضبط کے کڑے مرحلے طے کرتے اس نے بپھری موج کی طرح تڑپتی
دیا کو اپنے بازوؤں میں بھینچا اور بستر تک لے آیا۔ جو چیخ چیخ کر نڈھال تھی مگر اشتعال ختم نہیں
تھا۔ مگر اب یک دم اس کے بازوؤں میں نیم جان سی ہوتی جھول گئی تھی۔ مستقیم نے احتیاط سے
اسے بستر پر لٹایا اور کمبل اوڑھا دیا۔

وہ چہرے پر آنسوؤں کے نشان لیے ہچکیاں بھرتی اور سسکتی رہی۔ مستقیم اسے دیکھتے ہوئے
اذیت کی ان دکھی تلوار سے کتنا رہا۔ پھر آہستگی سے پلٹا تو انداز میں صدیوں کی تھکن نمایاں تھی۔

☆......☆......☆

اونچے اونچے درختوں کے پتے سرد ہوا کے جھونکوں سے سرسراتے تو رات کے سناٹے میں
عجیب سا شور پیدا ہونے لگتا۔ وہ اتنا مضطرب تھا کہ اس غضب کی سردی کا بھی گویا احساس باقی نہیں
تھا۔ دیا کا اتنا شدید ردعمل اسے اندر سے شکستہ کرنے توڑنے پھوڑنے کا سبب بنا تھا۔ اسے لگا
ہی وہ جیتی ہوئی ہر بازی ہار گیا ہے۔ شاید زبردستی کی جیت کبھی بھی راحت اور خوشیوں کا سامان
نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اس نے تو اپنی پوری توانائیاں صرف کر کے دیکھ لی تھیں۔ جبھی اب تھکا ہوا
اور مضمحل تھا۔ ہونٹوں میں دبا سگریٹ سلگ سلگ کر ختم ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ لڑکی پتھر تھی یا
جذبوں میں کوئی کمی تھی۔ ابھی کل ہی اس نے کتنی عاجزی سے اپنی کیفیات پھر اس تک پہنچائی

تھی۔ جب وہ اپنے مخصوص روکھے اور سرد انداز میں اس کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ رہی تھی۔

اک شام ڈھلے تم ہنس کے ملو ۔ بس اتنی مسرت کافی ہے
تم ساتھ رہو، سانسوں میں بسو ۔ تم پاس رہو، بانہوں میں رہو
تم دل میں رہو دھڑکن کی طرح ۔ خوابوں میں رہو یادوں کی طرح
اتنی بھی محبت کافی ہے

اور دیا کی نظروں میں جواباً کتنی تپش کس درجہ اکتاہٹ اتر آئی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ اسے ان ہی
نظروں کی مار مارتی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی اور وہ سرد آہ بھرتا اپنی ہتھیلیوں پر پھیلے لکیروں کے جال
میں الجھنے لگا تھا۔ شاید محبت کی لکیر ڈھونڈ رہا تھا۔ جو نظر ہی نہ آئی تھی اور اب اسے یقین ہوا تھا وہ کبھی
اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو گا۔ وہ اگر پتھر نہیں بھی تھی تو مستقیم کی اس حرکت نے ضرور اسے پتھر کر
دیا تھا۔ اسے یاد آیا جب وہ اس پر سے رحم مانگ رہی تھی۔ اس نے اس پر ترس نہیں کھایا تھا۔ اب وہ
کیونکر اس پر رحم کھاتی۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے مگر دل اس اذیت کو نہ سہتے سسکنے لگا تھا۔

ساری رات گزر گئی تھی اسے وہاں کھڑے اپنی قسمت کا ماتم کرتے۔ سورج اب دھیرے
دھیرے افق سے نمودار ہو رہا تھا۔ یخ بستہ فضا کہر آلود تھی۔ وہ وہاں سے نکل کر جھیل کنارے آ گیا۔
اور پانی کی سطح پہ ہوا کی تندی سے پڑنے والے بھنور خالی نظروں سے دیکھے گیا۔ تب ہی اپنے پیچھے
آہٹ محسوس کی۔ مگر پلٹ کر دیکھنے کی خواہش اس نے اس اندر جنم نہیں لیا۔ جبھی اسی زاویے پر ساکن
رہا تھا۔ یہاں تک کہ امانت چلتا ہوا اس کے مقابل آ گیا۔

''تم اتنی صبح یہاں کیا کر رہے ہو مستقیم!''

امانت کی آواز میں تحیر و استعجاب تھا۔ مستقیم نے جواب دیے بنا جلتی آنکھیں میچ لیں۔ امانت
نے گردن موڑ کر اسے بغور دیکھا تھا۔ پھر گہرا سانس بھر کے گویا ہوا۔

''ڈسٹرب لگتے ہو۔ حالانکہ ہونا نہیں چاہیے۔ آف کورس تم وہ خوش قسمت انسان ہو اس اندھی
بہری محرومیوں سے بھری بستی کے، جس کے پاس سب کچھ ہے۔ گھر۔ گھر والی۔ گھر والی بھی وہ جو
بے حد خوبصورت ہی نہیں اس کی پارسائی پر بھی شبہ نہیں۔ اللہ نے چاہا تو بچہ بھی ہو جائے گا۔ پھر اس
پریشانی کی وجہ؟''

امانت اسے چھیڑ رہا تھا۔ مگر مستقیم کے چہرے پر رقم اذیت کچھ مزید گہری ہونے لگی تھی۔

''ایسا بہت کچھ جو ہماری زندگیوں میں نہیں ہونا چاہیے امانت! لیکن وہ ہماری رضا کے بغیر
بھی ہو جایا کرتا ہے۔ مجھے یہی ہونا بے چین اور پریشان کر رہا ہے۔ دراصل جو ہم سمجھتے ہیں

ضروری نہیں سب ویسا ہو۔"

اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور اس اضطرابی کیفیت میں کش لینے لگا۔

"بھابی کی بات کررہے ہو؟"

امانت نے مسکرا کر اس کی صورت دیکھی۔ لیکن پھر کسی قدر حیرت سے بولا تھا۔

"مگر یار! وہ ایڈجسٹ کرتو رہی ہیں۔ ڈونٹ وری! ٹھیک ہو جائے گا سب ......"

اس کا انداز تسلی دیتا ہوا تھا۔ مستقیم کے چہرے پر موجود تنی کچھ اور گہری ہوئی۔

"کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں بھی اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا مگر رات ..."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک دم سے ہونٹ باہم بھینچ لیے۔ امانت کی نظریں سوالیہ انداز میں اسی پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

"رات کیا ہوا؟ جھگڑا ہوا ہے تمہارا ان سے؟"

مستقیم ہونٹ کچلتا رہا۔ پھر بے حد بے دلی کی کیفیت میں سگریٹ جھیل کے پانی میں پھینک دی۔ شعلہ بجھنے کی ہلکی سی آواز ابھری اور سگریٹ پانی میں جاتے ہی کھل کر تمباکو اور راکھ سطح پہ تیر گئی۔

"مجھے افسوس ہے۔ مجھے اپنی زیادتی کا احساس اس وقت ہوا جب ازالے کا وقت گزر چکا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

امانت کو تحیر نے آن لیا۔ وہ ششدر ہوتا آنکھیں پھاڑے اسے تکنے لگا۔ یہ کسی بھی لحاظ سے مستقیم نہیں تھا۔ جس سے وہ آگاہ تھا۔ اکھڑ، ضدی، مغرور اور ہٹ دھرم، جو صرف اپنی ہی منواتا تھا۔ مگر اس ایک لڑکی کی بدولت اس نے خلیفہ مستقیم میں کیسے کیسے نہ تغیر آتے دیکھ لیے تھے۔

"ہاں...... محبت ایسا ہی تو باکمال جذبہ ہے۔ اسے نیم دیوانی ہوتی شمائل یاد آئی۔ جو مستقیم کی تمام تر بے اعتنائی کے باوجود اس پر دل و جان سے فریفتہ تھی۔ پھر وہ خود تھا۔ جانتا بھی تھا۔ شمائل سے نہیں مستقیم سے عشق کی حد تک عقیدت رکھتی ہے مگر وہ اس سے محبت کرنے پر مجبور تھا۔

"وہ پریگننٹ ہے۔ مگر وہ میرے جیسے عادی مجرم کے بچے کو جنم دینے کو تیار نہیں ہے۔"

امانت کو سوچوں کے بھنور سے کھینچ لانے کا باعث خلیفہ مستقیم کی آواز بنی تھی، جو بے حد تھکی اور مدھم تھی۔ دکھ کی آنچ سے جھلسی۔ اس نے چونک کر مستقیم کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ تھیں لگتا تھا ان سے کسی بھی لمحے خون چھلک پڑے گا۔ وہ کیا کہتا۔ چپ بیٹھا اس کا دکھ سہتا رہا۔ کتنی دیر کیفیت میں گزری تھی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوتا ہوا نرمی سے ٹوک کر بولا تھا۔

"آؤ۔ اندر چلیں۔ پتہ نہیں کب سے یہاں بیٹھے ہو۔ اپنی رنگت دیکھو۔ بالکل نیلی ہو رہی ہے سردی کے باعث۔"

مستقیم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال لیا۔

"تم چلو۔ آجاتا ہوں کچھ دیر میں میں بھی۔"

اس جواب پر امانت بے بس سا ہوتا اسے تکنے لگا۔ جانتا تھا وہ اس کی بات نہیں مانے گا۔ چاہے وہ اپنا سر کیوں نہ پیٹ لے۔

☆......☆......☆

وہ کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو تکیہ بھگو رہے تھے۔ جب ہلکی سی آہٹ پر اس نے بے ساختہ گردن موڑی مگر حیرت و غیر یقینی سے ساکن ہو کر رہ گئی۔ دادی کمرے کے عین وسط میں مسکرا کر اسے دیکھتیں دونوں بازو پھیلائے کھڑی تھیں۔ اس میں جیسے پارہ بھر گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک ہی جست میں سارا فاصلہ سمیٹ کر ان کے کھلے بازوؤں میں سما گئی۔ دل تو تھا ہی بھرایا ہوا۔ وہ بے ساختہ ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔ دادی پیار سے اس کے سر کو سہلاتی رہیں، آنسو پونچھتی رہیں۔

"آپ کہاں چلی گئی تھیں دادی!"

اس نے کسی انجانے خوف میں مبتلا ہوتے ان کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

"میں کہاں گئی تھی...... تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی...... یاد نہیں؟"

دادی مسکرا دی تھیں۔ وہ سسک اٹھی۔

"وہ مجھے لے گیا تھا۔ زبردستی...... میں کب اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔"

اس کے آنسوؤں میں کچھ اور روانی آ گئی۔ دادی نے نرمی سے اس کی آنکھیں پونچھ دیں۔

"بس...... بس! اب رونا نہیں ہے۔"

"میرے آنسو کبھی خشک نہیں ہو سکتے دادی! قسمت نے مجھے ایک عادی مجرم کی ذات کا حصہ بنا دیا ہے۔ مجھے بہت نفرت ہے اس سے۔"

اس کا لہجہ شدید تھا۔ اس کا انداز گنجائش سے عاری تھا۔ جسے دادی نے محسوس کیا تو ٹوکنا ضروری ہو گیا تھا۔

"نہ بیٹی! نفرت مجرم سے نہیں، جرم سے ہونی چاہیے۔"

اور دیا ان کی اس انوکھی منطق پہ کتنی حیران ہو گئی تھی۔

"میں تم سے بہت خفا ہوں دیا! تجھے یاد ہے۔ تیرا نام دیا میں نے رکھا تھا۔ پھر تیری تربیت اس کی طرح کی کہ تو اپنے نام کا حق ادا کر سکے۔ تو تو دیا تھی نا...؟ جس کا کام ہی روشنی پھیلانا ہے۔ اسے چاہے محل میں رکھ دو یا قبرستان میں۔ اس نے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ یہ اس کی قسمت کہ اسے کیسی جگہ کو اجالنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ دیا! مجھے بتاؤ اگر یہ ذمہ داری محل کے بجائے ویرانے کو اجالنے کی سر پڑ گئی ہے تو تو اپنے فرض سے دستبردار ہو جائے گی؟ روشنی کی بجائے دھواں دے گی۔ جو آنکھوں کی بینائی چھین لیتا ہے۔"

ان کی باتیں کتنی مشکل تھیں۔ جن کا مفہوم اسے قطعی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان کی ... محسوس کرتی ان کی گود سے سر اٹھا کر سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں ... ہو کر دیکھا۔ دادی نے اس کی کیفیت کو سمجھا اور اس کا سر سہلا کر پھر سے نرمی و پیار سے بولی تھیں۔

"پتر جب اللہ سائیں اپنے کسی بندے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے یا قریب کرنا چاہتا ہے اس سے خاص اور بڑے بڑے کام لیا کرتا ہے۔ ان حالات میں تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ اللہ نے تمہیں کسی کی ہدایت کے لیے چنا ہے۔ مستقیم اگر تمہاری محبت میں بے بس ہوا ہے تو تم اس کی محبت کا فائدہ اٹھا کر کوئی ایسا کام لے سکتی تھیں جو اسے ان اندھیروں اور پرخار راستوں سے واپس لے آتا۔ مگر تم نے تو خود بھی ہدایت کی روشنی سے منہ موڑ لیا۔ بتاؤ دیا! یہ تھی میری تربیت.........؟"

دادی کا ہر سوال شرمندگی اور خفت میں مبتلا کرنے والا تھا۔ وہ اس قابل بھی نہیں رہی تھی کہ جواب دے سکتی۔

"ابھی بھی وقت گزرا نہیں ہے پتر! اپنے حصے کا کام انجام دے ڈالو اور رب کے حضور آنا میں سرخروئی حاصل کرو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

دادی نے اس کا سر تھپکا۔ ماتھا چوما اور اک دم سے جانے کہاں چلی گئیں۔ وہ تڑپ کر بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"دادی...... دادی۔"

وہ ہڑبڑا کر بستر سے نکلی اور بے قراری و بیتابی سے اندھا دھند دروازے کی سمت بھاگی تھی۔ اندر داخل ہوتے مستقیم سے بری طرح ٹکرا کر گرنے کو تھی۔ جب مستقیم نے بے اختیار اسے تھاما۔ رو رو کے سوجی آنکھیں، متورم چہرا، وہ پسینوں میں بھیگی ہوئی تھی اور بری طرح کانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟ کہاں جا رہی ہو؟"

اسے اپنا آپ اسی وحشت زدہ انداز میں چھڑا کر پھر سے دروازے کی جانب لپکتے دیکھ کر مستقیم نے اس کے ٹہنی ڈال جیسے وجود کو تھامتے ہوئے ٹوکا۔ وہ اسے ہرگز حواسوں میں نہیں لگتی تھی۔

"دادی! ابھی دادی آئی تھیں میرے پاس۔ پھر پتہ نہیں کہاں چلی گئیں۔"

اس نے بھیگی ہوئی گھبراہٹ زدہ آواز میں کہا تو مستقیم نے اب کی بار ٹھٹک کر اسے دیکھنا شروع کیا۔

"تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ وہ یہاں کیسے آ سکتی ہیں بھلا؟"

اسے نرمی سے سمجھاتے مستقیم نے اسے ہاتھ پکڑ کر بستر پہ بٹھاتے ہوئے رسان سے کہا تھا۔

"تم آرام کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ سر جھکائے اس خواب کے زیر اثر بیٹھی ہونٹ کچلتی رہی۔ اس نے مستقیم کی بات کا جواب نہیں دیا تو۔ چند لمحوں کے توقف سے وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں دبانے لگی اور مستقیم جو پہلے ہی ذہنی اور قلبی اذیت و انتشار کا شکار تھا بھینچے ہونٹوں سے اسے دیکھتا ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بس کرو دیا! پلیز یوں خود کو ہلکان مت کرو۔ اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس مصیبت سے تمہاری جان چھڑوا دوں گا۔"

تیز لہجے میں کہتا وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ دیا ہنوز اسی کیفیت میں گھٹنوں میں چہرا دیئے رونے سسکنے میں مصروف تھی۔ اس بات پر دھیان دیئے بغیر کہ مستقیم کس اذیت سے دوچار ہے۔

☆......☆......☆

بہت دنوں بعد اس نے غسل کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ دعا کو ہاتھ اٹھائے تو پلکیں آنسوؤں کے خزانے بے دریغ لٹانے لگیں۔ وہ کتنی دیر یونہی بے قراری سے دل کا بوجھ اتارتی رہی۔

"دادی کہتی ہیں میں دیا ہوں۔ روشنی پھیلانا میرا کام ہے۔ بلکہ فرض ہے۔ مگر کیسے؟ میرے خدا مجھے راستہ بتا۔ میں بس تیری مدد تیری راہنمائی کی طلب گار ہوں۔ میری مدد فرما! مجھے نہیں پتہ اس مقام پر مجھے کیا کرنا ہوگا۔ اس مرحلے پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر تو نے یہ مشکل راستے میرے نصیب میں لکھے ہیں تو ان پر چلنے کا حوصلہ، اس آزمائش میں سرخروئی کا ہنر بھی عطا فرما دے۔ آمین ثم آمین۔"

اس نے منہ پر ہاتھ پھیر کر نظر اٹھائی تو مستقیم کو اپنی طرف کسی قدر حیرت سے تکتے پا کر پہلی بار اس کا دل چونکے اور نئے انداز میں دھڑکا۔ اسے اس کی یہ نظریں، یہ توجہ بری نہیں لگی تو یہ احساس اسے خود بھی اچنبھے سے دوچار کر گیا۔ جائے نماز سمیٹ کر تہہ کرتے اس کی لانبی پلکیں لرز کر حیا آمیز

انداز میں عارضوں پر سایہ فگن ہو گئی تھیں۔

"دیا! یہ میڈیسن لے لو۔"

وہ جائے نماز رکھ کر سیدھی ہوئی، تو اسے اپنا منتظر پایا تھا۔ ایک نسبتاً چھوٹا براؤن لفافہ اس کی جانب بڑھائے وہ اس کی سمت دانستہ دیکھنے سے گریز برت رہا تھا۔ دیا کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"کیسی میڈیسن ہے یہ؟"

وہ لفافہ تھامنے میں متامل کا شکار حیرت سے استفسار کیے بغیر نہ رہ سکی۔ مستقیم چند ثانیوں کو چپ رہ گیا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی لفافہ تھمایا۔

"اس کے استعمال سے تمہیں اس ناسور سے چھٹکارا مل جائے گا۔ جو تمہارے وجود میں پل رہا ہے۔"

وہ جتنا سنجیدہ تھا۔ دیا اسی قدر شکستہ ہو کر رہ گئی۔ لفافہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ رنگت ہلدی کی مانند پیلی ہو گئی تھی لمحوں میں۔ مستقیم نے زہر خند نظروں سے اس کے چہرے کی بدلتی رنگت کو دیکھا تھا۔

"پریشان کیوں ہوتی ہو؟ اس میں ایسی مضر صحت کوئی چیز نہیں جس کا سائڈ افیکٹ ہو۔ ایکس پینسو ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

وہ جیسے پوری شدومد سے اسے یقین سونپ رہا تھا۔ دیا نے دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ رخ پھیر لیا۔ شدت ضبط سے اس کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔ وہ بیک وقت کتنی مثبت و منفی کیفیات کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ بوجھل اور مضطرب، مستقیم جانب سے جواب اور ردعمل نہ پا کر متاسفانہ سانس کھینچتا ہوا پھر اسے مخاطب کر گیا تھا۔

"تمہیں اگر میری بات کا اعتبار نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ کل میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا اور خود......"

"مستقیم! پلیز...... پلیز لیومی الون، فار گاڈ سیک۔"

وہ اس کی جانب رخ پھیرتے ہی اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخی کی پہلے سے سرخ ہو کر دہکتی آنکھیں کچھ اور بھی حدت میں سمیٹ لائیں۔ کچھ دیر اسے یونہی ہونٹوں سے لہو رنگ آنکھوں سے تڑپ تڑپ کر بلکتے روتا دیکھتا رہا پھر جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل جبکہ وہ خزاں زدہ پتے کی مانند کانپتی یونہی روتی حال سے بے حال ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے — پر اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی — کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
ہم راکھ لیے ہیں جھولی میں — اور سر پہ ساہوکار کھڑا
جب دھرتی صحرا صحرا تھی — ہم دریا دریا روتے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں — اور سر سنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں — کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
کچھ خواب سجل مسکانوں کے — کچھ بول بہت دیوانوں کے
کچھ لفظ وفا کی شمعوں کے — کچھ پر پاگل پروانوں کے
پھر اپنی گھائل آنکھوں سے — خوش ہو کے لہو چھڑکایا تھا
ماٹی میں ماس کی کھاد بھری — اور نس نس کو زخمایا تھا
اور بھول گئے پچھلی رت میں — کیا کھویا تھا کیا پایا تھا
ہر بار گگن نے وہم دیا — اب کے برکھا جب آئے گی
ہر بیج سے کونپل پھوٹے گی — اور ہر کونپل پھل لائے گی
ہم جو خوابوں کے بیوپاری تھے — پر اس میں ہوا نقصان بڑا

وہ ویسا ہی خاموش تھا جیسا دیا کے پاس سے اٹھ کر آیا تھا۔ البتہ آنکھوں کی سرخی میں اب نمی بھی تیرتی تھی۔ بارش دیوانہ وار برس رہی تھی۔ وہ عجیب سی حسرت سے برستی بارش کو تک رہا تھا۔ بوندیں کتنے جوش اور جذبے کے ساتھ زمین کی جانب لپکتی تھیں۔ مگر دھرتی کے سینے پہ گرتے ہی اپنا وجود کھو بیٹھتی تھیں۔ اس کی ذات، اس کی محبت بھی ایسی ہی بے مایا اور بے وقعت تھی۔ یہ اس پر دیا نے بارہا مرتبہ واضح کیا تھا۔ مگر وہ کتنا احمق تھا کہ پھر بھی اس جذبے، اسی شوق سے اس کٹھن راہ پر اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا۔ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی میں تن من دھن سے مگن رہا۔ یہ جانے بنا کہ ضروری نہیں ہر پتھر کے پھوٹنے سے چشمہ جاری ہو۔ وہ بھی تو پتھر ہی ہوتے ہیں جو سیال مادے اگلتے ہیں۔ دیا بھی ایسا ہی پتھر ثابت ہوئی تھی۔ جو اس کی دیوانہ وار ٹکروں سے ٹوٹ تو ضرور گئی تھی مگر اندر سے جو لاوا نکلا تھا اس نے نحیف مستقیم کے پہلے سے زخموں سے اٹے خونم خون وجود کو اپنی تپش اور آگ سے جلا کر بالکل خاکستر کر کے رکھ دیا تھا۔

کیسی بے بسی اتر آئی تھی مستقیم کے اندر۔ پرانی بھی ساری اذیتیں جاگ اٹھی تھیں گویا سارے زخموں کے منہ کھل گئے تھے۔ اس نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر بارش کے پانی میں اچھال دیا۔

وہ گیلا ہوتے ہی بجھ گیا تھا۔ مگر مستقیم کی آنکھوں اور دل میں بھڑکتے شعلے بجھنے کے بجائے اپنی لو [illegible]
کرنے لگے۔

وہ اسے لٹیرا کہتی تھی۔ غاصب سمجھتی تھی۔

کیا وہ ہمیشہ سے لٹیرا تھا؟

کیا وہ ہمیشہ سے غاصب ہی تھا؟

نہیں...... یقیناً نہیں۔

ضروری تو نہیں کہ انسان پیدائشی فسادی ہو۔ قدرت نے تو ہر انسان کو معصوم بنا کر پیدا کیا [illegible]
کچھ کی فطرت میں شر ہوتا ہے مگر کچھ گناہ اور غلط راہوں پر زبردستی ڈال دیے جاتے ہیں۔ اس کا [illegible]
بھی موخر الذکر میں ہوتا تھا۔ اسے بھی حالات کی سنگینی، واقعات کی سفاکی نے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔
اپنی فطرت کی سادگی، معصومیت اور بھولپن سے دستبردار کر دیا گیا۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی [illegible]
معاشرے اسی طبقے اور اس کے افراد کے ناروا سلوک کا نتیجہ تھا جو آج اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا [illegible]
جو اسے مجرم سمجھ کر اس سے شدید نفرت میں حق بجانب تھا۔

☆......☆......☆

تپتے ہوئے جون کی یہ ایک سخت ترین دوپہر تھی۔ سورج کا دہکتا گولہ عین سروں کے اوپر [illegible]
رہا تھا گویا تیز دھوپ کی تپش درختوں کی جڑوں تک کو بھی گرمائے دے رہی تھی۔ اس پل گاؤں [illegible]
گلیاں اکثر سونی ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں کوئی اکا دکا بڈھا کسی پیڑ کی چھایا میں چارپائی بچھائے لیٹا [illegible]
نظر آ جائے تو آ جائے۔ ورنہ مائیں اپنے بچوں کو گھروں میں گھسائے نہ صرف خود سوتیں بلکہ بچوں [illegible]
بھی زبردستی سلا لیتیں۔ مگر وہ تو "موجو" تھا نا۔ جو بقول اپنی نانی ماں کے بہت ہی بیبا بچہ تھا۔ اسے [illegible]
شغف تھا نہ لڑنے بھڑنے سے، وہ تو بس پڑھائی کا شوقین تھا۔

اس پل بھی وہ نیم کی گہری چھاؤں میں بیٹھا سکول کا کام نپٹا رہا تھا۔ چھنیوں کے کام [illegible]
اس کی موتیوں جیسی لکھائی سے بھرتا جا رہا تھا۔ فضا میں تو لو اور چکی کی آواز کے ساتھ منڈیر پر بیٹھے [illegible]
کی کریہہ آواز کا تاثر بھی قائم تھا۔ جس پر دھیان لگائے بنا وہ اپنے کام میں جی جان سے محو [illegible]
فضا میں اچانک ڈھول تاشوں کی آواز نے بھی اپنی جگہ بنائی اور پھر ہر آواز پر غالب آتی چلی گئی۔
تیزی سے لکھنے میں مصروف ہاتھ اسی آواز کے ساتھ ساکن ہوا تھا۔ اس نے رجسٹر سے سر اٹھا [illegible]
نظروں سے نانی کو دیکھا۔ جو ہاتھ میں موجود پنکھی جھلتے نیند کے جھونکے کی زد پہ تھیں۔ اس کے [illegible]
چہرے پر جوش پیدا ہو گیا۔

اس نے آہستگی سے قلم رجسٹر پر رکھا اور چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بان کی کھری چارپائی اس کی
اس دھاندلی کو ظاہر کرنے کو زور سے چرچرائی اور اونگھتی نانی کی آنکھ کھل گئی۔ موجو سرعت سے واپس
بیٹھا اور سر ضرورت سے زیادہ جھکا لیا۔ نانی غنودگی میں تھیں۔ دو چار بار پنکھی جھلی اور پھر اونگھنے لگیں۔
موجو نے سکھ کا سانس بھرا تھا۔ اسے ہر صورت باہر جانا تھا۔ دو گلیاں چھوڑ کر آج کرمو موچی کی بیٹی کی
بارات آنی تھی۔ جو یقیناً اب آ بھی چکی تھی۔ آج صبح ہی تو اسے ناصر نے بتایا تھا۔ اس کے اکلوتے
دوست نے۔

"اماں کی آنکھ بچا کر نکل لینا۔ پیسے لوٹیں گے۔"

ناصر کو ہر ایسے موقع پر پیسے لوٹنے کا بڑا شوق رہتا تھا۔ ان لوٹے ہوئے پیسوں سے وہ کھٹی
گولیاں لے کر کھایا کرتا۔ کچھ خرید کر مزے اڑاتا۔ ورنہ اماں تو "چونی" مانگنے پر بھی بے دریغ دھنک
کر رکھ دیا کرتی تھی۔ اب اس نے موجو کو بھی اس کار خیر میں شامل کر لیا تھا تو مزا کیسا دوبالا ہونے لگا
تھا بھی۔ وہ صبح مولوی صاحب سے سیپارہ پڑھنے آیا اسے بتانے کے بعد لازمی آنے کا وعدہ لے کر ہی
گیا تھا۔ مگر موجو پڑھائی میں مگن ہو کر یکسر بھول بیٹھا تھا۔ اب ڈھول کی آواز سن کر ہی یاد آیا تھا۔ نانی
پھر سو گئی تھی۔ اس نے دبے قدموں چارپائی کو چھوڑا اور یونہی بے آواز قدموں سے چلتا دروازہ پار کر
آیا۔ اگلے لمحے وہ ننگے سر ننگے پیر تپتی جلتی گلیوں میں بھاگا جا رہا تھا۔

دو گلیاں پار ہوئیں تو سامنے اس کا من پسند منظر اس کا منتظر تھا۔ جوش و خروش سے ڈھول بجاتا
ڈھولچی۔ سنہری تاروں سے سجا سہرا باندھے سفید شلوار بوسکی کے کرتے میں گلے میں نوٹوں کا ہار ڈالے
دولہا اور رنگ برنگے کپڑے پہنے اکڑ کر چلتے باراتی۔ گویا آج ان سے بڑھ کر کوئی اور معتبر ہی نہیں تھا۔
موجو کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہیں پیسے لٹا تو نہیں دیے گئے؟

مگر اس وقت اس کی سانسیں بحال ہوئی تھیں۔ جب باراتیوں میں سے کسی ایک نے ایک
کپڑے کی تھیلی کا منہ کھولا اور مٹھیاں بھر بھر ریزگاری فضا میں اچھالنا شروع کی اور ایسے ہی موقع کی تاک
میں کب سے منتظر موجو جیسے لاتعداد بچے بچیاں اک ساتھ جھپٹے۔ اور گویا گتھم گتھا ہو گئے۔ انہی میں
موجو بھی شامل تھا۔ مگر صد افسوس وہ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح بہت سارے سکے نہ سمیٹ سکا تھا۔
تھوڑی دیر بعد یہ دھول مٹی چھینا جھپٹی اور افراتفری کا منظر معمول پہ آ گیا۔ بچے اپنی اپنی مٹھیاں اپنی جیبوں
میں منتقل کرتے گھروں یا پھر گاؤں کی واحد "ہٹی" (دکان) کی راہ لینے لگے۔ موجو بھی اپنی بند مٹھی
[illegible] بھرنے کو تھا کہ ناصر اسے پکارتا ہوا قریب آ گیا۔

"کتنے پیسے لوٹے؟"

وہ مسکرا کر چمکتی آنکھوں سے پوچھتا تھا۔ جواباً موجو نے کاندھے اچکا کر لاعلمی ظاہر کی تو ناصر نے مٹھی کھول کر گننے کا اصرار شروع کر دیا تھا۔ موجو نے ازلی معصومیت سمیت مٹھی کھول دی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ شمار کر پاتا۔ ناصر نے اچانک جھپٹا مارا تھا۔ ریزگاری اس جھٹکے کے نتیجے میں زمین بوس ہوئی۔ جسے ناصر نے پلک جھپکتے میں سمیٹ کر اپنے قبضے میں لیا اور قہقہے لگاتا ہوا ہوا ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع غیر یقین تھا کہ وہ ششدر کھڑا رہ گیا تھا۔ یہ اس کی سادگی۔ اس کی معصومیت یہ پہلا حملہ تھا جس کا طریقہ کار بعد میں وقت اور حالات کے ساتھ بدلتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

''موجو...... او موجو......''

وہ ہاتھ میں پکڑی تیل کی بوتل سمیت اچھلتا کودتا ہوا گھر کی سمت رواں دواں تھا جب اچھو نے اسے پکارا۔ نام تو ارشد تھا مگر پیار میں اچھو ہو گیا تھا۔ ناصر تو اسے کہتا ہی اچھو تمن سو دو تھا۔

''آ...... ساگ توڑنے چلیں۔''

''میں نہیں جاؤں گا۔''

اس صفاچٹ جواب پر اچھو کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔

''کیوں رے...... کیوں نہیں جائے گا بھلا؟''

''نانی اماں کہتی ہے۔ جو کام چھپ کر کیا جائے وہ یا تو گناہ ہوتا ہے یا چوری۔''

اس نے جواباً جس سنجیدگی سے کہا تھا۔ اچھو نے اسی قدر بے ڈھنگے پن سے اسے ایک چپت لگا دی۔

''چل بے۔ بڑا آیا مولوی، ہمارا اپنا کھیت ہے۔ ہم کیوں کرنے لگے چوری۔ آ جا آم بھی توڑ کے دوں گا تمہیں۔ پسند ہیں نا؟''

وہ لالچ دے رہا تھا۔ موجو کے منہ میں واقعی پانی بھر آیا۔ کتنا دل کرتا تھا آم کھانے کو۔ اس نے کئی بار ممنا کرامی سے فرمائش بھی کی تھی مگر وہ پتہ نہیں کیوں ان سنی کر جاتی تھیں۔

''گناہ تو نہیں ہو گا اچھو؟''

وہ ہنوز متذبذب تھا۔ اچھو نے جواباً قہقہہ لگایا۔

''اے کہا نہ نہیں ہو گا۔ آ جا اب۔''

اور وہ اس کی باتوں میں آیا اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ اچھو نے جی بھر کے پہلے ساگ توڑا پھر آموں کے باغ میں آ کر درخت پر چڑھ کر خوب کچے پکے آم توڑ کر نیچے پھینکے اور وہ اس کی تاکید پر

مطابق جیب کر جھولی بھرتا گیا۔ اچھو اس وقت بوکھلایا تھا جب باغ کا رکھوالا ڈانگ لہراتا ان کے سر پر پہنچا۔ اچھو تو تھا ہی چوکنا سرکنے میں دیر نہ لگائی کہ اسے ایسے کاموں اور چوریوں کا تجربہ تھا۔ وہ ضرور پکڑا گیا تھا۔ رکھوالے نے اسے دو چار گردن میں دھریں پھر سارے آم بھی چھین لیے۔ وہ صفائیاں دیتا بے چارہ رہ گیا۔

''دفع ہو جا یہاں سے۔ ورنہ تیری نانی کو شکایت لگا دوں گا۔ بلکہ چل ابھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔''

رکھوالے کے تیور غضبناک تھے۔ موجو کے پسینے چھوٹنے لگے۔ جبھی الٹے قدموں بھاگا تھا۔ وہاں اڑاتا ہوا۔ بے حد گندے کپڑے، مٹی سے اٹے پاؤں، بدرنگ بال اور اس کی تلاش میں اس سمت آئے ابو کا اسے دیکھتے ایک دم سے پارہ چڑھ گیا۔

''مستقیم، مستقیم!''

انہوں نے چیخ کر پکارا تھا۔ وہ پہلے تو چونکا تھا۔ پھر ٹھٹک کر تھم گیا۔ اسے اپنا ہی نام اجنبی لگا تھا اور اپنا باپ اپنے نام سے بھی کہیں زیادہ اجنبی۔ وہ تو نانی کی وجہ سے موجو ہی مشہور ہو گیا تھا۔ خلیفہ مستقیم تو بس سکول بس حاضری کے وقت آواز پڑتی اور وہ ''حاضر جناب'' کہہ کر پھر سے اس نام کو بھول جایا کرتا تھا۔ اس کے ہم جماعت بھی سارے اسے ''موجو'' ہی کہتے تھے۔ پھر یہ اس کا باپ تھا۔ کوٹ بازو پر ڈالے، شرٹ کے کف موڑے، ڈھیلی ٹائی، سنجیدہ چہرا بلکہ بے حد وجیہہ مگر کرخت چہرہ جیسا چہرا، وہ ہمیشہ کی طرح بے تحاشہ ہینڈسم اور ڈیشنگ تو لگ رہے تھے مگر اس کے باپ نہیں۔ انہوں نے کبھی اسے پیار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کبھی پیار سے نہیں بلایا تھا۔ مستقیم کو تو یہ بھی یاد نہیں تھا۔ ان آنکھوں کتنے مہینوں یا پھر کتنے سالوں بعد دیکھ رہا تھا۔

''شرم نہیں آتی تمہیں؟ یہاں یہ سب کرتے پھرتے ہو تم؟''

انہوں نے اس کی کلائی بہت سختی سے پکڑ کر بہت زور کا جھٹکا دیا۔ وہ سہم گیا۔ اس کا باپ بہت افسر تھا مگر اس نے ہمیشہ انہیں غصے میں ہی دیکھا تھا۔ وہ بہت کم گھر آتے۔ جب بھی آتے کسی نہ کسی بات پر دھاڑنے لگتے۔ اس کی امی بھی دہل جاتی اور اس کے باپ کے آگے پیچھے بدحواس پھرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکا کرتا مگر اس کا باپ راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے کے بل کبھی کم نہ ہوتے تھے۔ وہ اس کی ماں پر ہاتھ اٹھاتا تو موجو سانس لینا بھی بھول جاتا۔

''گھر چلو...... پوچھتا ہوں میں تمہاری ماں اور اس کی ماں سے...... یہ تربیت ہو رہی ہے تمہاری؟''

اسے یونہی بختی سے دبوچے وہ گھر تک آئے۔ راستے میں دروازے کے آگے کھڑی امی نے اپنے باپ کی چمکتی گاڑی بھی دیکھی تھی۔ اس کی نانی کے گھر کا لکڑی کا سال خوردہ دروازہ انہوں نے اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کھولا۔ چولہے کے آگے پھونکنی سے آگ دہکاتی اس کی ماں دہل کر جو شوہر کو کوتوال کے روپ میں روبرو پا کے ہمیشہ کی طرح اس کا دم اٹکنے لگا تھا۔

پھر ابو بہت دیر تک چنگھاڑتے رہے۔ چیختے اور اس کی ماں کو نانی سمیت سخت سست سناتے رہے۔ اور اسی غضب میں فی الفور انہیں ساتھ لے جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ جتنا ہراساں ہو رہا تھا اس کی ماں اور نانی اتنی ہی خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ نانی نے لپک جھپک اسے پکڑ کر نہلایا اور بہت والے اچھے کپڑے پہنائے اور بس اسی پہ اکتفا نہ کیا۔ بالوں کو خوشبو دار تیل لگانے کے ساتھ اس کی گردن اور بغلوں کو ٹالکم پاؤڈر سے بالکل سفید کر دیا۔ اس کا سنگھار مکمل کر کے انہوں نے اسے پٹ چٹ چوما۔ ان کے خیال میں ان کا نواسہ اب شہزادہ لگنے لگا تھا مگر اسے دیکھتے ہی نانی کے نک چڑھے مزاج داماد کا پارہ پھر آسمان کو چھونے لگا۔ کچھ باتیں سنانے کے بعد انہوں نے اسے پھر سے نہلانے کا حکم جاری کیا۔ نانی دل مسوس کر رہ گئیں۔ جبکہ ان کے اونچے مزاجوں والے داماد صاحب کتنی دیر تک بھی بڑبڑاتے رہے۔

"احمق جاہل عورتیں! پتہ نہیں کہاں پھنس گیا ہوں۔ اتنا بھی نہیں پتا تیل نہانے کے بعد نہیں پہلے لگایا جاتا ہے۔"

وہ کتنی دیر کلستے رہے۔ اور موجو...... اس کا خون خشک اور پتہ پانی ہوتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

پھر سب کچھ بدل گیا۔ اس کا ماحول، اس کا گھر، اس کا اسکول بھی، پہلے وہ شلوار قمیص پہنے کپڑے کے تھیلے میں کتابیں ڈال کر گلے میں لٹکا کر سکول جاتا تھا۔ ہاتھ میں تختی گھماتا ہوا۔ اب نیکر شرٹ میں ملبوس رنگین بیگ کاندھوں پر لٹکا کر اپنے باپ کی شاندار گاڑی میں انگلش میڈیم سکول جانے لگا۔ وہ خوش تھا۔ مطمئن بھی۔ ہر طرح کے زندگی میں مزے تھے۔ بس اس کی جان ابو سے نکلتی تھی۔

اس کی ماں اس کے جتنے لاڈ اٹھاتی تھی۔ ابو اسی قدر کھینچ کر رکھتے۔ سب کچھ بدل جانے کے باوجود کچھ تبدیل نہیں ہو سکا تھا تو وہ اس کے مزاج کا بھولپن اور حماقت کی حد تک سادگی تھی۔ وہ بھی بہت آسانی سے بے وقوف بن جاتا تھا۔ اسے آج بھی بہت آرام سے دھوکا دیا جا سکتا تھا۔ شرارت یا غلطی کسی اور کی ہوتی کہیں اس پر ڈال کر پکڑوا اسے دیا جاتا۔ اسی سادگی اور بھولپن

سے وہ بدھو کے نام سے مشہور ہونے لگا۔ بچپن سے اتنی بار اسے ہاتھ لگے تھے مگر اس کی فطری سادگی جوں کی توں تھی تو اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اسے کوئی بڑا دھوکہ بڑی ٹھوکر ابھی کھانا تھی۔

☆......☆......☆

"خلیفہ صاحب کدھر جا رہے ہیں؟"

جمعے کا دن تھا۔ وہ نہائے دھوئے سفید کرتا شلوار پہنے نکھرا ستھرا صحن میں پھر رہا تھا۔ کہ کچھ دیر میں ابو نے آ کر اپنے ساتھ اسے جمعہ کی نماز کے لیے مسجد لے جانا تھا۔ جب ہمسائے کی دیوار سے سعدیہ کا سر برآمد ہوا۔ اسے چھیڑنا وہ گویا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

"بھئی واہ...... بڑا لشک رہے ہو۔"

وہ اس کا مذاق اڑانے لگی۔ مستقیم نے خائف سی نظروں سے اسے دیکھا اور رخ پھیر کر اپنی کتاب کھول لی۔ ابو کے آنے کا ٹائم تھا۔ وہ سعدیہ کو اس سے بات کرتا دیکھ لیتے تو اس کی خیر نہیں تھی۔ خوامخواہ بھی شک کرنے کی عادت تھی ان کی۔

"اونہہ...... بڑے پڑھاکو ہو ناں۔ جیسے بڑے ہو کر ڈی سی ہی لگ جاؤ گے۔ ہاہاہا......"

وہ کلسی تھی۔ پھر امی کو زور سے پکارنے لگی۔

"خالہ...... سبز مرچیں ہیں تو دینا۔ امی مانگ رہی ہیں۔"

امی کچن میں تھیں۔ اس پکار پہ سبزی کی ٹوکری اٹھاتے باہر آ گئیں۔

"ہیں تو سہی بیٹا! ادھر سے آ کے لے جاؤ۔ میں نکال دیتی ہوں۔"

انہوں نے اپنے مخصوص نرم خو انداز میں جواب دیا تھا۔ اس جواب پہ سعدیہ کے چہرے پہ اطمینان اترا اگلے لمحے اس کا سر دیوار سے غائب ہو چکا تھا۔ دوبارہ کچن کی جانب مڑتیں امی برآمدے کی میز پر رکھے کینوؤں کی ٹوکری پر نگاہ پڑتے تھم سی گئیں۔

"یہ مالٹے تو کھا لیتے بیٹے اکل سے پیچھے لگی ہوں تمہارے۔"

کھانے پینے کے معاملے میں اس کی یہ لاپرواہی امی کو بالکل پسند نہیں تھی۔ انہوں نے ٹوکری اٹھا کر اس کے سامنے رکھی۔ ساتھ میں خالی پلیٹ چھری اور ایک ننھی سی شیشے کی کٹوری میں کالی مرچ ملا نمک تھا۔ وہ فرمانبرداری سے کتاب بند کر کے مالٹے چھیلنے لگا۔ تب ہی بیرونی دروازہ کھول کر سعدیہ اندر آ گئی۔

"واہ جی! اکیلے ہی مزے اڑا رہے ہو۔ کبھی کسی اور کو بھی صلاح مار لیا کرو۔"

اس نے اس کا چھیلا ہوا مالٹا اچکا اور کھاتے ہوئے اسے لتاڑنا ضروری سمجھا تھا۔ مستقیم کہیں
یہ بے تکلفی ایک آنکھ نہیں بھائی مگر کبھی جتلایا نہیں تھا۔ اس وقت بھی سر جھکائے اپنے کام میں مصروف
رہا تھا۔

"خالہ! اسے تھوڑا سا مرد بنائیں۔ کیسی زنانیوں والی عادتیں ہیں۔ نظریں جھکائے ہروقت گر
چپل گھسیٹتا پھرتا رہتا ہے۔ اس بیچارے کو پتہ ہی نہیں دنیا میں کیسی کیسی خوبصورتیاں بھری پڑی ہیں۔"
امی کی آمد سے ان کے ہاتھ سے ہری مرچوں کا لفافہ پکڑتی وہ منہ سے "ہچر" کرکے بیچ
صاف ستھرے چمکتے فرش پر گراتی لٹھ مار انداز میں بولی تھی۔ مستقیم کا چہرا جانے کس احساس کے
سرخ پڑ گیا۔ وہ مستقیم سے صرف ایک سال بڑی تھی۔ مگر بلا کی تیز طرار چلتی پرزہ تھی۔ وہ چاہتی
اسے پسند کرتی ہے۔ اس پر ڈورے ڈالتی جب ناکام ہوئی تھی اس طرح سے بات بے بات
شروع کر دیا تھا۔ مستقیم کا قد کاٹھ باپ پر پڑا تھا۔ وہ پندرہ سال کی عمر میں چھ فٹ سے زیادہ
چکا تھا۔ بھرا بھرا مضبوط جسم خوبرو چہرا اسے اپنی عمر سے دس سال آگے لے جا کر دکھاتا تھا۔ وہ
باپ کی جوانی کی تصویر تھا۔

"بچہ ہے نا ابھی۔ بڑا ہوگا تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔"
امی نے رسان سے جواب دیا تھا۔ مگر لہراتی دوپٹے کے پلو کو انگلی سے لپیٹتی کنکھیوں سے
تکتی سعدیہ کو امی کی یہ بات ہنٹر بن کر لگی تھی۔

"بچہ......"

وہ ڈرامائی انداز میں چیخی۔ پھر بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

"خالہ تو بھی بھولی ہی رہی۔ کتوں کا پورا ہے تیرا یہ چھنگا۔ لائن مارتا ہے مجھ پہ۔ وہ تو
بات کر جو لفٹ نہیں کراتی۔ ارے شادی تو ہو جانی ہوتی ہے۔ ہم کیوں ایسے ویسوں سے
کریں۔"

وہ بہک کر کہہ رہی تھی۔ آنکھیں کیسے مٹکتی تھیں۔ مستقیم تو صرف ششدر نہیں ہوا
پتھرا بھی گیا تھا۔ امی نے سعدیہ کو کیا کہا وہ اس صدماتی کیفیت کے باعث سننے سے قاصر
جیسے یقین نہ آتا تھا کوئی لڑکی اتنا بھی گر سکتی ہے۔

"امی...... یہ...... یہ جھوٹی ہے۔ محض بکواس کرتی ہے۔ م...... میں......"
شدت غیض اور غم نے اس کا گلا ہی نہیں آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر دی تھیں۔ امی

کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے گلے سے لگا کر پیار سے تھپکا۔

"کیوں فکر کرتا ہے میرے چاند! میں سب جانتی ہوں۔ تجھے بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔" وہ
اس کی بھیگی آنکھیں چوم رہی تھیں۔

"قسم سے امی......"

"مستقیم بیٹا ماں کو وضاحتیں کیوں دیتے ہو؟ پیٹ کا جنا ہے تو میرا۔ جانتی نہیں ہوں بھلا تجھے؟"
انہوں نے پھر سے خود سے بھینچ لیا۔ مستقیم کے اندر انوکھا سکون انوکھی سرشاری سرائیت کر گئی
تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا اور سمجھتا تھا دنیا جتنی بھی ظالم اور بے باک کیوں نہ ہو۔ اس کا کچھ نہیں بگاڑ
سکتا۔ اس کے پاس اس کی ماں تھی۔ وہ ہر لحاظ سے محفوظ و مامون رہے گا۔ مگر سب ہمیشہ ویسا ہی تو
نہیں ہوتا جو ہم سوچتے ہیں۔ دنیا نے اسے ڈس لیا تھا۔ اس کی ماں کی موجودگی کے باوجود۔ بلکہ اس
سارے نقصان میں اس کی ماں کا بھی حصہ نکل آیا تھا۔ جو اس کی جھولی میں آ کر گرے تھے۔

☆......☆......☆

وہ سکول سے کالج میں آیا تو اس کا قد سوا چھ فٹ سے بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ اس کی گندمی رنگت
اور بڑی بڑی سحر طراز آنکھوں میں کچھ تو ایسا تھا کہ لڑکیاں دیوانہ وار اس کی جانب کھنچتی تھیں۔ لیکن وہ
کسی کو بھی ویلکم نہ کہہ سکا کہ اس پر تو ہروقت ہی ابو کا ہوا سوار رہتا تھا۔ جب ہی ابو کی پیٹھ پیچھے بھی کسی
لڑکی کے نزدیک پھٹکنا گوارا نہ کرتا۔ بلکہ اس نے تو دبے لفظوں میں امی سے کہا بھی تھا۔

"مجھے کو ایجوکیشن میں نہیں پڑھنا۔ آپ ابو سے کہیں نا مجھے بوائز کالج میں بھیج دیں۔"
امی نے سنا تو افسردگی سے مسکرانے لگی تھیں۔

"کیا حرج ہے بھلا بیٹے! مقصد تو تعلیم حاصل کرنا ہی ہے نا۔ تمہارے ابو میری کہاں سنیں
گے۔" اور اسے خاموش ہو جانا پڑا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اس کی ماں سالہا سال گزر جانے کے باوجود اس
کے باپ کے دل میں ذرا سی بھی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ اس کے باپ کی خالہ زاد
تھیں۔ اور اس کے باپ کی نہیں دادی کی پسند تھیں۔ اس کا باپ عبدالماجد شاید کسی اپنے جیسی حسین
طرحدار عورت کو پسند کرتا تھا۔ جب ہی اس کی ماں کو اس نے نہ کبھی عزت سے نوازا نہ ہی محبت کے
قابل سمجھا۔ جب بھی مخاطب کیا طنز حقارت اور نخوت سے۔ ایک جھگڑا ہوتا اور اس کی ماں کئی کئی مہینوں
تک نانی کے گھر بھیج دی جاتی۔

اس ادھر ادھر کے چکروں میں اس کی تعلیم کا اتنا حرج ہو رہا تھا۔ چنانچہ نانی نے اس کا بھلا سوچا

اور اس کا مستقل داخلہ گاؤں کے ہی سکول میں کروا دیا۔ ابو نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ شاید انہیں بیوی
کے ساتھ بیٹے سے بھی کسی قسم کی انسیت پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ مگر ان کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے ایک
بار ان کی بہن نے انہیں ضرور سمجھایا تھا۔ وہ نہ صرف پڑھی لکھی تھیں بلکہ عمر میں عبدالماجد سے بڑی بھی
تھیں۔

"تم نے اپنی زندگی کا کیا فیصلہ کیا ہے عبدل ماجد!"

اور ان کے سوال پہ وہ سخت مایوسی کے عالم میں انہیں تکتے سرد آہ بھر کے رہ گئے۔

"مجھے بھلا اب کیا فیصلہ کرنا ہے آپا! فیصلہ تو اماں کر چکی تھیں برسوں قبل۔"

ان کا لہجہ بجھا ہوا بے دلی کا غماز تھا۔

"مگر اماں تو کب کی وفات پا چکیں عبدل ماجد! مگر مت بھولو کہ تم نے تب زبردستی سہی مگر ان کا
فیصلہ تسلیم کیا تھا۔ پھر اب بیوی بچے کو کیوں سزا دے رہے ہو؟"

سوال کڑا تھا اور وہ برداشت نہ کرنے کے عادی۔ جبھی حسب عادت چیخنے اور پھنکارنے لگے۔

"سزا تو میں کاٹ رہا ہوں۔ ایسی جاہل عورت پلے باندھی ہے میرے۔"

"سعیدہ ان پڑھ ضرور ہے عبدلماجد! مگر سمجھدار عورت ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر تمہارے بچے
کی ماں ہے۔ کس ماحول میں لاوارثوں کی طرح چھوڑا ہوا ہے تم نے اپنے بیٹے کو؟ جانا ہوا تھا میرا۔
یقین کرو مستقیم کو دیکھ کر میں تو اسے پہچان بھی نہیں سکی۔ بہت دکھ ہو رہا ہے مجھے یہ کہتے ہوئے کہ
تمہارا بیٹا تو کہیں سے لگتا ہی نہیں ہے۔ پوری طرح اسی ماحول میں رچ بس گیا ہے۔ وہ بہرحال
تمہاری ہی اولاد ہے عبدالماجد! تمہیں اس بات کا تو خیال کرنا چاہیے۔ پڑھے لکھے ہو کر بھی تمہیں
اس بات کی سمجھ نہیں کہ ماں باپ کی لڑائی سے بچوں پر کتنے غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی
شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جایا کرتی ہے۔

ایسے بچے جن کو والدین کی طرف سے سپورٹ حاصل نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنی بقا کی جنگ کے
لیے ہر صحیح اور غلط راہ اپنی زندگی میں اپلائی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ دبو بھی ہو سکتے ہیں اور
معاشرے کے کرپٹ انسان بھی۔ تمہارا بچہ ابھی چھوٹا ہے مگر اتنا بھی چھوٹا نہیں کہ رویے اس پر اثر
انداز نہ ہوتے ہوں۔ وہ پیار اور نفرت کو ... جلدی مارک کرتا ہوگا۔

اگر خدانخواستہ حالات ایسے ہی رہے تو وہ اپنی عمر سے بہت پہلے کم سنی کو چھلانگ جائے گا۔
ایسے بچے جو کم سنی سے یکدم عمر رسیدگی میں چلے جائیں۔ ان کی زندگی میں اگر سب کچھ ہو

ان کی ذات سے بے رنگی اور تلخی ختم نہیں ہوتی۔
آگیا! ین، غیر محفوظ ہونے کا احساس انہیں دل سے جینے نہیں دیتا اور آئی ایم شیور عبدالماجد کہ تم
اپنے بیٹے کے لیے ہرگز ہرگز ایسا نہیں چاہو گے۔"

ان کی بہن ان کی سوچ کا در وا کر گئی تھی اور وہ مستقبل کے آئینے میں مستقیم کو دیکھ کر واقعی لرز
اٹھے۔ جو بھی تھا۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ گویا ان کا سب کچھ وہی تھا۔ اسی باعث وہ جا کر بیوی اور
بچے کو گاؤں سے لے آئے۔ مگر ایسا کرتے ہوئے وہ یہ یکسر بھول گئے تھے کہ بیٹے کی شخصیت کو مضبوط
بنانے کے لیے انہیں اپنی روش، اپنا انداز بھی بدلنا چاہیے۔ اور انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ ان کا بیٹا اگر کرپٹ
انسان نہیں بھی بنا تھا تو دبو ضرور رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ تھرڈ ایئر میں تھا جب اس کی ایک کلاس فیلو ثمرینہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔ اس کی سمجھ
میں قطعی نہیں آتا تھا کہ ثمرینہ نے اس میں ایسا آخر کیا دیکھ لیا تھا جو اس طرح مقناطیسی کشش کے زیر اثر
اس کی جانب لپکی تھی۔ وہ جتنا بدکتا ثمرینہ اسی قدر اس میں انوالو ہو رہی تھی۔

"مجھ سے دوستی کر لو شائی بوائے۔"

وہ کلاس سے نکلا تو کینٹین میں آ گیا۔ ابھی کرسی کھینچ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی راہ میں جانے کب
سے آنکھیں بچھائے بیٹھی ثمرینہ اس کے پیچھے چلی آئی اور بنا اجازت اس کی ساتھ کی کرسی گھسیٹ کر
بیٹھ گئی۔ اس پر جھک کر جس بے باکی سے آنکھ دبا کر بولی تھی وہ انداز مستقیم کو بوکھلا کر رکھ گیا۔

ٹائٹ جینز پر وہ سفید چکن کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے تھی۔ جس کے گریبان کے اتنے بٹن کھلے
تھے کہ بھولی بھٹکی بھی نگاہ اٹھا کر مستقیم کے اوسان خطا ہونے لگے۔ ثمرینہ کا باپ مل اونر تھا۔ وہ اکلوتی
لاڈلی بگڑی اولاد تھی۔ جو کپڑوں کی طرح گاڑیاں بدلنے کی عادی تھی۔ کالج کے سارے لڑکے اس
کے دیوانے تھے جبکہ وہ مستقیم پہ مرتی تھی۔

"کچھ بولو ناں..... تمہاری آواز بھی تمہاری طرح فیسی نیٹنگ ہے، رنگیلی۔"

وہ بے باکی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی تھی۔ مستقیم کرسی پر یوں اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا
ہو۔ کتنا عاجز اور شپٹایا ہوا لگ رہا تھا۔ جوان لڑکا ہونے کے باوجود۔ ثمرینہ کو ہنسی آنے لگی۔

"پلیز مجھے کسی بھی لڑکی سے دوستی نہیں کرنی۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں؟"

وہ کس قدر عاجز ہو کر کہہ رہا تھا۔ اور ثمرینہ اپنا قہقہہ بھی دبا نہیں سکی تھی۔ اسی بلند مردانہ وار قہقہے

نے خلیفہ مستقیم کو کتنا نروس کر ڈالا تھا۔

"کم آن یار! کیسی دقیانوسی باتیں کر رہے ہو تم؟ کو ایجوکیشن میں پڑھ رہے ہو تم۔" وہ جیسے
سمجھا رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اسے بے حیائی، بے باکی کا سبق پڑھا کر اپنی لائن پر لا رہی تھی
مگر مستقیم کے اندر کا خوف، تربیت کا اثر بہت گہرا تھا۔ جبھی بہت صفائی سے ہر بات سے صرف نظر
کرتے ہوئے اٹھا۔

"میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے۔ چلتا ہوں۔"

وہ جان چھڑا کر بھاگا مگر کب تک۔ ثمرینہ جان چھوڑنے والی ہی تو نہیں تھی۔ جبھی اگلے
پھر اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔

"سنو مستقیم! اپنا سیل نمبر تو دو یار مجھے۔ کبھی کام ہی پڑ جاتا ہے۔"

وہ اس میدان کی ماہر کھلاڑی تھی۔ گیم کھیلنے اور جیتنے کے بہت سے طریقے ازبر تھے اسے۔

"مگر میرے پاس تو موبائل نہیں ہے۔"

مستقیم نے گو کہ جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مگر ثمرینہ کو پھر بھی یقین نہیں آتا تھا اور مستقیم جو
سوچ رہا تھا امی کے ذریعے ابو سے سیل فون کی فرمائش کرے گا۔ ارادہ تبدیل کر دیا۔

"مجھے نمبر نہیں دینا چاہتے ہو نا اس لیے۔"

ثمرینہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اور مستقیم کو بڑی مشکل سے اسے یقین دلانا پڑا تھا کہ
بات نہیں۔ وہ پتہ نہیں کس حد تک کامیاب ہوا مگر یہ معاملہ بہرحال نپٹا نہیں سکا تھا۔

"یہ لو۔ پلیز اب انکار مت کر دینا۔ تمہاری بجائے میں کسی اور کو دیتی نا تو باچھیں کھل جاتیں
ی۔ مگر تم دنیا کے اک ہی نمونے ہو۔"

دو دن بھی سکون سے نہیں گزرے تھے۔ جب ثمرینہ اسے خوبصورت پیکنگ میں
فون بطور گفٹ اسے دینے پر کمربستہ ہو گئی تھی۔ مستقیم تو ٹپٹا گیا تھا۔ اسے ہرگز سمجھ نہیں آئی تھی
گلے پڑی بلا سے کیسے جان چھڑائے۔

"آئی ایم ساری! دیکھو ثمرینہ! میں یہ نہیں رکھ سکتا۔ گھر سے پرمیشن نہیں ہے نا۔ ابو کو
تو بہت ڈانٹیں گے۔"

وہ بیچارگی سے بولا تھا۔ ثمرینہ اسے بے دریغ گھورنے لگی۔

"اچھا بس...... اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ اتنے ہی جتنے تم ننھے بچے ہو ناں کہ

ہے علم میں آ جائے گی۔ چیک کر لینا نا یار! باتیں کریں گے رات کو چپکے چپکے۔ کال میں کروں گی فکر نہ
کرو۔ بلکہ کریڈٹ بھی تمہیں ڈلوا دیا کروں گی۔ اب رکھ بھی لو۔"

وہ آنکھ مارتی ہوئی پھر اسے اپنی ڈگر پہ کھینچ رہی تھی۔ مستقیم نے اسے گھورتے ہوئے شد و مد سے
سر نفی میں ہلایا اور بے حد سختی سے گویا ہوا تھا۔

"محترمہ ثمرینہ بٹ! میں معذرت خواہ ہوں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور
سنیں آئندہ مجھے اس قسم کی آفرز بھی نہیں کیجیے گا۔ شکریہ۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ مضبوط قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر ثمرینہ کو اس کی اس اپنے دفاع
میں کی گئی بات میں سراسر اپنی توہین اور سبکی محسوس ہوئی تھی۔ جبھی وہ بہت شعلہ بار نظروں سے اسے تب
تک دیکھتی رہی تھی۔ جب تک وہ نظر آتا رہا۔ کوئی نہیں جانتا تھا وہ اس توہین کا بدلہ کیسے لینے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

ابو نے اسے ایف اے کا ایگزیم کلیئر کرنے پر کالج آنے جانے کے لیے بائیک لے کر دی تھی۔
جو آج کل مسئلہ کرنے لگی تھی پتہ نہیں کیوں۔ چھٹی کے بعد وہ بائیک اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں پسینے
پسینے ہو رہا تھا۔ جبھی نسوانی ہنسی کی جھنکار پر چونکا اور ثمرینہ کو روبرو پا کے خفیف بھی ہو گیا۔ ایسے بڑے
اور معروف تعلیمی ادارے میں دو سال پرانی بائیک وہ بھی ایسی جو اسٹارٹ ہونے میں گھنٹہ بھر لگاتی ہو
یہاں مذاق کا ہی باعث بن سکتی تھی کہ یہاں تو سب ایک سے بڑھ کر ایک مالدار گھرانے سے تعلق والا
ہی آتا تھا۔

"یہ اسٹارٹ نہیں ہو گی ہینڈسم! میرے ساتھ آ جاؤ۔ کر دوں گی ایمانداری سے ڈراپ۔"

وہ پرکشش آفر کر رہی تھی جو ظاہر ہے مستقیم کو قبول نہیں تھی۔ جبھی دھیان دیے بنا اپنے کام میں
مگن رہا اور بالآخر کامیاب بھی ہوا تھا۔ وہ زن سے اس کے قریب سے بائیک لے اڑا۔ وہ کینہ توز
نظروں سے اڑتی دھول تکتی رہ گئی۔

"کب تک بچو گے آخر خلیفہ مستقیم!"

نئے سرے سے ہونے والی تذلیل نے اسے تلملا کے رکھ دیا تھا اور اسے یہ موقع مل بھی جلدی
گیا تھا۔ یہ اس سے ٹھیک ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ جب عین رم جھم برستے موسم میں ثمرینہ نے جان
بوجھ کر اپنی گاڑی کا ٹائر پنکچر کیا اور چہرے پر پریشانی کے آثار لیے اس کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔ یہ
سارا کارنامہ اس نے مستقیم کو گھیرنے کو انجام دیا تھا کہ جانتی تھی وہ کالج لائبریری میں نوٹس بنانے میں

مصروف موسم کی خرابی کے باعث کالج کے جلدی آف ہو جانے سے بے خبر ہے۔ جب تک وہ آگے
ہوا اور اپنی کتابیں سمیٹتا باہر آیا کالج سارا خالی اور ثمرینہ اپنا جال پھیلائے اس کی منتظر تھی وہ تھکے تھکے
قدموں سے چلتا بارش کے پانی کو جھاڑتا بائیک کے پاس آیا تو ثمرینہ نے بڑی عاجز اور بے بس
نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"مستقیم میری گاڑی خراب ہو چکی ہے۔ میں جانتی ہوں تم مجھے پسند نہیں کرتے مگر اس برے
موسم میں اخلاقی طور پر تو مدد کر سکتے ہو نا میری۔"

وہ کتنی ملتجی ہو کر کہہ رہی تھی۔ مستقیم چونکا۔

"سوری..... میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔"

وہ اتنا ہی محتاط تھا کہ مدد کرنے پر بھی آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ جانتا تھا اگر کسی جاننے والے نے بھی
اس کے ساتھ کسی لڑکی کو بیٹھے دیکھ لیا تو ابو اس کا سر گنجا کر دیں گے جوتے مار مار کر۔ ثمرینہ کو اس بے
رکھائی کے مظاہرے نے گویا آگ لگا دی مگر بظاہر سکون اور نرمی سے اصرار جاری رکھا۔

"تم صرف مجھے مال تک چھوڑ دینا۔ وہاں سے میں رکشہ یا ٹیکسی خود کر لوں گی۔ پلیز....."

اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی ثمرینہ اچک کر اس کے ساتھ بائیک پر سوار ہو گئی۔ مستقیم بری
طرح جز بز ہوا تھا۔

"دیکھو..... تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ ڈبل سواری پر پابندی ہے۔ میرا چالان ہو سکتا ہے۔"

"اتنا کیوں ڈرتے ہو تم؟ چلو تو..... اگر کچھ ہوا تو میں خود بھگت لوں گی۔ ڈونٹ وری۔"

وہ بے فکرے پن سے بولی۔ اب مستقیم کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا سوائے بائیک اسٹارٹ
کرنے کے مگر بہت جلد اسے اندازہ ہوا وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ ثمرینہ شاطر تھی۔ اور راہ سے بھٹکی
ہوئی بھی۔ ایسے لوگ اپنا مقصد حاصل کرنے کو گناہ و ثواب میں فرق بھلائے رکھتے ہیں۔ مستقیم اس کا
پسند تھا جو ہر کوشش کر لینے کے باوجود حاصل نہیں ہوا تھا۔ آج ہاتھ لگا تھا۔ وہ دل کے جانے کون کون
سے ارمان نکال لینا چاہتی تھی۔ پہلے اس کا ہاتھ مستقیم کے کاندھے پہ ٹکا پھر سرکتا ہوا ہاتھ اور بازو اس
کے گرد حمائل ہو گئے۔ درمیانی فاصلہ سمٹا تھا اور وہ بھری ہوئی شاہراہ پر اس کے ساتھ چپکی جاتی تھی
حالانکہ اس کی ہر فضول جنبش اور حرکت پہ مستقیم اسے ڈانٹتا اور انسانیت کے ساتھ شرافت کے جامے
میں آنے کو غصے سے بولتا رہا۔ مگر وہ کہاں سن رہی تھی اس کی۔ مستقیم کے ضبط کی انتہا ہوئی تو جھٹکے سے
بائیک روک دی۔

اب یہ اس کی قسمت کا چکر تھا کہ ثمرینہ کو دھتکارتے اور جھگڑتے اسے کچھ فاصلے پر ٹریفک
پولیس کانسٹیبل کی موجودگی کا احساس نہ ہو سکا تھا۔ ثمرینہ کے ایک اشارے پر پولیس والا چراغ کے
جن کی طرح حاضر ہوا تھا۔ پھر صورتحال بدلتے دیر نہیں لگی۔ وہ تو ثمرینہ کا رنگ ڈھنگ دیکھتا ہی
ششدر ہونے لگا تھا اپنی صفائی میں کیا بولتا۔ جو اس پر الزام رکھ رہی تھی کہ وہ اسے بہکا کر ساتھ لے
جا رہا ہے۔ رائی کا پہاڑ کیسے بنتا ہے یا عورت کیسے اپنے فریب سے کسی کو پھانستی ہے یہ اس وقت خلیفہ
مستقیم کو پتہ چلا تھا جب پولیس نے اس سے بائیک کی چابی چھینی اور اسے گردن سے پکڑ کر پولیس
موبائل میں پھینکا وہ چکرایا ہوا تو تھا ہی دن میں تارے بھی نظر آنے لگے۔

☆......☆......☆

وہ شرمندگی کی اتھاہ میں جا گرا تھا۔ جیسے ابو ہی اسے حوالات سے چھڑا کر لائے تھے۔ انہوں
نے سچ مچ تو جوتے نہیں مارے مگر جو سنائی تھیں وہ جوتوں سے زیادہ ذلت آمیز احساس سے دو چار
کرنے والی تھیں۔ وہ اس کی پڑھائی چھڑا دینے کے درپے ہو گئے تھے۔ اس کے بائیک چلانے پہ
پابندی عائد کر دی۔ اسے صفائی اور وضاحت کا کوئی موقع دیئے بغیر انہوں نے آنکھیں بند کر کے اس
پہ یقین کیا تھا جو وہاں سے رپورٹ سننے کو ملی تھی اور جس کا حرف حرف جھوٹ پر مبنی تھا۔ پھر یہ امی کی
منت سماجت ہی تھی کہ اس کو کالج پھر سے جانے کی اجازت مل گئی۔ البتہ بائیک کو ہاتھ لگانے کی انہوں
نے پرمیشن نہیں دی تھی۔

"خبردار..... نام مت لینا اس لوفر کے لیے بائیک کا۔ نام ڈبوئے گا یہ ہمارے پرکھوں کا بھی۔ دیکھ لینا۔"

وہ پورے دعوے پورے یقین سے کہتے۔ وہ کڑھ کر رہ جاتا۔ کالج میں بھی اب بسوں کے
دھکے کھانا پڑتا تھا۔ جس سے اکثر اسے واپسی میں دیر ہو جاتی کہ آئے دن کی ٹریفک ہڑتالوں کے
باعث اسے انت کی خواری سہنی پڑتی۔ شام کو تھکا ہارا گھر لوٹتا تو ابو اس سے پہلے گھر آ چکے ہوتے اور
امی اس کے لیے پریشان پھرتیں بار بار دروازے سے جھانکا کرتیں۔

"لو آ گیا اشتہاریا۔ کارنامے انجام دے کر۔"

وہ اس کی شکل دیکھتے ہی اب اس قسم کے فرمودات سنایا کرتے۔ اک بار کا جیل جانا چاہے وہ
بے گناہی سہی مگر اسے اشتہاریئے کا ٹائٹل چسپاں کر گیا تھا۔ ابو کو تو وہ کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ البتہ
ثمرینہ کے لیے اس کے دل میں موجود نفرت دن بدن فروزاں ہوتی جا رہی تھی جس کی بدولت وہ ایسے
سب کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر گیا تھا جس میں دوبارہ پہلا مقام حاصل کرنا مشکل ہی نہیں

ناممکن بھی تھا۔ جبھی اس کا رویہ کالج میں ثمرینہ کے لیے مزید سختی، مزید جنگ سمیت لایا تھا۔

☆......☆......☆

اس روز وہ اس لیے بھی لیٹ گھر پہنچا تھا کہ اسے لائبریری سے کچھ کتابیں ایشو کروانی تھیں۔ جبکہ امی کو کسی شادی میں شریک ہونا تھا۔ اسے خصوصی تاکید کی تھی جلدی آنے کی مگر وہ سرے سے بھو چکا تھا۔ مقررہ وقت سے دو گھنٹے لیٹ گھر پہنچا تو امی بیتابی سے منتظر تھیں۔

"تم فریش ہو کر کھانا کھا لو بیٹے! پھر جیولر سے میری چوڑیاں لا دینا۔ آپا کے صبح سے دو فون آ چکے ہیں لیکن میں جاتی کیسے چوڑیوں کے بغیر۔"

اور وہ جی بھر کے شرمسار ہونے لگا۔

"آپ رسید لائیں۔ میں پہلے چوڑیاں لاتا ہوں۔ کھانا آ کے کھا لوں گا۔"

وہ بیگ اتار کے رکھتے ہوئے مستعد ہوا۔ مگر امی نے ٹوک دیا تھا۔

"ایسی بھی جلدی نہیں ہے بیٹے! تم کپڑے بدل کے کھانا کھا لو۔ پھر جانا۔"

مستقیم نے سر ہلا دیا۔ وہ کپڑے بدل کر آیا تو سعدیہ موجود تھی۔ اسے بڑی خصوصی نظروں سے گھو اور ذومعنی فقرے اچھالتی رہی۔ مستقیم کے پاس اس کی ساری بے باکیوں کا ایک ہی حل تھا۔ خاموشی او نظر اندازی وہ کچھ دیر قہقہے لگاتی اور اسے متوجہ کرنے کے جتن کرتی رہی پھر تھک ہار کے چلی گئی۔

"بچوں کی تربیت ماؤں کی ذمہ داری ہوتی ہے اور آج کل کی ماؤں کو فرصت ہی کہاں ہے جب دیکھو یہ لڑکی فضول میں ٹھٹے لگا رہی ہوتی ہے۔ ہی ہی۔ ٹھی ٹھی۔ نان سنس اور سنو تم ذرا اس کی موجودگی میں اِدھر اُدھر ہو جایا کرو۔ یہ گھر ہے میرا میں اسے 'لواسپاٹ' نہیں بنانا چاہتا۔"

ابو نہا کر آ گئے تھے۔ اور رواں تبصرہ جاری تھا۔ مگر جب مستقیم کو بھی خوامخواہ گھسیٹا تو وہ جھنا بلبلایا مگر سر اونچا نہیں کر سکا۔ امی کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد لوٹیں دونوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہی اٹھ کر ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ کرسی کھینچ چپ چاپ بیٹھ گیا مگر ابو کی تیوری سالن کے ڈونگے کا ڈھکن ہٹاتے ہی چڑھ گئی تھی۔

"یہ کیا پکایا ہے؟"

وہ خشمگیں نظروں سے امی کو گھور رہے تھے۔ جو لمحوں میں حواس باختہ نظر آنے لگیں۔

"آلو مٹر ہیں۔"

وہ منمنائیں۔ ان کی زرد رنگت کو تکتے مستقیم کو ان پر جی بھر کے ترس آنے لگا۔ وہ دل ک

میں اب بھی منصوبے بناتا تھا۔ انہیں ابو کے تسلط سے چھڑا کر دنیا بھر کے سکھ اور خوشیاں مہیا کرنے کے منصوبے جو وہ اپنے بچپن سے بنا رہا تھا۔ اب وہ سوچتا وہ کسی اچھی لڑکی سے شادی کرے گا جو اس کے گھر کو جنت کا ایک ٹکڑا بنا دے۔ پھر وہ اس جنت میں اپنی ماں کے ساتھ کتنی آزادی سے رہے گا اور ان پہ ابو کا سایہ بھی پڑنے نہیں دے گا۔ اسے ابو سے اتنی ہی بیزاری اور چڑ تھی۔

"لگتا ہے مٹر ڈالنا بھول گئی تھیں جاہل کم عقل عورت۔"

ان کی غراہٹ مستقیم کو خوابوں کی حسین نگری سے تلخ حقیقت میں واپس کھینچ لائی۔

"میں نے تو دونوں سبزیاں برابر کی ڈالی تھیں۔"

امی مدھم روہانسی آواز میں وضاحت دے رہی تھیں مگر پھر بھی قہر ٹوٹ پڑا تھا۔ انہوں نے طیش میں ڈونگا اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔

"ہاں برابر کی ڈالی تھیں۔ ایک آلو...... ایک مٹر۔ پاگل سمجھا ہوا ہے تم نے مجھے بدصورت بد زبان عورت! آگے سے بکواس کرتی ہے۔ اتنے سال ہو گئے تمہیں اس گھر میں آئے۔ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا۔ مجھے کیا پسند ہے۔ میں کیا کھانا چاہتا ہوں تو لعنت ہے تم پر۔"

ان کا بس نہ چلتا تھا وہ امی کو کچا چبا ڈالیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں اور ان کا موڈ بحال کرنے کے جتن میں مصروف تھیں۔ کبھی کچھ پیش کرتیں کبھی کچھ۔ ایسے میں مستقیم ٹیبل سے بھوکا اٹھ گیا اور اس کے ماں اور باپ دونوں لاعلم رہے تھے۔

☆......☆......☆

اور جب وہ رسید ہاتھ میں لیے شہر کے مشہور جیولر کی روشنیوں سے جگمگاتی دکان میں داخل ہو رہا تھا اس کے بالکل سامنے موجود ڈیپارٹمنٹل سٹور سے نکلتی ثمرینہ کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ جب وہ غیر محسوس انداز میں اس کے پیچھے آئی۔ تب تک تو محض مقصد اسے یونہی تنگ کرنا تھا مگر نہیں جانتی تھی اس کی نظر اندازی کا بدلہ چکانے کا اک اور سنہرا موقع بھی اسے میسر آ جائے گا۔ مستقیم نے شاپ کیپر کو رسید دکھا کر چوڑیوں کا تقاضا کیا تو اسے انتظار کرنے کا کہا گیا تھا۔ مستقیم بیٹھنے کی بجائے گھوم پھر کر شوکیسوں میں سجے خوبصورت اور چمکتے دمکتے زیورات کو سرسری نظر سے دیکھتا رہا۔ ثمرینہ بھی وہیں ایک جانب کھڑی جس سے بریسلٹ نکال کر دیکھنے میں مصروف تھی مگر درحقیقت اسی کی تاک میں تھی۔ مستقیم بے دھیانی میں چلتا ہوا جیسے ہی اس کے نزدیک آیا۔ اس نے ایک بریسلٹ اتنی صفائی سے سب کی نظر بچا کر اس کی جیکٹ کی جیب میں ڈالا کہ کسی اور کو تو کیا خود مستقیم کو بھی خبر نہیں ہو سکی تھی۔

صورتحال کی سنگینی سے بے خبر وہ اپنے آپ میں مگن اب جھک کر سرخ یاقوت سے مزین ...
کنگن مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔

"سوری...... مجھے کوئی ڈیزائن پسند نہیں آسکا۔ آپ یہ اٹھالیں۔ میں پھر کبھی دیکھ لوں گی۔"
وہ کاندھے جھٹک کر اکتائے ہوئے انداز میں کہتی سیلز مین سے مخاطب تھی۔ سیلز مین جو ...
جانب متوجہ تھا اس کی جانب آیا اور مخملیں کیس بند کرتے کرتے یکدم چوکنا ہو گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی میم! جسٹ اے منٹ پلیز! یہاں تشریف لائیے آپ۔"

"جی......"

ثمرینہ جو اسی قسم کی صورتحال کی منتظر تھی بلیوں اچھلتے دل کے ساتھ بظاہر حیرانی کی اداکاری
کرتی ہوئی پلٹی اور آنکھیں پھیلا کر سیلز مین کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر سختی کے تاثرات رقم تھے۔

"اس کیس میں سے ایک بریسلٹ کم ہے۔ حالانکہ ابھی جب میں نے آپ کو دکھائے تھے تو ..."
سیلز مین نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے مشکوک نظروں سے دیکھا مگر وہ آگ بگولہ ہو گئی۔

"تو کیا مطلب مسٹر! کیا کہنا چاہتے ہیں آپ کہ میں ...... میں چور ہوں؟"
وہ صحیح معنوں میں سیلز مین کے گلے پڑ گئی اور بھڑک کر بولی تھی۔ دکان کے مالک کے ساتھ ...
کسٹمر اور مستقیم بھی متوجہ ہو چکا تھا اس کی بلند آواز سے، البتہ ثمرینہ کو پہچان لینے کے باوجود اس ...
تاثرات سرد ہی رہے تھے۔

"سوری میم! میں ہرگز آپ کو بلیم نہیں کر رہا۔ مگر ہمیں آپ کی تلاشی تو لینا پڑے گی۔"
سیلز مین بے حد سبھاؤ سے مگر محتاط ہو کر بات کر رہا تھا۔ نقصان اس کی موجودگی میں ہوا ...
بریسلٹ لڑکی سے نہ ملنے کی صورت میں خمیازہ اسے بھگتنا پڑتا جبکہ وہ یہاں تنخواہ دار ملازم ...
ہونے والے بریسلٹ میں ڈائمنڈ جڑا ہوا تھا۔ اس کی تو نسلیں بھی قرض چکاتیں تو نہ اتر پاتا۔ ...
گھبراہٹ اور سراسیمگی اپنی جگہ درست تھی۔

"دیکھیے آپ میری توہین کر رہے ہیں مسٹر! میں ایک مہذب اور شریف شہری ہوں ...
اونر کی بیٹی! مجھے کیا ضرورت ہے ایسی گھٹیا حرکت کرنے کی؟ اور ویسے بھی آپ شک صرف مجھ پر ...
کر رہے ہیں؟ جبکہ آپ جانتے ہیں جب میں بریسلٹ پسند کر رہی تھی تو لڑکا بھی میرے ...
میں آ کر کھڑا ہوا تھا۔ چور یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ آپ اس کی بھی تلاشی لیں۔'
اس نے کتنی خوبصورتی، مہارت اور چالاکی سے صورتحال کو اپنے حق میں ایک بار پھر ...

دکان کے منیجر اور سیلز مین کے ساتھ وہاں موجود دیگر لوگ بھی تذبذب کا شکار ہو گئے۔ مستقیم تو ایک دم
چکرایا ہوا تھا۔ اسے اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ اک لمحہ لگا تھا اسے ثمرینہ کی چال
سمجھنے میں مگر وہ دوسروں کو سمجھانے سے قاصر تھا۔ منیجر کے اشارے پر سیلز مین نے تلاشی کے پہلے ہی
مرحلے میں بریسلٹ اس کی جیکٹ کی جیب سے برآمد کر لیا تھا۔ وہ اس حد تک حواس سلب کر چکا تھا
کہ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ اس نے گنگ ہوتے ہوئے اک نظر ثمرینہ کو دیکھا۔

"اگر تم مجھے اس بری طرح سے اگنور نہ کرتے خلیفہ مستقیم تو آج یہ ذلت تمہارا نصیب نہ بنی
ہوتی۔" مستقیم کو اس کی نظریں صاف جتلاتی ہوئی لگی تھیں۔ وہ اس پر تاؤ دلاتی مسکراہٹ اچھالتی،
اٹھلاتی، لہراتی دکان سے باہر نکل گئی۔ جب منیجر کے فون کرنے پر کچھ لمحوں میں پولیس پہنچ گئی تب اس
کا سکتہ ٹوٹا تھا اور وہ اپنی صفائی پیش کرتے گڑگڑانے لگا تھا۔

"دیکھیے سر! یہ جھوٹ ہے۔ میرے خلاف سراسر سازش...... م...... میں......"

"اوئے چپ کر اوئے! ثبوت جیب سے برآمد ہوا ہے اور تو اسے سازش قرار دیتا ہے۔ کل کا
لونڈا اب ہمیں پڑھائے گا۔"

حوالدار کے ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ اس کا گال سرخ کر گیا۔ وہ تھپڑ کی تکلیف سے نہیں بلکہ ذلت کے
احساس سے بلبلا اٹھا تھا۔ اس کی ایک بھی نہیں سنی گئی۔ اور بھرے بازار میں سے پولیس والے جب اسے ڈنڈے
مارتے ہوئے لے جا کر گاڑی میں بیٹھے، اس روز احساس ذلت کے سبب وہ خود سے بھی نظریں نہیں ملا سکا تھا۔

☆......☆......☆

وہیں جیل میں اس کی ملاقات ماکھے سے ہوئی تھی۔ ماکھے نے اس کی چپ توڑنے کی بہتری
کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی ہمدردی میں پولیس والوں کو گالیاں اور کوسنے بھی دیئے اور اپنے
حصے کا کھانا، چائے وغیرہ بھی اسے فراخدلی سے پیش کیں۔ مگر وہ تو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا
تھا۔ زندگی میں پہلی بار مایوسی، بے دلی کی انتہا پہ جا کے اس کا خودکشی کرنے کا دل چاہا۔ مگر وہ خود پر جبر
کرتا رہا۔ ابو کو یقیناً اس کی گرفتاری کا علم ہو چکا تھا مگر وہ اس کی ضمانت کو نہیں آئے۔
وہ جانتا تھا ان کا پارہ آسمان کو چھو رہا ہو گا۔ مگر غصہ الگ بات تھی۔ انہیں اس کی ضمانت تو کرانا
چاہیے تھی۔ اس نے ماکھے کے مشورے بلکہ اصرار پر اس کے فون سے گھر رابطہ قائم کیا۔ اس کی امی
سے ہی بات ہوئی تھی۔ جو اس کی آواز سنتے ہی رونے لگیں۔

"آپ ابو سے کہیں نا۔ وہ میری ضمانت کرائیں۔ یہ قید بہت جان لیوا ہے امی! آپ یقین

کریں میں بالکل بے گناہ ہوں۔ سراسر الزام ہے مجھ پر۔"

وہ اتنا بڑا ہو کر خود پر ضبط کھو کر بچوں کی طرح سے رو کر فریاد کر رہا تھا۔

"منتیں کرتی ہوں دن رات ان کی مستقیم! تمہارا کیا خیال ہے میں سکون سے بیٹھی ہوئی ہوں میرے بچے مگر وہ نہیں مانتے۔ انہیں یقین ہی نہیں کہ تم بے گناہ ہو۔ وہ تمہاری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ خاندان میں، پورے محلے میں ہر جگہ تمہاری گرفتاری کی خبر پھیل گئی ہے۔ لوگ افسوس کے بہانے آ کر ان کو اور بھی اشتعال دلا جاتے ہیں۔ تمہارے خلاف باتیں کر کر کے۔"

اور وہ سکتہ زدہ یہ ساری تفصیلات سنتا رہا۔ پھر دل برداشتگی کے عالم میں کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ یعنی صورتحال اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر سنگین ہو چکی تھی۔ ابو اس سے نالاں تھے۔ شاکی بھی تھے بیشک بدگمان بھی تھے۔ مگر یہ بھی سچ تھا انہوں نے اسے کبھی سمجھا نہیں تھا۔ کبھی سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ لیکن یہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس سے یوں لاتعلق ہو گئے تھے۔ یہ قطع تعلقی ہی اس اضطراب اور عذاب کا باعث تھی۔ ماکھا اس سے لاکھ پوچھتا رہا کیا کہا اس کے گھر والوں نے مگر وہ ایسی چپ لگی تھی جو ٹوٹتی نہ تھی۔

وہ مزید ایک ہفتہ حوالات میں بند رہا۔ ابو نے پلٹ کر اسے پوچھا تک نہیں۔ اس کے دل کو معمولی آس تھی وہ بھی اپنی موت آپ مری۔ ماکھے کی ضمانت ہوئی تو اس نے اپنی یک طرفہ محبت اور دوستی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور اس کو بھی رہا کرا لیا۔ وہ اس کا بے حد ممنون ہوا تھا مگر شکریہ ادا نہیں کیا کہ ایسی صورت میں ماکھا اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کرتا وہ یہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا تھا کچھ نہ چاہنے سے جو ہونا ہوتا ہے وہ نہیں رکتا وہ ہونا ہوتا ہے اور ہو کر رہتا ہے۔

☆......☆......☆

شریر ہوا کے جھونکے کیاریوں میں موجود پتوں کے ڈھیروں میں گھس کر ننھے بچوں کی طرح مٹھیاں بھر بھر کے پتے اچھالنے لگے اور لان کے ساتھ ساتھ پورا آنگن انہی خشک پتوں سے بھر گیا۔ شام اب اندھیری رات کی گود میں گرنے کو بیتاب نظر آتی تھی۔ اور سرد فضا دھواں دھواں سی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اٹھ کر سارے کمروں کی بتیاں جلانا شروع کیں۔ آج کچھ بھی پکانے کو دل نہیں تھا۔ مگر شوہر کے مزاج سے آگاہ تھیں۔ جبھی بے دلی سے کچن میں آ گئیں۔ سالن پکاتے، آٹا گوندھتے روٹی پکاتے، سلاد کاٹتے، میٹھے میں ٹرائفل بناتے ان کا دل بیٹے کی یاد لیے سسکتا رہا۔ اک مرتبہ

کے نہ ہونے سے پورے گھر پر ویرانی چھا گئی تھی۔ قبرستان جیسی مہلک ویرانی، جو وجود کے ساتھ دل میں بھی اپنے منحوس پنجے گاڑھ کر بیٹھ جاتی تھی۔

انہوں نے کھانا تیار کیا اور کچن کا دروازہ بھیڑ کر اندر چلی آئیں۔ سامنے ہی دیوار پر اس کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔ وزیر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی کارکردگی پر شیلڈ وصول کرتے ہوئے وہ کیسے فخر سے سر تانے کھڑا تھا۔

وہ بھلا مجرم تھا؟

اور اب وہ جیل میں سڑے گا؟

ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگی۔ اپنی ہر کوشش کر کے وہ ہارنے لگی تھیں جبھی اب ملول پھرتی تھیں۔ بس دعاؤں میں اللہ سے التجا کرتیں۔ اللہ کے بندوں نے تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ اپنے بستر پہ بیٹھنے کے بعد انہوں نے ٹانگوں پہ لحاف کھینچ لیا۔ انداز بے حد ملول تھا۔ وہ گھٹنوں پر رکھے بالآخر ضبط کھو کر سسک پڑی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ اپنے محلے میں داخل ہوا تو محلے کے کئی لوگوں سے اس کا سامنا ہوا۔ اسے دیکھ کر پہلے چونکتے پھر کترا کر گزر جاتے۔ جنہیں اس نے حسب عادت سلام کیا وہ اس سے ان قصوں کی تفصیلات جاننے کی کوشش میں مختلف سوال کر کے اگلوانے لگے جو اس کی غیر موجودگی میں اس کے حوالے سے یہاں مشہور ہو چکے تھے۔ اس کا جی چاہا ایسے سوالات کرنے والوں کا منہ تو ضرور نوچ لے۔ مگر خود پر ضبط کرتا ہوا گھر کی جانب بڑھ آیا۔ بند دروازے پر دستک کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ کہ دروازہ یونہی بھڑا ہوا تھا جسے دھکیلتا ہوا وہ اندر چلا آیا۔

اتنے بڑے گھر پر اک عجیب سی یاسیت اور ویرانی کا پہرا تھا۔ یوں جیسے صدیوں سے یہاں کوئی نہ رہا ہو۔ اسے اپنے ہی گھر میں اپنا آپ اجنبی محسوس ہونے لگا تو قدرے جھجکتے ہوئے انداز میں امی کے کمرے کی جانب بڑھا۔

"امی ...... امی ......"

اس نے آہستگی سے پکارا تھا۔ جائے نماز پر بیٹھی اس کی ماں اس کی پکار پر چونکی اور اگلے لمحے وہ بے یقینی سے مڑی تھیں۔ اسے روبرو پا کے ان کی آنکھیں حیرت خوشی اور غیر یقینی سے ساکن ہو کر رہ گئیں۔ وہ ان کے تاثرات پہچانتا تھا۔ ہر جھجک اور گریز جاتا رہا۔ وہ آگے بڑھ کر کسی چھوٹے سے بچے کی طرح ان سے لپٹ گیا۔ وہ اسے چومتی کبھی روتی تھیں کبھی ہنسنے لگتیں۔

"یا اللہ پاک تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب تو مجھے لگنے لگا تھا میرے بچے کہ تیری راہ تکتی میری آنکھیں پتھرکی ہو جائیں گی۔"

امی زار و قطار روتیں اس کے چہرے کے نقوش کو والہانہ انداز میں چوم رہی تھیں۔ مستقیم کو ساری اذیت ہر تکلیف بھولنے لگی جو اس نے ان چند دنوں میں شدتوں سے محسوس کی تھی۔ اس کے اندر سے جنوں کی پیاس بجھنے لگی۔ وہ یکا یک کتنا آسودہ لگنے لگا تھا۔

"کیا حشر کر دیا ظالموں نے میرے چاند کا۔ چل اٹھ۔ نہا دھو لے۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ کھانے کے بعد آرام کر لینا۔"

اک طرف سے اطمینان ہوا تو پہلی بار چلیئے پہ توجہ گئی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو، گندے مسلے ہوئے کپڑے، بکھرے بال، وہ کہیں سے بھی ان کا بے حد فریش، تر و تازہ اور شہزادوں جیسی آن بان والا بچہ نہیں لگ رہا تھا۔ مگر مستقیم ان کی محبت، اپنائیت کے باوجود ابو کی جانب سے خائف تھا۔ دل میں ان کی جانب سے ہی کو یا دھڑکا تھا جو زبان پر بھی آ گیا۔

"ابو کچھ کہیں گے تو نہیں نا مجھے؟"

"تو فکر نہ کر۔ بھول بھال گئے ہوں گے اب تک وہ۔"

اسے تسلی سے نوازتیں وہ یکدم چونک اٹھی تھیں کسی خیال کے آتے ہی۔

"تمہیں کس نے چھڑوایا ہے بیٹے!"

اور جواباً مستقیم نے گہرا متاسفانہ سانس بھرا تھا۔

"وہیں جیل میں تھا کوئی غنڈا ٹائپ آدمی! خوامخواہ مجھ سے دوستی گانٹھ رہا تھا۔ ضمانت بھی اسی نے کرائی ہے۔" اس کے بتانے کی دیر ہوئی۔ امی دل تھام کر وہیں بیٹھ گئیں۔ وہ بے ساختہ گھبرا گیا۔

"کیا ہوا ہے امی؟"

"اس نے کیوں کرائی؟ اسے کیا دلچسپی؟ ایسے خطرناک لوگوں کی دوستی دشمنی دونوں اچھی نہیں ہوتیں۔" وہ کتنی متفکر لگتی تھیں۔ مستقیم ان کے خدشات کو محسوس کر کے نرمی سے مسکرایا تھا۔

"آپ کیوں فکر کرتی ہیں امی! اتنی سمجھ تو مجھے بھی ہے۔ میرا اس سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں ہے۔" وہ ان کے ہاتھ تھامے انہیں ساتھ لگائے تسلی سے نواز رہا تھا۔

"تو بس آئندہ محتاط رہنا میرے بیٹے! دو بار حوالات کا چکر لگ گیا۔ اللہ خیر کرے۔"

ان کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔

"مجھے سخت بھوک لگی ہوئی ہے امی! وہاں آپ کے ہاتھ کے ذائقے کو بہت مس کیا ہے۔ مٹر پلاؤ بنائیں میرے لیے۔ میں تب تک نہا لوں۔ پھر آپ کو بتاؤں گا میرے ساتھ یہ سب کس نے اور کیوں کروایا۔ آپ کو تو یقین ہے نا امی کہ آپ کا بیٹا مجرم نہیں ہے؟"

اس کی بڑی بڑی ساحر آنکھیں اپنی صفائی پیش کرتے ایک دم پانیوں سے بھر گئیں۔

"ارے چور کو تو کوئی گرم توے پر بھی بٹھا کر پوچھے کہ وہ چور ہے تو کبھی تسلیم نہ کرے۔ ساری دنیا میں میرا نام ڈبو کر اور بدنامی کے اشتہار لگا کر یہاں میرے گھر کی دہلیز پھلانگنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ اس گھر میں کسی مجرم اور اشتہاری کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی کہ ہر تیسرے دن پولیس دروازہ کھٹکھٹا کر تمہارا مطالبہ ہم سے کرتی پھرے۔ ایک منٹ کے اندر دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

ابو اچانک آئے تھے۔ اور آتے ہی اسے سامنے پا کر مشتعل انداز میں چنگھاڑنے لگے۔ امی تو اتنی خوفزدہ ہوئی تھیں کہ باقاعدہ تھر تھر کانپنے لگیں۔ مستقیم نے البتہ ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ ان کے غصے کو کچھ اتنا بھی بے جا نہیں سمجھتا تھا۔ جو صورتحال تھی ان کا بدگمان ہو جانا اتنا بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ بیشک یہ الزامات تھے۔ مگر اسے انہیں حقیقت بتانی تھی۔ وہ نہ سہی اس کی جانب کا سفر اختیار کرتے مستقیم خود کر لیتا۔ وہ اس کے باپ تھے۔ وہ ان کے وجود کا حصہ تھا۔ کیسے ممکن تھا اسے اصل بات جاننے کے بعد بھی جھٹلاتے یا پھر جھٹک دیتے۔ جبھی وہ تیزی سے ان کے قریب آ گیا۔

"ابو آپ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں وہ غلط ہیں میں......"

اس کی بات ابو کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی بدولت ادھوری رہ گئی۔ بہت زنانے کا تھپڑ تھا۔ اس کا دماغ سنسنا اٹھا تھا۔ پھر انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ یکے بعد دیگرے اس کے چہرے پر طمانچے دھماتے چلے گئے۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ جبکہ امی رونا بھول کر پتھر کی ہونے لگیں۔

"بے شرم! بے حیا! آگے سے بکواس کرتا ہے۔ یعنی چوری بھی اور سینہ زوری بھی مجھے بتاؤ۔ لگتے فالتو اور بیکار ہیں لوگ جو تمہارے خلاف بیٹھے سازشیں کرتے ہیں۔ ہاں؟ احمق سمجھ رکھا ہے مجھے؟ میں پوچھتا ہوں اب یہاں آنے کا مقصد کیا ہے تمہارا؟ جس گینگ کے لیے کام کرتے ہو تم وہاں کیوں نہ دفعان ہو گئے تم! میں تمہیں شوٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ اگر تم یہاں سے دفع نہ ہوئے۔ میں نے سمجھ لیا میرا بیٹا پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ اور کاش تم مر ہی گئے ہوتے۔"

"خدا کا واسطہ ہے۔ ایسی بدفال تو منہ سے نہ نکالیں۔"

امی کے کلیجے پہ ہاتھ پڑا تھا۔ وہ بے اختیار زور زور سے رونے لگی تھیں۔

تیسرا حصہ

"خبردار عورت تم اس معاملے کے بیچ نہ آنا اور تم...... تم نکلو ایک منٹ کے اندر اندر یہاں سے
کہا ہے نا میں تم جیسے بے غیرتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ بس بہت ہو گئی۔"
انہوں نے پہلے امی کی فریاد پر انہیں جھڑکا اور دھتکارا پھر مستقیم کا بازو کہنی سے پکڑ کر کسی
کی مانند کھینچتے باہر کی جانب چلے۔ امی کے چہرے پر اس فرعونی حکم سے ہوائیاں اڑنے لگیں۔
نے لپک کر بے اختیار مستقیم کا بازو پکڑا مگر خود بھی ساتھ ہی گھسٹیں۔ ابو کی طاقت کے سامنے وہ
حیثیت ہی رکھتی تھیں۔ مستقیم تو تھا ہی حواس باختہ اور گھبرایا ہوا۔

"ایسا مت کریں مستقیم کے ابا! یہ غضب مت کریں۔ میں مر جاؤں گی۔ اللہ کی قسم!"
امی کوئی پیش نہ چلتی دیکھ کر پھر دونوں کے بیچ حائل ہوئیں۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں
رہی تھیں۔ ان کا انداز دیکھ کر لگتا تھا وہ ابو کے پاؤں بھی پڑ سکتی ہیں۔ مستقیم کو سب سے زیادہ
انہی کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

"ہاں تو مر جاؤ۔ اچھا ہے دنیا سے گناہوں کا بوجھ کچھ کم ہوگا۔"
ابو کتنے غصیلے انداز میں ان کی جانب پلٹے تھے۔ اسی طیش میں غراتے ہوئے انہوں
جارحانہ انداز میں انہیں دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر برآمدے کے ستون سے ٹکرائیں مگر اس پل
چوٹ کا احساس ہی کہاں تھا۔ مستقیم البتہ ضرور تڑپ اٹھا تھا۔

"پلیز امی بس کریں۔"
وہ جیسے خود رو دینے کو تھا۔ یکایک کتنی سرخی اتر آئی تھی اس کی ہر دم روشن رہنے والی
چمکتی آنکھوں میں۔ مگر وہ سن کہاں رہی تھیں کسی کو۔ ان پر تو ایک ہی دھن سوار تھی۔ بیٹے کو
مصیبت سے بچا کر اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کی دھن۔ جبھی بپھری ہوئی لہر کی طرح
سامنے آ کر پھر چیخیں۔

"ایسا سلوک مت کریں اس کے ساتھ۔ آپ کو احساس کیوں نہیں ہے آخر
ہے......"

ابو کا اٹھا ہوا ہاتھ ان کی بات ادھوری رہنے کا باعث بنا تھا۔ جو زناٹے کے تھپڑ کی صورت ان کے چہرے پہ سرخ نشان چھوڑتا ناک سے خون چھلکا گیا۔ وہ پہلی بار غصے میں ان کے آگے بولی تھیں۔ ابو سے یہی گستاخی برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ جبھی سراپا قہر تھے اور اب پہلے سے بڑھ کر اونچی آواز میں چنگھاڑ رہے تھے۔

"تیری زبان کاٹ دوں گا بدبخت عورت! یہ تیرے ہی لاڈ پیار کا نتیجہ ہے جسے آج میں ذلت کے ہمراہ بھگت رہا ہوں۔ اسے تو گھر سے نکالوں گا ہی۔ مگر تجھے بھی طلاق دینے کے بعد چٹیا پکڑ کر باہر پھینکوں گا تب اس زبان درازی کا پتا چلے گا تجھے! اس عمر میں دھکے کھاتی پھرنا منہ پہ کالک لگا کر۔"
اور طلاق کے ساتھ ساتھ آخری دو دھمکیاں ایسی تھیں جو امی کو رونا تو بھلاتی ہی۔ دہکا کے بھی رکھ گئیں وہ ساکن کھڑی تھیں۔ مستقیم جو تب سے شدید صدمے کے زیر اثر سکتہ زدہ تھا ان کی حالت دیکھتا تڑپ کر رہ گیا۔ ابو سے اس حد تک ذلالت کی اسے توقع نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں بھی خوامخواہ ذلیل کرنے پہ تل گئے تھے۔ اپنی حد تک تو وہ برداشت کر سکتا تھا مگر امی کے لیے نہیں۔ اب وہ چھوٹا سا بچہ نہیں تھا۔ جوان تھا۔ ان کو سنبھال سکتا تھا۔ خود ان کی پناہ گاہ بن سکتا تھا۔ جبھی تیزی سے بڑھ کر امی کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا، جو اس قدر سہمی ہوئی تھیں کہ گویا سانس لینا بھی بھول گئی تھیں۔

"امی! آپ چلیں میرے ساتھ۔ میں اب ہرگز آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔"
غم و غصے کی شدتوں سے وہ سرتاپا کانپ رہا تھا۔ کچھ فیصلے بھلے جتنے بھی اچانک ہوتے ہیں مگر بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی فیصلہ تھا۔ ابو نے خاصی تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھا جو ماں کے دوپٹے سے اس کا خون صاف کرتا ہوا ایک دم سے بہت بڑا ہو گیا تھا۔ جیسے وہ حقارت سے ہنس کر پھنکار کر اس سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں...... ہاں...... جاؤ لے جاؤ اپنی ماں کو بھی اپنے ساتھ...... میں اپنے نام کی بیڑی سے اسے آزاد کر دیتا ہوں۔ پھر لے جانا۔ چور اچکوں کے رشتہ داروں سے میں خود بھی کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔"
وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابو کو تکتیں امی کو اپنے مضبوط بازو کے حلقے میں لے کر تن کر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بہت مہربانی ہو گی جو آپ یہ احسان کر دیں۔ ہم خود بھی آپ سے اب کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہیں

رکھنا چاہتے۔ آپ جیسے خود پسند اور گھمنڈی لوگ اپنی ساری زندگی اپنی ذات میں دفن ہو کر
گزارتے ہیں۔"

"وہ ایک یکسر بدلے ہوئے مستقیم کی شکل میں ان کے سامنے تھا۔ ابو کو تو اس کی ڈھٹائی
غیرتی پر غش آنے لگے۔ جبکہ اس کے الفاظ پہ امی کا یہ سکتہ بھی جیسے چھناکے سے ٹوٹا۔ وہ بڑے
کر حواسوں میں لوٹیں تھیں اور باپ کے سامنے جم کر کھڑے مستقیم کی شرٹ کا کالر پکڑ کر
میں کھینچا۔

"مستقیم!" وہ صدمے سے پھٹی مگر بد بانی آواز میں چیخی تھیں۔

"شرم سے ڈوب مرو ماں کو اس بڑھاپے میں طلاق دلوا رہے ہو۔ وہ بھی خود کہہ کر۔"

وہ پھپھک کر رو پڑیں۔ بے بسی۔ بے کسی اور شرم کی انتہاؤں کو چھوتا مستقیم سخت
گیا تھا۔

"اونہہ دیکھ لیا۔ میری باتوں کا تو یقین نہیں تھا نا۔ یہ جوہر ہیں اس کے۔ ابھی آگے آگے
کیسا نام روشن کرتا ہے تمہارا۔"

ابو چمک کر بولے تھے۔ انہیں جیسے سنہرا موقع ہاتھ لگا تھا۔ اس پہ فرد جرم عائد کرنے کا۔
وقت بالکل کٹ کر رہ گیا جب اس کے حوصلہ دینے کو بڑھے ہاتھ امی نے بے حد تنفر سے جھٹکے۔

"جاؤ چلے جاؤ یہاں سے ...... مستقیم! چلے جاؤ۔ میں نے سمجھا تم پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔"

وہ یونہی روتے ہوئے اسے دھکا دے کر بولیں۔ آہ و بکا اور تڑپ شدید تڑپ۔ مگر ان کے
گیا تھے ...... وہ تو خنجر تھے۔ تلواریں تھیں۔ جو اس کی رگ جاں میں اتر گئی تھیں۔ وہ تو جیسے
نہیں لے سکا اور دھڑ سے زمین پہ جا گرا تھا۔ غیر یقینی اور صدمے سے شق ہوتا گنگ کھڑا تھا۔
کے چہرے پہ طنز و تمسخر کے ساتھ اس اہم مقام پہ ملنے والی فتح کا تاثر بھی بہت تیزی سے
ٹھہر گیا تھا۔

"بس! بس ...... ہو گئی تسلی؟ اب اپنے کالے کرتوتوں کے ساتھ شکل گم کرو۔"

اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر وہ حقارت سے کہہ رہے تھے۔ چہرے پہ
رعونت تھی۔ وہ اس کے باپ تھے؟ و ...... کہ باپ کیسے ہو سکتے تھے۔ باپ بہرحال ایسے
ایسے بے رحم تو نہیں ہوتے۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے ان کے تلخی سے
چہرے سے نگاہ ہٹالی اور اک آخری امید کے تحت اپنی ماں کو دیکھا۔ شاید انہیں اپنے الفاظ

احساس ہو گیا ہو، شاید وہ اس کے دل میں گڑھ جانے والا بھالا کھینچ لیں۔ مگر وہ اس کی جانب متوجہ نہیں
تھیں۔

ہاتھوں میں چہرا ڈھانپے کھڑی رو رہی تھیں۔ یقیناً اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ شاید اس
کے جانے کی منتظر۔

یقیناً وہ اسے معاف کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھیں۔ ازالہ کرنا تو دور کی بات۔ انہوں نے بھی
اسے جانے کو کہہ دیا تھا۔ یعنی اب اس گھر میں اس کے لیے جگہ نہیں تھی۔ یہ احساس بہت جان لیوا
تھے۔ وہ واپسی کو مڑا تو دکھوں نے اس کے اندر رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے دل میں امی کے الفاظ
سے گڑھ جانے والے بھالے سے ٹپکتا خون اس کے پورے وجود میں زہر بن کر پھیلنا شروع ہو گیا
تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر لمحہ سرخ ہو رہی تھیں۔

☆......☆......☆

تراش کر میرے بازو اڑان چھوڑ گیا
ہوا کے ہاتھ برہنہ کمان چھوڑ گیا

رفاقتوں کا میری اس کو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

نکل گیا ہے کہیں ان دیکھے پانیوں کی طرف
زمین کے نام کھلا بادبان چھوڑ گیا

عقاب کو تھی غرض اپنا شکار پکڑنے کی
جو گر گیا تو یونہی نیم جان چھوڑ گیا

نہ جانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

عقب میں گہرا سمندر ہے سامنے جنگل
یہ کس انتہا پہ میرا مہربان چھوڑ گیا

اس کے اندر دکھ تھا۔ گہرا دکھ، جو ڈھلتا ہی نہ تھا۔ ابو کے ساتھ ساری دنیا بھی مل کر اسے ٹھکراتی،
بے دردی سے دھتکار دیتی۔ وہ کبھی ایسے نہ ٹوٹتا۔ ایسے نہ بکھرتا۔ مگر امی نے ٹھکرایا تھا تو وہ خود سے بچھڑ گیا
تھا۔ وہ گھر سے نکلا تو شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ وہ گلے کے جانے پہچانے مناظر کو کسی اجنبی کی نگاہ
سے دیکھتا آگے بڑھتا رہا۔ وہ ساری رات چلتا رہا اور تھکا نہیں کہ روح کی تھکن وجود کی تھکن پہ غالب
تھی۔ اس کی پور پور میں اضطراب تھا، وحشت تھی۔ یہ ایسا دکھ تھا جس سے وہ سمجھوتہ ہی نہ کر پایا تھا مگر
بھر اسے صبر ہی نہ آسکا تھا کبھی بھی۔ صبح ہوئی تو وہ ایک پارک کی بینچ پر گر کر بے سدھ ہو گیا۔

آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی تیز شعاعوں نے مسلسل اس کے چہرے سے چھیڑ خانیاں کی
تھیں۔ کئی گھنٹے ایک ہی زاویے سے پڑے رہنے سے اس کے اعصاب مفلوج ہو رہے تھے۔ مگر اس

سے بھی شدید احساس پیٹ میں دہکتے الاؤ کا تھا۔ اس نے جانے کتنے دنوں سے ڈھنگ سے
نہیں کھایا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی اب وہ کیا کرے کہ پیٹ کی آگ بجھ سکے۔

پارک سے نکل کر وہ ایک چھپر ہوٹل تک آ گیا۔ اس کی گردن میں جو سونے کی زنجیر تھی اور
نے اسے میٹرک کے بعد تحفہ دی تھی جانے پولیس والوں کی نظر سے کیسے بچ گئی تھی۔ ورنہ تو انہوں
اس کی جیب سے دس روپے کا آخری مڑا تڑا نوٹ بھی نکال لیا تھا۔ جس کی موجودگی کی خود اسے خبر
نہیں تھی۔ بان کی کھری چارپائی پہ نسبتاً رش سے الگ تھلگ بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے لیے دال
آرڈر کی تھی۔ تب ہی جانے کس جانب سے نکل کر ماکھا اس کی رکھائی کو خاطر میں لائے بغیر
پرجوش انداز میں اس سے زبردستی بغلگیر ہو گیا تھا۔

"اوئے شہزادے! تو ادھر کدھر شیر جوانا۔"

"یہاں لوگ غالباً کھانا کھانے آتے ہیں۔"

ماکھے کے برعکس اس کا انداز سرد مہر تھا۔ مگر ماکھا پھر بھی خفت کا شکار نہیں ہوا۔ الٹا ڈھٹائی
ہنسنے لگا تھا۔

"تجھے پتہ ہے شہزادے! نخرہ بھی جچتا ہے تجھ پر۔"

منہ میں موجود پان چباتے ہوئے وہ اپنے مخصوص فدا ہونے والے انداز میں کہہ رہا تھا
سے مستقیم کو جی بھر کے الجھن ہوئی۔

اسی وقت ہوٹل کے چھوٹو نے کھانا لا کر مستقیم کے آگے رکھا تھا۔ پلاسٹک کی چنگیر میں دو تندوری
روٹیاں، تام چینی کی پلیٹ میں ماش کی بھنی ہوئی دال، جس پر بہت خوبصورت انداز میں باریک
ہوئی پیاز ڈالی گئی تھی۔ ساتھ دہی کی چٹنی، ماکھے نے ابرو اچکا کر اس نرے کا جائزہ لیا پھر پلٹ کر
کو گھورا تھا۔

"اوئے نکڑ کی ٹانگ لا میرے ببر شیر کے لیے۔ تجھے نہیں پتہ یہ میرا مہمان ہے۔"

وہ اپنی کرخت آواز میں اسی طرح دھاڑ کر بولا تھا کہ آس پاس سناٹا چھا گیا۔ چھوٹو نے
"جی اچھا جناب!" کہا اور سرعت سے پلٹ گیا۔ مستقیم اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہاں اس علاقے
ماکھے نے اپنی بدمعاشی کی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ مگر اسے کیا۔ وہ تو ماکھے سے نہیں ڈرتا تھا
دب جاتا۔ جبھی اسے اس کی بات کو سرے سے نظر انداز کیے اس نے اپنا منگوایا ہوا کھانا ہی کھا
کر دیا تھا تو ماکھا ٹوکے بغیر نہیں رہا۔

"اوئے میرے پتر ذرا رک جا! یہ کھانا تیرے شایان شان نہیں ہے۔"

مستقیم کے چہرے پر استہزا کا رنگ اترا تھا مگر جواب دیے بغیر اپنے کام میں مشغول رہا۔ ماکھا
گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

"گھر والوں نے نکال دیا ہے نا تجھے؟"

اس کا جائزہ مکمل ہوا تو تجزیہ پیش ہو گیا۔ نسوار کی پڑیا نکال کر چٹکی منہ میں دباتے اس نے جتنے
سکون سے سوال کیا تھا مستقیم کے اندر اسی قدر تباہی مچ گئی۔ منہ کی جانب جاتا اس کا نوالہ تھامے ہاتھ
ساکن ہوا اور چہرا یکلخت کتنا تاریک پڑ گیا تھا۔ ماکھے کی زیرک نگاہ نے اس کے چہرے پر اترتی
اذیتوں کی برسات کو دیکھا اور سرد آہ بھرلی۔

"حوصلہ پکڑ میرے شیر بہادر! یہ دنیا اتنی ہی ظالم ہے۔"

مستقیم سے نگاہ بھر کے اس کی جانب نہیں دیکھا گیا۔ اسے لگا تھا۔ اسے کسی نے سربازار عریاں
کر دیا ہے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور ماکھے کو نظر انداز کرتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں سے دور ہوتا چلا گیا۔
ماکھے کی پکاروں کو سرے سے ان سنی کیے۔

☆......☆......☆

سارا دن کہر چھائی رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل ہونے کی وجہ سے زمین کے مکین سورج کی
ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ تیز برفیلی ہوائیں نیزوں کی مانند جسم میں پیوست ہوئی تھیں۔ اس کا وجود
تھکن اور بخار سے جلتا تھا۔ پچھلے چھ گھنٹے اس نے لگاتار کام کیا تھا۔ اس کے سامنے پھیلے تین کنال کے
بنگلے کی دوسری منزل زیر تعمیر تھی اور اس میں اس نے آج مزدوری کی تھی۔ پیٹ کا دوزخ ایندھن مانگتا
تھا۔ اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔

چین فروخت کر کے اس نے ہوٹل والے کو ادائیگی کی تھی اور باقی ماندہ پیسوں کا حساب لگاتا رہا
تھا کتنے دن چلیں گے۔ مگر اس ٹینشن سے اسے کسی جیب کترے نے آزاد کرا دیا تھا۔ اس صفائی سے
جیب کٹی تھی کہ وہ حیران ہوتا رہ گیا۔ یعنی نقصان پر نقصان۔ مگر اب اس سے بڑھ کے نقصان ہوتا۔ ہی
کیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی پورا الٹ چکا تھا۔

دو دنوں کی بھوک سے عاجز ہو کر اس نے آج یہ مشقت طلب کام کیا تھا کہ ہاتھ پھیلانا اور
چھیننا اس کی سرشت تھا نہ فطرت۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہ دونوں کام نہیں کر سکا۔ حالانکہ ماکھے نے سمجھانے
کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کا بہترین مشورہ بھی دیا تھا۔ مگر وہ

اس راہ کا مسافر ہی نہیں تھا۔ ابھی اس نے اپنے مستقبل کے حوالے سے کچھ سوچا نہیں تھا کہ ذہنی
کہاں کرتا تھا۔ فی الحال تو بس اسے دو وقت کی روٹی کی فکر تھی۔ اور اسی سلسلے میں اس نے مزدور کی
حیثیت سے جان توڑی تھی۔

اس چند گھنٹے کی مزدوری میں اس نے صاف محسوس کیا کہ اس کے ساتھی مزدور اس سے ان
مشقت لے رہے ہیں۔ اینٹوں سے بھری ہوئی ہاتھ سے دھکیلنے والی ریڑھی وہ اوپر لے کر جاتا تو واپ
خالی نہیں آنے دیا جاتا تھا۔ اس کی ریڑھی میں ماربل بھر دیا جاتا۔ اسے غصہ تو آیا تھا، مگر وہ ضبط ہی کو
نہیں چاہتا تھا۔ جب ہی اپنے حوصلے آزماتا رہا۔ مگر کب تک۔ یہ برداشت یہ حوصلہ اس وقت تک
کا ساتھ چھوڑ گیا تھا، جب دن بھر کی بھرپور مشقت کے بعد اجرت کے نام پہ اس کی ہتھیلی پہ دس
کے دس نوٹ رکھے گئے۔ اس نے تحیر کے عالم میں ان نوٹوں کو گنا۔ مگر اسے کوئی غلطی نہیں لگی تھی۔
گننے پہ بھی وہ تعداد میں دس ہی رہے تھے۔ جبکہ وہ اس بات سے بہت اچھی طرح آگاہ تھا کہ مزدور
کی اک دن کی اجرت چار سو روپے ہے۔

"یہ کم ہیں۔ مجھے میری پوری اجرت چاہیے۔"

نوٹ واپس کرتے ہوئے اس نے بہت تحمل بھرے انداز میں ٹھیکیدار کو مخاطب کیا تھا۔ اس کے
باوجود اس کے چہرے کے زاویے اس فرمائش کو سن کر بگڑنے لگے۔ اس نے پرتپش نظروں سے مستقیم
کو دیکھا اور ہتک آمیز انداز میں رعونت شامل کر کے بولا تھا۔

"اوئے وڈے حسابی کتابی! اتنے مل گئے ہیں نا غنیمت سمجھ اور ادھر سے پھوٹ لے۔ یاد گرنے
نے بتایا تھا تجھے کہ ہمارے مخصوص مزدور ہیں اور ہم ان سے اپنا کمیشن کاٹتے ہیں۔"

مستقیم کو ٹھیکیدار کا انداز برا محسوس ہوا تھا مگر اس کا مقصد جھگڑا فساد کرنا نہیں تھا۔ جبھی تو
برداشت کا دامن نہیں چھوڑا۔ البتہ وہ اپنا حق بھی غصب ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جبھی طریقے سے
سمجھانے لگا۔

"دیکھیے میں اس کھیپ میں شامل نہیں ہوں تو میں کمیشن بھی نہیں دوں گا۔ جب میں نے کام
میں کمی نہیں کی۔ تو مجھے اجرت بھی پوری چاہیے۔"

اس کا مطالبہ ناجائز نہیں تھا، مگر ٹھیکیدار کو اس کی اپنے حق میں اٹھائی آواز ضرور ضرورت سے
زیادہ مشتعل کر گئی۔

"اوئے...... تمیز سے بات کر لونڈے! ورنہ زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

"کیوں کھینچ لو گے؟ زرخرید غلام ہوں تمہارا؟ سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔"

اس کے خوامخواہ بھڑنے پہ مستقیم کو بھی تاؤ آ گیا تھا۔ جبھی اسے کھری کھری سنا دیں جو اسے
بھی خاصی مہنگی پڑ گئی تھیں۔ ٹھیکیدار نے آپے سے باہر ہوتے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ آس پاس
کھڑے مزدور، جو اسی کے چیلے تھے اک اشارے پر حرکت میں آئے۔ پھر تو جیسے ہر طرف سے مستقیم پر
عتاب ٹوٹنے لگا۔ لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں کی گویا اس پر بارش برسا دی گئی۔ اس طرح وہ سب شاید
ٹھیکیدار کی نظروں میں اچھا بننے اور اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم کرنا چاہ رہے تھے۔

"اوئے! تجھے جرأت کیسے ہوئی۔ ٹھیکیدار صاحب سے بدکلامی کرنے کی۔"

وہ اس کی ٹھکائی کرتے بار بار اس کی گستاخی باور کراتے تھے۔ مستقیم کو کہاں لڑنا آتا تھا۔ اس کا تو
کبھی پالا ہی نہ پڑا تھا اس قسم کے حالات سے۔ زندگی میں جب بھی اسے گھیرا گیا تھا۔ وہ پٹے ہوئے
مہرے کی مانند ہمیشہ چت ہوا تھا۔ پھر اب کیسے نپٹتا۔ کیسے مقابلہ کرتا۔ محض چند لمحوں میں اس کا حلیہ بگڑ
چکا تھا۔

اس ایک واقعے نے اسے پوری طرح دل برداشتہ کر دیا۔ اس نے بس اک بات جانی تھی اور وہ
یہ کہ کرپشن، دھاندلی اور بے ایمانی ہر سطح پر پھیل گئی تھی۔ چاہے وہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والا آمر
ہو یا نچلے طبقے کا اک فرد...... اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر کوئی اپنے سے کمزور کو لوٹ رہا تھا۔ ہر کوئی
دھوکہ دے رہا تھا۔ ایسے میں یہ اس کی ذہنی ابتری ہی تھی کہ ایسے لمحوں میں ایک بار پھر ماکھے نے اسے
اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی تو وہ پہلے کے سے نخوت اور رعونت سے انکار نہیں کر سکا۔ وہ
اچھائی کا سبق کیسے یاد رکھتا۔ کوئی اسے ایسا کرنے ہی نہیں دے رہا تھا۔

یہ بھی نہیں تھا کہ دنیا سے اچھے لوگوں کا سرے سے خاتمہ ہو گیا تھا، یا اچھائی مکمل طور پر رخصت
ہو گئی تھی۔ مگر شاید قسمت کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی تھی۔ ایسے میں وہ ماکھے کے ازبر کرائے سبق
دہرانے لگا۔ جس نے کہا تھا۔

"دیکھو پیارے! یہ دنیا بہت خراب ہے۔ بنا کسی جرم کے اس نے تجھے مجرم بنا دیا۔ تجھے ہر طرح
ستایا۔ اب تو بھی انداز اپنا لے۔ جو دنیا نے تجھے دیا، اسے واپس لوٹا دے۔ پھر دیکھنا یہ ہی دنیا
کیسے تیرے آگے جھکتی ہے۔ تیری ہیبت سے کانپتی ہے۔"

اور اس نے مایوسی کی انتہائی کیفیت میں اسی راستے پہ قدم رکھ دیے۔ وہ مستقیم تھا۔ اپنے نام
کے برعکس کیسے ہو سکتا تھا مگر اسے کر دیا گیا۔ چہار سو گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہر راستہ بند۔ امید کی کرن

جہاں چمکتی تھی وہ ماکھا تھا۔ وہ اس جانب نہ آتا تو کیا کرتا۔ اس نے اس راستے کو اپنا لیا۔ جس پر
چلنے کے اس نے خود سے عہد باندھے تھے۔ اب اسے اگر اپنایا تھا تو اس کے اندر کوئی ملال نہیں تھا۔
دنیا کو وہی لوٹانے جا رہا تھا جو اسے زبردستی دیا گیا۔ بلکہ اس پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ اسے اب اس بات
پر دکھ اور افسوس بھی نہیں تھا کہ معاشرے کی ناانصافیوں اور انسانی رویوں کی بدصورتی نے اس سے اس
کی سادگی اور معصومیت چھین لی تھی۔ اس کی شرافت کو اس کی کمزوری اور بزدلی سے تعبیر کیا گیا تو اسے
شرافت اور نرمی سے نفرت ہو گئی۔ اس معاشرے کو، ان لوگوں کو شرافت کی زبان سمجھ نہیں آتی تھی جبھی
اس نے ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ لیا۔ کل تک دنیا اسے آگے لگائے پھرتی تھی۔ اب وہ دنیا کو اپنے آگے
غلام بنا کر کھڑا کیے ہوئے تھا۔

☆......☆......☆

ماکھا اپنے علاقے کا بدمعاش تھا۔ جگا ٹیکس وصول کیا کرتا اور چھوٹی موٹی چوریاں کرتا۔ کبھی کسی
راہگیر کو کسی سنسان جگہ پہ گھیر کر ریوالور دکھا کر پیسے نکلوا لیے۔ یا موبائل چھین لیا۔ مستقیم بھی اس کی
زیرِ نگرانی آیا تو اس کے نقشِ قدم پر چلنے لگا۔ اب کیا ٹھاٹ کی زندگی تھی۔ وہی لوگ جو کبھی اسے
آنکھیں دکھاتے تھے۔ اب اس سے دہشت کھانے لگے۔ بدکنے لگے۔ وہ جہاں سے گزرتا۔ لوگ
بدل لیتے۔ کس میں جرأت تھی اس کے سامنے آنکھ اٹھانے کی۔ ماکھے کے اور بھی ساتھی تھے جو
کے اندر تھے۔ راجو، حسام، سالار، امانت یہ سب بھی کم و بیش مستقیم جیسے حالات کا شکار نوجوان تھے
اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر نوکری نہیں تھی۔ گھروں اور رشتوں کے دھتکارے اور ڈسے ہوئے۔ ماکھا ان کا
باپ بن گیا تھا۔ مگر مستقیم کو خاص سمجھتا۔ خصوصی اہمیت سے نوازتا۔

سب جانتے تھے خلیفہ مستقیم استاد کا چہیتا ہے اور وہ اسے سر آنکھوں پر رکھتا ہے، جبھی اسے
خصوصی رعایت حاصل تھی۔ باقی سب اس سے دبتے۔ ماکھے کے تعلقات بہت بڑے بڑے لوگوں
سے بھی تھے چاہے وہ پولیس میں ہوں یا سیاست میں۔ وہ ہر کرپٹ انسان کا سگی بیلی تھا۔ جو کبھی
کام آتا اور بھاری معاوضہ وصول کرتا۔ اپنے مقاصد بھی وہ ان بڑے لوگوں کی بدولت بہت
سے حاصل کر لیا کرتا تھا۔ مستقیم کی جیل سے ضمانت اسی تعلقات کا شاخسانہ تھی۔ ورنہ اتنی جلدی
یوں چپ چپاتے حل نہ ہوا ہوتا۔

ماکھے سمیت اس کے سب ساتھی شراب اور شباب کے رسیا تھے۔ ہر تیسرے دن ان کی
میں محفلیں جمتیں۔ پھر وحشیانہ کھیل رچایا جاتا۔ جس میں مستقیم نے ماکھے اور امانت کے

باوجود کبھی شامل ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی زندگی۔ اس کی معصومیت اور اس کی سادگی کو
ڈسنے اور زہر آلود کر دینے والی ساری عورتیں ہی تھیں۔ وہ عورت سے شدید گھن کھاتا تھا۔ پھر آپ کے
سامنے کیسے کمزور پڑ جاتا۔ وہ کھلونا نہیں تھا کہ عورت ایک بار پھر اس سے کھیلتی۔ یہی احساسات تھے جو
اسے ان ماہ و سال میں عورت سے بدکانے کا باعث بنتے رہے۔

ماکھے کے بعد امانت تھا جس سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا اور آٹھ
بہنوں کا واحد کفیل بھی۔ مگر حالات کی چکی میں پستا ماکھے کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ پھر وہ تھی شمائلہ۔ اس کی
بہت ہی اس کی محبوبہ۔ جو مستقیم پر دل ہار گئی تھی۔ اور سب کچھ لٹا کر ان کے گروہ میں شامل ہو گئی تھی۔
مستقیم کو سب سے ناگوار بات بھی یہ لگی۔ مگر ماکھے کی مداخلت کے باعث ناچار مستقیم کو اس کی جانب
سے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا۔ مستقیم کو ماکھے نے اسلحے کے استعمال اور کرانے کی تربیت دے کر اس
فن میں طاق کر دیا۔ وہ چیتے کی طرح پھرتیلا اور لومڑی کی طرح عیار تھا۔ اس نے اپنا ہر فن مستقیم میں
بدرجہ منتقل کر دیا۔ شیر جیسی طاقت تو پہلے سے اس میں موجود تھی جسے بہترین انداز میں استعمال کیا گیا
تو ماکھے نے اسے اپنا بھی گرو تسلیم کر لیا اور جب ایک پولیس مقابلے میں ماکھا جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو
اس کے تمام ساتھیوں کی متفقہ رائے سے خلیفہ مستقیم کو استاد ماکھے کی جگہ سردار کی حیثیت دے دی گئی۔

☆......☆......☆

مستقیم نے ماکھے کے اسٹائل کو چھوڑ کر اپنے انداز میں ڈکیتی شروع کی۔ اس نے دو بار بینک
لوٹنے اور لاتعداد مرتبہ بڑے بڑے سیٹھوں کی تجوریاں خالی کیں۔ اس کا شکار ہمیشہ بڑے اور کرپٹ
لوگ بنتے تھے۔ اس نے محدود سے عرصے میں اپنے سارے ساتھیوں کو بھی مالا مال کر دیا تھا مگر پچھلے
کچھ دنوں سے پولیس بہت الرٹ تھی۔ ایک دو بار تو وہ بال بال بچے تھے۔ مستقیم نے کچھ دن دانستہ
واردات نہیں کی کہ شہر میں اس کے کارناموں نے ہلچل مچا کے رکھی ہوئی تھی۔ مگر پھر ساتھیوں کے
اصرار پر اس نے نسبتاً چھوٹے پیمانے پہ وارداتیں کی تھی۔ وہ بھی شہر سے الگ مختلف قصبوں میں۔ مگر
وہ نہیں جانتا تھا۔ یہیں سے اس کی زندگی نیا موڑ لے لے گی۔

وہ جو عورت کے وجود سے الرجک تھا۔ جانے کیا تھا اس نازک بدن والی بے انتہا خوبصورت
معصوم سی لڑکی میں کہ وہ اپنی زندگی کا دوسرا بڑا فیصلہ اتنا اچانک کر گیا۔ اور اسے لگا تھا۔ اس کی زندگی
بدل گئی ہے۔ وہ عالم برزخ سے جنت میں آ گیا ہے۔ دیا کی محبت اسے اپنے روم روم میں بسی محسوس

ہوتی تھی۔ ایسی مقناطیسی کشش جس کے تحت وہ بے اختیار ہوتا چلا گیا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ اسے کبھی بھی دیا کا تنفر برا نہیں لگتا تھا۔ وہ اسے اس کے ہر رویے میں حق بجانب سمجھتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا وہ اپنی بے پایاں، انمول اور بے حد پر خلوص محبت سے اس لڑکی کا دل جیت لے گا۔ اک دن آئے گا جب وہ بھی اس طرح اس سے محبت کرے گی۔ اسے اسی دن کا انتظار تھا۔ مگر اک بار پھر اس کا بھرم ٹوٹ گیا۔ سپنے بکھر گئے۔ اس نے جانا وہ کتنا خوش فہم تھا۔ وہ آج بھی احمق ہی تھا۔

وہ آج بھی اپنی زندگی کے اسی مقام پہ کھڑا تھا جب اس کے جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ اس کے محبت بھرے دل کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ وہ ابھی تک اس قسمت کے چکر سے نہیں نکل سکا جس میں مبتلا ہو کر ابو نے اسے ایک چور اک لٹیرا سمجھتے گھر سے نکالا تھا تو امی نے اسے اپ بڑھاپے کا بیڑا ڈبو دینے والا جان کر اپنے دل سے، نہ وہ اس کرب سے نکلا تھا۔ نہ وہ اب اس اذیت سے باہر آ سکتا تھا۔ حقیقت اپنی تمام تر برہنگی کے ساتھ تیز دھار تلوار بنی اسے بار بار ذبح کرتی تھی۔

اس کا جی چاہا۔ زندگی کی اتنی اہم بازی پھر سے ہار جانے پر وہ بچوں کی طرح سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روئے۔ تھا کوئی اس سے بڑھ کر بھی دوسرا بدنصیب اس دنیا میں۔ ہر محرومی کو سینے میں چپ چاپ چھپا لینے کے بعد اس نے کتنی چاہ سے اک معصوم بچے کی طرح سے ہی دیا کے آنچل میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ سکھوں، خوشیوں، سکون کی چاہ لے کر۔ لیکن اس نے اپنا آنچل ہی سمیٹ لیا تھا۔ اور اس کے وجود کو حالات کی کڑی دھوپ میں جھلسنے کو چھوڑ دیا۔ اس نازک لڑکی جس کی شکل میں معصومیت اور بے ریائی کا خالص پن رچا بسا تھا دل کی کتنی سفاک نکلی تھی۔ اسی دنیا کی طرح جس نے اسے ان نوبتوں کو پہنچا دیا تھا اور ذرا بھی تاسف میں مبتلا نہیں ہوتی تھی۔ اس کا دل بے مائیگی اور شدید کرب کے ہمراہ سسکتا چلا گیا۔ تمام زخم پھر سے ٹسک دینے لگے۔

بھیڑیے کی فطرت سے وحشتیں نہیں جاتیں
زور ٹوٹ جاتا ہے عادتیں نہیں جاتیں
دانت جاتے رہتے ہیں خصلتیں نہیں جاتیں
شہر کی شریعت میں خون بہانے والو ، کو
خوں بہا بھی ملتا ہے اک شکار کرنے پر دوسرا بھی ملتا ہے
اژدھے کے مذہب میں بے اماں کینوں پر

آہنی تصرف کا حق ہمیشہ رہتا ہے
تندوے کی آنکھوں میں عمر پوری ہونے تک
زرد حرص رہتی ہے
سانپ کی طبیعت پر ستم رسیدہ لوگوں کا
کوئی غم نہیں ہوتا
سانپ کے لیے کوئی بھی محترم نہیں ہوتا
کینچلیں بدلنے سے زہر کم نہیں ہوتا

اس ستم گزیدہ انسان کو اس سفاک دنیا نے پھر گہرے دکھ گہرے رنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا وہ اب بھی ماتم نہ کرتا؟ کیا وہ اب بھی نہ روتا؟

☆......☆......☆

دیا نے کروٹ بدل کر دروازے کے باہر نگاہ کی۔ وہ اسے اسی کیفیت اسی پوزیشن میں ساکن کھڑا نظر آیا۔ جیسے پچھلے چھ سات گھنٹوں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ تھکتا بھی نہیں تھا یا خود اذیتی کا شکار ہو رہا تھا۔ دیا اندر سے مضطرب ہونے لگی۔ موسم بہت سرد تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ سکتی تھی۔ اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ اسے مستقیم کی فکر ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ رہ نہیں سکی اور بستر کے ساتھ کمرے سے بھی نکل کر باہر چلی آئی۔ باہر سرد برفیلی ہوائیں تھیں۔ جو اس کی شال کے پلو اور اس کے کھلے بالوں کو اڑانے لگی تھیں۔

”مستقیم! کیوں کھڑے ہیں یہاں؟ اندر چلیں، تھک گئے ہوں گے۔ لیٹ جائیں ذرا۔“

وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی اور اپنا نازک ہاتھ بہت اپنائیت آمیز انداز میں اس کے بازو پر رکھا۔ سگریٹ کے کش لیتے مستقیم نے اپنی دہکتی ہوئی لہو رنگ آنکھوں سے اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور جواب دیئے بنا پھر سے تاریکیوں میں گھورنے لگا۔ انداز تخاطب تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ تم سے آپ کے درجے پر فائز ہو گیا تھا۔ یہ معمولی انقلاب نہیں تھا۔ مگر وہ غور کرتا تو ہی سمجھ بھی پاتا۔ وہ تو اس پل خود اپنے آپ سے بھی روٹھا ہوا تھا۔ دیا نے اس نظر اندازی و خاموشی کے جواب میں اسے دھیان سے دیکھا۔ پھر گہرا سانس بھر کے دوبارہ سے اسے مخاطب کر لیا۔

”کیا کہہ رہی ہوں میں؟ سن کیوں نہیں رہے آپ؟“

اب کی مرتبہ وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ گویا کہ زبردستی توجہ حاصل کرنی چاہی۔

"تم جا کے سو جاؤ۔ میری فکر چھوڑ دو۔"
وہ بالآخر بولا۔ مگر آواز بے حد بھاری ہو رہی تھی۔ دیا نے اس کی ناراضی صاف محسوس کی تو مسکرانے لگی۔
"نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ باہر ہیں تو مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"
اس نے لاچاری ظاہر کی۔ یہ بھی عام بات نہیں تھی مگر وہ پھر بھی نہیں چونکا۔ اور اس پیش رفت کو سمجھے بغیر سابقہ انداز میں گویا ہوا تھا۔
"تمہیں میری موجودگی میں بھی نیند نہیں آتی۔ میرے خراٹوں کی وجہ سے۔"
"اب آ جاتی ہے۔ میں عادی جو ہو گئی ہوں آپ سمیت آپ کی ہر عادت کی۔"
بات ایسی تھی کہ مستقیم بالآخر چونک کر رہ گیا۔ کش لینا بھول کر اس نے دیا کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار اس نے نگاہ نہیں چرائی۔ بلکہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ بہت پیاری تھی یہ مسکان۔ صلح جو، اپنائیت کا احساس دلاتی ہوئی۔ دوستی کی ابتدا کرتی ہوئی۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچتے ہوئے نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔ دیا یوں فتح مندانہ انداز میں مسکرائی۔ جیسے اپنے محاذ پر اسے پہلی بار پسپا کیا ہو۔
"تم نے میڈیسن یوز کی؟"
اب وہ اسے دیکھے بغیر سوال کر رہا تھا۔
"نہیں..... اور کروں گی بھی نہیں۔"
"کیوں؟"
وہ دھاڑا اور اسے گھورنے لگا۔ دیا مجال ہے جو خائف ہوئی ہو۔ بدستور مسکراتی رہی۔
"اس کا جواب تو ہے میرے پاس؟ مگر میں دوں گی نہیں۔ عقلمند ہیں تو خود سوچ لیں۔"
وہ مزے سے کہہ کر اندر جانے لگی تھی جب مستقیم نے جھپٹنے کے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی روکا۔ وہ پلٹ کر پھر اسی سکون سے اس کی آنکھوں میں تکنے لگی۔
"میں سمجھ سکتا ہوں تم قتل جیسے گناہ سے بچنا چاہتی ہو گی۔ مگر واضح رہے اس گناہ کو کیے بغیر تم اس مصیبت سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کر سکتیں۔"
وہ تنک کر کہہ رہا تھا۔ دیا نے گہرا طویل سانس بھر کے سر کو نفی میں جنبش دی۔
"اونہہ..... یہ وجہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا وجہ ہے؟ بتاؤ مجھے۔"
وہ ضبط کھو کر چیخ پڑا۔ رنگت پھر دہک کر انگارہ ہونے لگی۔ دیا اسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر لامحی... جھکا کر شرمگیں مسکان سمیت آہستگی سے بولی تھی۔
"شاید..... شاید..... مجھے اس دنیا میں آنے والے اپنے بچے کے باپ سے محبت ہو گئی ہے۔"
وہ جھینپتی تھی اور اپنا ہاتھ اس سے چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔ مستقیم اک پل کو ہونق اور بھونچکا ہوا۔ پھر لگا جیسے اس کے حلق میں کڑواہٹ بھر گئی تھی۔ وہ قہر ساماں تاثرات چہرے پر لیے تنتناتا ہوا اندر آیا تو دیا بستر پر بیٹھی تھی۔ ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں جنہیں وہ جان بوجھ کر جھلاتی تھی۔ ہونٹوں پر مسکان کی جھلک تھی اور آنکھوں میں کمال درجے کے سکون کی کیفیت۔ اس کا یہ رنگ ڈھنگ ہی نیا تھا۔ مستقیم کو مزید آگ لگ گئی۔
"جھوٹ بولتی ہو تم..... بکواس کرتی ہو۔"
وہ اس کے سر پہ پہنچ کر دھاڑا۔ مگر دیا نے مطلق جو پرواہ کی ہو۔ الٹا اسے تاؤ دلاتی نظروں سے دیکھ کر بالخصوص مسکرائی پھر گہرا سانس بھرا تھا۔
"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے اور بکواس کرنے کی؟ یاد کریں۔ آپ نے کتنی بار پوچھا تھا مجھ سے ماضی میں؟ اگر جھوٹ بولنا ہوتا تو تب بولتی۔ مگر مجھے ضرورت نہیں تھی۔ پھر آپ کو اب اعتراض کیوں ہے آخر؟ کیا میں محبت نہیں کر سکتی؟"
وہ کتنی معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر سوال پہ سوال کر رہی تھیں۔ جو مستقیم کو سراسر اداکاری محسوس ہوا۔ بھی جھنجلاہٹ اور جھلاہٹ سے بھر گیا تھا۔
"مجھے نہیں پتہ تم یہ رنگ ڈھنگ کیوں اپنا رہی ہو۔ مگر مجھے اس دھوکے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ کرو جو میں چاہتا ہوں۔"
اس نے غصے میں اس کا چہرا اپنے فولادی ہاتھ میں بھینچ کر ہذیانی انداز میں چلاتے ہوئے کہا تھا۔ دیا نے کوئی مزاحمت نہیں کی اپنا آپ اس سے چھڑانے کو۔ اسی سکون سے اسے تکتی رہی۔
تب مستقیم نے ہی جھنجلا کر اسے جھٹک دیا تھا اور خود زور زور سے پاؤں مارتا پھر باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

دیا کو قطعی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ ایسا کیا کرے کہ خلیفہ مستقیم اس کٹھن راہ سے واپس پلٹ آئے۔ کرنی بھی شفاف، جیکاتی فطرت تہہ در تہہ گناہ کے احساس سے دھندلائی گئی تھی اور برسوں کی

تربیت کے سارے رنگ وقتی مایوسی، قہر اور طیش کی بدولت ڈوب گئے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہ جان پائی اگر کل کمرے کی صفائی کے دوران مستقیم کی ذاتی ڈائری نہ اسے مل گئی ہوتی۔ اس میں کے وہ سارے دکھ رقم تھے جو اسے اصل اور صحیح راستے سے ہٹانے کا محرک بن گئے تھے۔ کچھ دیر کو تو دیا بھی دکھ کی شدتوں سے بالکل شل ہو کر رہ گئی تھی۔ صحیح معنوں میں اسے خلیفہ مستقیم پہ رحم آیا اور ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ اتنا قصوروار تو نہیں تھا جتنا وہ اسے سمجھتی تھی۔ بلکہ وہ اسے ظالم کی بجائے مظلوم لگنے لگا تھا۔

کچھ دیر وہ اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ رات کو بھی نہیں آیا تو دیا تشویش کا شکار ہوتی اسے کھوجتی دوسرے کمرے تک آ گئی تھی۔ وہ وہیں تھا۔ فرشی بستر پہ چت لیٹا، دونوں بازو آنکھوں پہ دھرے۔ دیا کو اس کا یہ لٹا پٹا انداز کچھ اور بھی پر ملال کر کے رکھ گیا۔

"مستقیم!"

اس نے اسے پکارا اور دروازے سے اندر آ گئی۔ مستقیم ذرا سا چونکا مگر نہ اسے دیکھا نہ جواب میں کچھ بولا۔ "آپ کمرے میں کیوں نہیں آئے؟ میں انتظار کر رہی تھی۔"

وہ اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ مستقیم نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر اسے سپاٹ نظروں سے دیکھا تھا۔

"میری مرضی۔"

انتظار والی اہم بات کا جواب اس نے دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ پلیز اٹھیں یہاں سے۔"

دیا نے اس کی رکھائی و بے اعتنائی کے جواب میں بھی ہمت ہارے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ مستقیم یکدم بہت غصے میں آ گیا تھا۔

"مجھے تنگ مت کرو دیا! جاؤ۔ تنہا چھوڑ دو مجھے۔"

اس کی آنکھیں تک برہمی کا تاثر لیے ہوئے تھیں۔ مگر دیا کے پاس اس کی بے پناہ محبت کا محفوظ تھا۔ جبھی نہ اعتماد کھویا نہ پزل ہوئی۔

"تو آپ نہیں آئیں گے؟"

وہ زبردستی اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں آؤں گا۔ کہہ دیا ناں۔"

وہ جواباً نروٹھے پن سے تڑخ کر بولا تھا۔ تب دیا نے کاندھے اچکائے اور خود بھی اس کے پہلو میں تکیہ سیدھی کر کے بیٹھ گئی۔

"اوکے ...... ایز یو وش جناب! پھر میں بھی یہیں رہتی ہوں۔ آپ کے ساتھ۔ آپ کے پاس۔"

اس کا انداز مگن تھا۔ متبسم تھا۔ مطمئن تھا۔ جبھی مستقیم جھٹکے سے اکھڑنے لگا۔

"فائن! پھر میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔"

وہ غصے میں کہتا جیسے ہی اٹھا۔ دیا نے بے ساختہ قسم کی گھبراہٹ کے ساتھ اس کی کلائی دونوں ہاتھوں میں جکڑ لی۔ اس کی گرفت میں بیتابی بھی تھی اور اضطراب بھی۔ استحقاق بھی تھا اور جوش بھی۔ اب یہ مستقیم پر تھا۔ وہ کس احساس اور جذبے کو تقویت دیتا تھا اور کس کو رد کر دیتا۔

"بھاگ رہے ہیں مجھ سے؟"

وہ مسکراہٹ دبائے کتنی شوخی سے سوال کر رہی تھی۔ مستقیم سلگ گیا۔

"تم سے نہیں۔ تمہارے جھوٹ سے۔"

دیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخیاں گہری ہو رہی تھیں۔

"جھوٹ ...... ؟ کون سا جھوٹ بولا ہے آپ سے میں نے؟"

وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔

"تم جانتی ہو۔"

وہ تلخی سے جواب دے کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

"کیا ثبوت ہے آپ کے پاس خلیفہ مستقیم صاحب کہ یہ جھوٹ ہی ہے۔"

وہ یکایک روہانسی ہو گئی تھی۔ جواب میں خلیفہ اسے اسی ناراضی سے گھورتا رہا۔

"آخر آپ خائف کیوں ہیں محبت سے؟"

"اس لیے کہ مجھے یہی جتلایا گیا ہے کہ محبت کے قابل نہیں ہوں۔"

خلیفہ کا لہجہ زہر سے بھرنے لگا۔ دیا نے سرد آہ بھری۔

"میں اتنا جانتی ہوں جو آپ کو پوری طرح جان جائے گا وہ آپ سے نفرت نہیں کر سکتا۔"

اس کے پر وثوق انداز پہ خلیفہ مستقیم ٹھٹک کر اسے تکنے لگا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کھوج تھی۔

"کیا مطلب؟"

اب کے وہ اسے کڑی نظروں سے گھورنے لگا۔ گویا حقیقت اگلوانا چاہی۔

"وہ...... اتفاقاً میں نے آپ کی ڈائری پڑھ لی ہے سارے حالات جانے ہیں تو آپ بے
قصور لگے مجھے۔"

اس وضاحت پر مستقیم یکدم دھیما پڑتا زہر بھری مسکراہٹ سے اسے تکنے لگا۔

"پھر تمہیں اسے ہمدردی کا نام دینا چاہیے تھا۔ محبت کا نہیں۔"

اس کی آنکھوں میں دکھ سے بھرا ہوا طنز چکنے لگا۔ دیا ایک دم سے لاجواب ہو گئی۔ مستقیم
ہونٹوں پر مجروح مسکان نے جگہ بنائی۔ گویا کہہ رہا ہو۔

"میں غلط تو نہیں سمجھ رہا تھا۔"

وہ اسے کچھ دیر یونہی تکتا رہا پھر اسی زخمی انداز میں مسکراتے ہوئے بے حد بھاری آواز میں
ہوا۔

نہ سماعتوں میں تپش گھلے
نہ نظر کو وقف عذاب کر
جو سنائی دے اسے چپ سکھا
جو دکھائی دے اسے خواب کر
میرے صبر پہ کوئی اجر کیوں؟
میری دوپہر پہ کوئی ابر کیوں
مجھے اوڑھنے دے اذیتیں
میری عادتیں نہ خراب کر

اس درجہ دل شکن الفاظ اور دل گیر انداز پہ دیا کی آنکھوں میں نمی بھرتی چلی گئی۔ وہ کچھ
کے فی الحال قابل نہیں رہ سکی تھی۔ کیسا المیہ تھا۔ اک بہترین انسان تباہ کر دیا گیا تھا۔ محض
ذاتی اور معمولی مفاد کے پیچھے۔ وہ یہ سوچ کر آزردہ ہوتی رہی کہ مستقیم کی احساس محرومی
اور دھوکے سے شکستہ شخصیت کو دوبارہ سے نکھارنا اور ان پیچیدہ راستوں سے ہٹا کر پھر سے
راہوں پر لانا ہرگز اتنا آسان نہیں۔ وہ جس دلدل میں پھنس گیا تھا اس سے نکلنا اگرچہ
مشکل بہت مشکل ضرور تھا اس نے ہونٹ زبان پھیر کر تر کیے اور ہمت کر کے پھر اسے
"آپ نے اپنی امی کو بھی ابھی تک معاف نہیں کیا؟"

مستقیم اس سوال پر چونکا پھر گہرا سرد سانس کھینچا تھا اور سر کو نفی میں جنبش دینے لگا۔

"نہیں...... وہ ایک وقتی احساس تھا۔ میں سمجھتا ہوں اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو شاید دنیا کی بری عورتوں کے ساتھ ساتھ میرا اچھی عورتوں سے بھی اعتبار اٹھ جاتا۔ آج تم بھی اس انداز میں میری زندگی میں شامل نہ ہوتیں۔ میرے لیے ہر عورت بے وفا ہوتی۔"

"شکر ہے۔ آپ کی سوچیں کسی حد تک تو مثبت ہیں۔"

اس کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اترا تھا۔ جبھی ہلکی پھلکی ہو کر مسکرائی۔ پھر اسے شرارت سے دیکھتے ہوئے دونوں کہنیاں اس کے سینے پر ٹکا کر اس پر جھک کر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شریر مسکان کے بولی تھی۔

"اچھا بتائیں۔ اگر کسی روٹھے ہوئے کو منانا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟"

مستقیم نے نظریں اٹھا کر اس کی ستاروں کی مانند چمکتی دمکتی آنکھوں کو دیکھا۔ کچھ دیر اسی سنجیدگی سے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ کہے بغیر اپنے جسم کو ایک دم جھٹکا دیا تھا۔ وہ بے توازن ہوئی اور پوری کی پوری اس کے اوپر آن گری۔

"ایسے...... بے حد نزدیک آ کر۔"

وہ محبت کرتا تھا۔ جبھی اتنی جلدی اتنی آسانی سے مان گیا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ محسوس کر کے زور سے ہنسا تھا اور اسے بازوؤں کے حصار میں جکڑ کر خود سے قریب کر گیا کہ دیا کی جھینپی ہوئی ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی تھی کہ اس نے جان لیا تھا کہ دل کی زمین ایک بار بنجر ہو جائے تو پھر کوئی موسم پھول کھلانے نہیں آتا۔ چاہے آنے والا وقت کتنی ہی مہربانیاں کرے۔ کوئی کتنی ہی دلداریاں کرے۔ دل میں جو جذبے مر جائیں۔ وہ پھر زندہ نہیں ہوتے اور دیا کو اسے اس کے دل کو مرنے سے بچانا تھا۔ اس لیے بھی کہ اس بھری دنیا میں صرف وہی تھا جو اس کا اپنا تھا۔ صرف وہی تھا جو اس کا سرمایہ تھا۔

"تھینک گاڈ! آپ کو یقین تو آیا میری بات کا۔ ورنہ میں سمجھ رہی تھی پتہ نہیں کتنی منتیں کرائیں۔"

دیا اس کے کاندھے پر سر رکھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی حجاب آمیز مسکان سے بولی تو مستقیم نے اسے نرمی اور کسی قدر خفگی سے گھور کر دیکھا۔

"اپنے جیسا کیوں سمجھتی تھیں مجھے؟"

جواب میں وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

"مان لیا جناب! آپ بہت اچھے ہیں۔"

"وہ تو میں ہوں۔"

مستقیم نے گردن اکڑا کر پورے اعتماد سے تعریف وصول کی تو دیا نے مسکراہٹ دبالی۔

"ہمیشہ ایسے ہی اچھے رہیے گا۔"

"ہمیشہ رہوں گا۔" اس نے سر تسلیم خم کیا۔

"ہمیشہ میرا اتنا ہی خیال بھی رکھنا ہے۔" اس کی مسکان گہری ہوئی۔

"ہمیشہ رکھوں گا۔" مستقیم مودب تھا۔

"کبھی بھی بدلیے گا نہیں۔" وہ اس کی ناک پیار سے دبا کر بولی۔

"ناممکن ...... کبھی نہیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" وہ ہنسا۔

"اس مان اور محبت میں کمی بھی نہیں آنی چاہیے سن لیں۔" اس نے بروقت اک اور عہد لیا۔

"بے فکر رہو۔ کبھی شکایت نہیں ہوگی۔" وہ پر یقین تھا۔

دیا نے مزید کچھ نہیں کہا مسکراتی رہی۔ خلیفہ نے اسے شرارتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"ہوگی حلف برداری کی تمام شرطیں پوری؟"

وہ جواباً ذرا سا کھسیائی اور گردن ہلا دی۔

"کیا میں بھی کوئی مطالبہ منوا سکتا ہوں ملکہ عالیہ سے؟"

"فی الحال تو اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتہ ہے آپ کے مطالبات عجیب و غریب ہوں گے۔"

اس کے ناک چڑھا کر نخوت سے کہنے پہ مستقیم کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"اف...... زوجہ تم بہت چالاک ہو۔ میں خوامخواہ تمہیں اب تک معصوم سمجھتا رہا۔"

اور جواباً وہ ہنسی کی جلترنگ بجاتی رہی اور مستقیم آسودگی بھری مسکان سے اسے تکتا رہا تھا۔

"آپ کو مطالبات منوانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ آپ کا ہر جائز حکم سر آنکھوں پر رکھوں گی مستقیم! میں اپنے فرائض پہچانتی ہوں۔ میری محبت بلا شرکت غیرے آپ کے نام ہے۔ میری وفاداری آپ سے منسوب ہو چکی۔ اس پوری دنیا میں صرف آپ خاص ہیں میرے لیے۔ بہت اہم۔ بتایئے کچھ اور بھی چاہیے آپ کو اس کے سوا؟"

وہ سوال کر رہی تھی اور مستقیم اس لوٹ لینے والے انداز پر فریفتہ تو ہو گیا تھا۔ وہ سر کو نفی میں ہلاتے شوخ انداز میں مسکراتا ہوا گنگنانے لگا۔

اس کے لب اور وفا کی قسم
واہ کیا قسم ہے خدا کی قسم

اس نے عقیدت بھرے انداز میں جھک کر دیا کے ہونٹوں پر مہکتا ہوا بوسہ ثبت کیا۔ دیا نے آنکھیں موند لیں۔ بیتاب، بے قرار دل کے اک کونے میں سہی مگر طمانیت کا احساس بہت گہرائی تک اتر آیا تھا۔ تن بدن میں ٹھنڈی آبشار کا جھرنا جاری ہو گیا۔ پہلی بار اسے اپنا آپ اس کے نزدیک اچھا لگا کہ دل میں یہ خیال پختہ ہو رہا تھا۔ وہ انمول تھی۔ پسند کی گئی تھی۔ چنی گئی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اسے خاص سمجھا تھا۔ اتنی اہمیت دی۔ اتنی محبت محسوس کی کہ اس کے بغیر رہنے کا تصور محال تھا۔ جبھی اپنی تکمیل کر لی۔ آنکھوں کی سوئیاں نکلیں تو نظروں کو وہ چہرا بھلا لگنے لگا۔ جس سے دل جانے کب چپکے سے اتنا مانوس ہو گیا تھا جس کی نظریں ہمیشہ اس کی بلائیں لیتیں اور واری صدقے جاتی رہی تھیں۔ جو کہتا تھا۔

"کیسے ممکن تھا کہ میں تمہیں دیکھتا اور تم سے پیار کیے بنا رہ جاتا۔ تم بنائی ہی چاہنے کے لیے گئی تھیں۔ تم بنائی ہی میرے لیے گئی تھیں۔"

جو کہتا تھا پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ۔

"تم مجھ سے محبت کرو گی۔"

"میری قربت میں رونے والی لڑکی اک دن آئے گا میری رفاقت میں بھرپور آسودہ بھی ہو گی۔" اور وہ جیت گیا تھا۔ اس کی خواہش تکمیل پا گئی تھی۔ اسے مستقیم کی باتیں اس کی قربت کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ تبدیلی جیسی بھی تھی۔ مگر بہت اچھی تھی۔ اس نے پہلی بار جانا من چاہے مرد کا لمس کتنا دل آویز، کس قدر ہوشربا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ متعدد بار پہلے بھی اس سے قریب ہوا تھا مگر دیا کبھی بھی یہ دل بہ باد کر دینے والی تباہ کن سنسنی خیز لہر بدن میں اترتی محسوس نہ کر سکی تھی۔ جو کیف آج فیروز مستقیم کے شائستہ جملوں نے اس کے ریشے ریشے میں سمو دیا تھا۔

"میں اپنی شادی کے دن نہیں، درحقیقت آج جیتا ہوں نا دیا! تمہارا دل میرا ہو گیا ہے۔ اس سے بڑی بھی کوئی کامیابی ہو سکتی ہے۔"

اس پہ جھک کر وہ اسے کتنی وارفتہ نظروں سے تکتا سرشار لہجے میں گویا ہوا تھا۔ دیا نے اس کی سانسوں کا حدت محسوس کیا تو ذرا سا کسمسائی۔ کتنے خوبصورت رنگ تھے اس کے چہرے پہ۔

حجاب، شرم، گھبراہٹ، حیا۔

اس کی شریانوں میں دوڑتے خون میں اک لذت آمیز حدت شامل ہوگئی۔

''کتنا شرماتی ہو تم۔''

وہ اس کے گال پر چٹکی بھر کے بولا۔ دیا نے جھینپ کر ہاتھوں میں چہرا چھپالیا۔ مستقیم اس

مجوب کیفیت پہ محظوظ ہوتا ہنستا چلا گیا۔ بہت طمانیت آمیز تھی اس کی ہنسی۔

☆......☆......☆

مستقیم اندر آیا تو اسے سر جھکائے بستر کی چادر کے ڈیزائن پہ بے خیالی میں انگلی پھیرتے و

اپنی ہی کسی سوچ میں گم پایا تھا۔ وہ اسے چونکانے کو دانستہ کھنکارا اور آگے بڑھ کر الماری کھول کر

گیا۔ لاکر کھول کر کچھ چیزیں الٹ پلٹ کیں پھر دوبارہ سے لاک لگا دیا۔ چابی جیب میں ڈا

تو اسے ہنوز اسی پوزیشن میں پا کر ٹھٹکا۔

''دیا! کیا سوچ رہی ہو؟''

اس نے بے حد ملائمت سے اس کا گال سہلایا تھا۔ دیا سر اٹھا کر کچھ دیر بے خیالی کی

رہی۔ پھر جیسے تھک کر گہرا سانس بھرا۔

''مستقیم! آپ کو نہیں لگتا کہ ہم ایک نارمل زندگی نہیں گزار رہے؟ رئیلی! مجھے تو بہت

ہونے لگی ہے۔''

وہ لمحہ بھر کو تھمی اور جیسے اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اپنی ہی بات کی وضاحت کے

اس سے اک اور سوال کر دیا تھا۔

''آپ کو اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی؟''

مستقیم کی آنکھیں یکدم ہی شرارت سے چمکنے لگیں۔ اس نے سرکونفی میں جنبش دی تھی۔

''پہلے ہوتی تھی۔ جب تک تم میرے پاس نہیں تھیں۔ اب میں مکمل طور پر آسودہ

ٹائم ہے بس بیچ میں، پھر ہمارا بچہ بھی ہوگا۔ کیا کمی رہے گی بھلا......''

اور دیا ایک دم جھینپ سی گئی۔ بات ہی ایسے ٹریک پر چلی گئی تھی کہ وہ نروس ہوئے بغیر

سکی۔ مستقیم بہت دلچسپ نظروں سے محظوظ ہو کر اس کی حیا سے لرزتی لانبی پلکیں اور گالوں کی سرخی

تھا۔

''میرا مقصد آپ کے دیگر رشتوں سے تھا مستقیم! آپ کی امی! اور...... اور ابو...... تم

مل تو سکتے ہیں نا؟''

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ زبان اس لیے لڑکھڑا گئی تھی کہ مستقیم کے نرم گداز تاثرات پتھریلی سنجیدگی میں ڈھل گئے تھے۔ کچھ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا کہ دیا نے سرعت سے اس کا مضبوط پر حدت ہاتھ اپنے نازک موی سفید ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''مستقیم آپ......''

''بہتر ہوگا دیا کہ ہم اس موضوع پر کبھی بات نہ کریں۔ مجھے امید رکھنی چاہیے کہ میری بیوی میرے لیے دانستہ اذیت کا سامان نہیں کرے گی۔ میرے ان زخموں کو نہیں کریدے گی جن پر بڑی مشکل سے کھرنڈ آسکے ہیں۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا اور دیا سر تھام کر بیٹھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

وہ بے وقت سوگئی تھی۔ جبھی رات کا کھانا تیار کرتے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ بریانی دم پہ لگا کر اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ کے کچھ دیر خود کو سکون کی کیفیت میں رکھنا چاہا۔ آج کل وہ کمزوری بہت محسوس کرنے لگی تھی۔ ذرا سا کام کر کے ہی تھک جاتی۔ اس وقت بھی کمر سیدھی کرنے کے خیال سے کمرے میں آئی تھی۔ مگر مستقیم کی تیاری دیکھ کر آرام سرے سے بھول گئی۔ اس کی جگہ تفکر اور اضطراب نے لے لی۔

''کہیں جا رہے ہیں آپ؟''

بلیک جینز شرٹ میں اس کا لمبا قد نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اتنا تو جانتی ہی تھی کہ جب وہ لوگ ڈاکے کی نیت سے نکلتے تھے تب ہی سیاہ لباس استعمال کرتے تھے۔ اس کا دل سینے میں دھڑ دھڑانے لگا۔ گویا آج وہ امتحان کی گھڑی آ گئی تھی۔ جس کا وہ خود بھی انتظار کر رہی تھی۔ جب اسے اپنے نام کا حق ادا کرنا تھا اور گھپ اندھیرے میں اپنی روشنی پھیلا کر اس غافل تاریکی کو دور کرنا تھا۔ اس نے کتنے الفاظ سوچے تھے۔ مستقیم کو سمجھانے، باز رکھنے کو۔ مگر اب وہ جیسے ایک دم خود کو بے دم سا محسوس کرنے لگی تھی۔

''تمہیں پتہ تو ہے۔ میری جان! پھر فائدہ ان سوالوں کا۔''

مستقیم مصروف رہ کر بولا۔ اس کا سارا دھیان اس وقت اپنے کام میں تھا۔ وہ ریوالور کے چیمبر میں گولیاں چیک کرنے کے بعد اسے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ رہا تھا۔ جب دیا نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پہ رکھا۔

"ایک بات مانیں گے؟"
وہ یکدم اس کے سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں کتنی آس تھی۔
"بولو جان!"
مستقیم نے مسکرا کر گویا اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔
"آج کہیں مت جائیں۔ میرے پاس رہیں پلیز!"
پہلا مرحلہ تو اسے روکنے کا تھا۔ وہ اگر رک جاتا تو سمجھا بھی سکتی تھی۔
"کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"
وہ ایک دم متفکر نظر آنے لگا۔
"ہوں، ٹھیک ہوں۔ بس رات کو تنہائی کے خیال سے بہت وحشت ہوئی ہے۔"
"تم دوا لے کر سو جانا۔ میں اتنے دنوں سے تمہارے ساتھ ہی تو تھا۔"
وہ ریلیکس ہوتے ہوئے اس کا گال نرمی سے سہلا کر محبت سے کہہ رہا تھا۔ دیا نے جواباً بے چین ہوتے ہوئے اسے دیکھا پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔
"میں ہمیشہ۔ ہر وقت آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں مستقیم!"
وہ اس کے بازو سے لگ کر لرزتی آواز میں بولی۔ مستقیم اس کے اندر کی کیفیت کے برعکس اس انداز دلربائی پہ نہال ہو کر رہ گیا تھا۔
"فکر کیوں کرتی ہو سویٹ ہارٹ! میں جہاں بھی چلا جاؤں۔ تمہارے پاس ہی ہوتا ہوں دیا! مگر دیکھو نا جانو! کام کو بھی تو وقت دینا ہوتا ہے نا۔"
وہ اسے بہلا رہا تھا۔ دیا سر کو اٹھا کر ملتجی نظروں سے اسے تکنے لگی۔
"آپ...... آپ یہ کام چھوڑ دیں پلیز مستقیم! میرے دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔"
اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ مستقیم خود بھی مضطرب ہوا۔
"یہ چھوڑ دوں تو پھر اور کیا کروں۔"
وہ زخمی انداز میں مسکرا کر سوال کر رہا تھا۔
"کچھ بھی...... کچھ بھی...... لیکن یہ نہیں...... پلیز...... پلیز مستقیم!"
وہ باقاعدہ رونے لگی۔ مستقیم کے اعصاب بری طرح سے کشیدہ ہوئے تھے۔ اس نے دیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر بٹھایا۔ جگ سے گلاس میں پانی نکال کر اس کے منہ سے لگایا جسے بیزاری

دیا نے پرے ہٹا دیا تھا۔ وہ بہت مضطرب ہو رہی تھی۔
"میں ایک ان دیکھے جال میں پھنس چکا ہوں دیا! اس سے چاہوں بھی تو رہائی ممکن نہیں۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔
"کچھ بھی ناممکن تو نہیں ہے مستقیم! آپ عہد تو کریں۔"
اس کے انداز میں بے چینی بیقراری تھی۔ مستقیم کے چہرے کے عضلات یکدم تن سے گئے تھے۔
"تم بیوقوف ہو۔ کچھ نہیں جانتیں۔"
اس نے سر جھٹک کر کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کی نسبت بابت اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ وہ اسے ڈانٹ کر اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"اس کا مطلب آپ میری بات نہیں مانیں گے۔"
دیا کے انداز میں قدرے خفگی کسی قدر مایوسی اتری۔ مستقیم نے کاندھے جھٹک دیئے۔
"مجبوری ہے بیوی! نہیں مان سکتا۔"
دیا چند لمحے صدمے سے ساکن ہو کر پوری آنکھیں کھولے اسے تکتی رہ گئی۔ جبکہ وہ اپنی تیاری کا آخری ٹچ دیتے ہوئے بلیک لیدر جیکٹ اٹھا کر پہننے کے بعد چہرے پر باندھنے والا سیاہ کپڑا جیب میں ٹھونس رہا تھا۔
"ٹھیک ہے۔ پھر مجھ سے بھی امید نہ رکھیے گا کہ میں کسی معاملے میں آپ سے تعاون کروں گی۔" وہ دہکتے کوئلے کی طرح چیخ کر کہتی بچوں کی طرح روٹھ گئی۔ مستقیم کو اس کے انداز سے بے تحاشہ ہنسی آنے لگی تھی۔
"نہ مانا...... میں زبردستی کر لیا کرتا ہوں تم جانتی ہو۔"
اس کا لہجہ ذومعنی تھا اور آنکھیں گستاخ۔ لبوں پر شریر مسکان تھی۔ جسے سمجھتی وہ بے ساختہ قسم کے حجاب کے زیر اثر بے تحاشہ سرخ پڑ گئی۔ مستقیم نے بہت دلچسپ نظروں سے اس کا یہ روپ دیکھا تھا پھر گہرا سانس بھر کے اس پر جھکا۔
"اپنا خیال رکھنا۔ میں واپس آ کے تمہیں منالوں گا۔ بہت پیارے انداز میں۔"
وہ اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں چوم کر ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ جبکہ دیا کا دل اپنی ناکامی پہ بری طرح سے بھر آیا تھا۔ گھٹنوں پر سر رکھ کے وہ بے آواز رو دی تھی۔

اس کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر کسلمندی سے یونہی لیٹی رہی۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بھرپور انگڑائی لیتے جیسے ہی اٹھنا چاہا نگاہ اپنے پہلو میں نیم دراز خلیفہ مستقیم سے جا ملی۔ جو لبوں کے درمیان سلگتا سگریٹ دابے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کے اس تصادم پہ بہت پیارے انداز میں مسکرایا۔ جس کا جواب دیئے بغیر وہ بے تاثر نظروں کا زاویہ بدل کر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے لانبے کھلے ریشمی بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹنے لگی۔

"السلام علیکم! صبح بخیر زندگی!"

وہ اس کی جانب سرکا اور اس کے سر پر بوسہ دیا۔ دیا کے دوپٹہ اٹھا کر شانے پر ڈالتے ہاتھ ساکن ہو گئے۔

"وعلیکم السلام!"

وہ جیسے بادل ناخواستہ بولی۔ مستقیم کی مسکان گہری ہوئی۔ اس نے سگریٹ بجھا دیا تھا۔

"کیسی ہو؟"

اس کی آنکھیں روشن اور شوخ تھیں۔ دیا نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا۔

"مجھے کیا ہونا ہے۔"

"یار تم بہت پریشان تھیں جب میں گیا۔ سارا دھیان تمہاری جانب لگا رہا۔"

"ہاں...... کاش یہ دھیان کسی نیکی کی جانب لگا ہوتا۔"

وہ نا چاہتے ہوئے بھی طنز کر گئی۔ مستقیم ہنستا چلا گیا۔

"تم سر تا پا نیکی ہو۔ اللہ کی بہت خوبصورت نعمت جو بس میرے لیے اتاری گئی۔"

اس کا لہجہ خوبصورت اور گھمبیر تھا۔ دیا کی آنکھیں جانے کس احساس کے تحت بھیگنے لگیں۔

"اگر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر بات کیوں نہیں مان لیتے؟"

وہ بے حد دکھ میں گھرنے لگی۔ مستقیم بھی سنجیدہ ہوا تھا۔

"میں کہہ چکا تھا کہ یہ ناپک......"

"آپ کے کہنے سے کیا اسے ختم ہو جانا چاہیے مستقیم! ہرگز نہیں۔ میں بار بار یہ بات کروں گی۔ میں آپ کو جہنم کا ایندھن بنتے کیسے دیکھ لوں؟"

وہ پھر سے رونے کی تیاری میں تھی۔ خلیفہ مستقیم عاجز نظر آنے لگا۔

"یار ابھی تو مانی تھیں تم۔ یعنی صحیح معنوں میں شادی شدہ زندگی کا لطف محسوس کیا تھا کہ تم نے

نئے مطالبات......"

"اگر آپ چند دن بعد میری بات مان لیں گے تو مجھے اعتراض نہیں۔ میں چھوڑ دیتی ہوں یہ۔"

اس کی نظریں سوال کر رہی تھیں۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا گویا اس موضوع پر بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔ نہ ہی سننا پسند کرتا تھا۔

"آپ بتائیں آپ کو میری بات ماننے میں کیا عار ہے؟ مستقیم ذرا سی ہمت ہی تو......"

"دیا! ہمارے تعلقات جیسے بھی تھے۔ چل رہے تھے نا۔ تم کیوں اک فضول مطالبہ لے کر اسے خراب کرنے پہ تل گئی ہو۔ میں ہر طرح کے حالات پہ سمجھوتہ اور صبر کر چکا ہوں۔ کسی بھی واپسی کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اٹس کلیئر...... بہتر ہے تم بھی اس چیپٹر کو کلوز کر دو۔"

اب کہ اس کا لہجہ سختی اور تنبیہ لیے ہوئے تھا۔ دیا کا چہرہ لمحہ بھر کو فق ہوا پھر وہ رخ پھیر گئی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر بستر سے اترنے لگی تو مستقیم نے اس کے دوپٹے کے پلو کو پکڑ لیا۔

"کیا میں امید رکھوں کہ ہمارے تعلقات خوشگوار رہیں گے؟"

اس کی آنکھوں میں سوال مچلتے دیکھ کر دیا نے سرد آہ بھری۔

"میں آپ کی جانب کا سفر اختیار کر کے آپ کے پاس آئی تھی مستقیم! فیصلہ تو اب آپ کو کرنا ہے جو بات طے ہے۔ میں اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ اسے دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ پھر وہ اس اہم بات کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی مگر اس وقت اس کے صدمے کی انتہا نہ رہی تھی جب رات کو اس نے پھر خلیفہ کو اس کی وہ مہم کی تیاری میں مگن دیکھا تھا۔

"آپ کہاں جائیں گے؟"

اس نے طے کیا تھا وہ اسے ازخود مخاطب نہیں کرے گی۔ مگر مجبوری ہی ایسی آپڑی تھی۔

"جہاں پہلے جاتے ہیں۔"

اس کا لہجہ بھی نروٹھا تھا۔

"لیکن ابھی کل ہی تو......"

اس کی سب بات محسوس کر کے خلیفہ مستقیم چڑانے والے انداز میں ہنسا۔

"ہم تو کل بھی جائیں گے پرسوں بھی اور اس سے اگلے دن بھی۔"

"بیشتر بتا رہا تھا تم نے کھانا نہیں کھایا۔ کیوں دیا!"

وہ واپس آیا تو سیدھا اس کے پاس آ کر استفسار کرنے لگا۔

"میں خود اس موضوع پر آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

وہ قدرے توقف سے بولی تو اس کی آواز ہنوز رندھی ہوئی تھی۔ مستقیم کی نگاہ اس کی آنکھوں کے چین کا شکار پپوٹوں پر گئی تو دل جیسے کسی نے مسل کے رکھ دیا تھا۔ وہ کہ اسے کیسے بتاتا وہ اسے روتے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا بات؟"

اس کے انداز میں استعجاب بھی تھا اور بیتابی بھی۔

"آپ نے میری بات نہیں مانی مستقیم! حالانکہ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ میں جائز اور حلال رزق کی متقاضی تھی۔ پہلے کی بات نہیں کروں گی۔ مگر اب میرا بچہ ہے میری کوکھ میں۔ اسے میں حرام پہ پروان نہیں چڑھانا چاہتی۔ حلال رزق حلال اور جائز زندگی اور عمل کی ضمانت بنا کرتا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟"

وہ رک کر اس کا سرخ چہرا تکنے لگی۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچے اور نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

"میں صرف اتنا سمجھتا ہوں دیا کہ تم مجھے ناجائز تنگ کر رہی ہو۔ میری مشکلات میں اضافہ کر رہی ہو اینڈ دیٹس آل!"

اس کا لہجہ شدید تھا۔ صاف لگتا تھا وہ اپنا غصہ بہت قابو کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"وہ صرف میرا بچہ نہیں ہے۔ آپ کی بھی اولاد ہے۔ یہ سوچنا آپ کا بھی کام ہے۔ مگر آپ کو احساس کہاں ہے۔ کیا بنانا چاہیں گے آپ اسے بتائیں؟"

دیا کے جواب پر مستقیم کا چہرا سرخ ہونے لگا۔ اس نے ایک بار پھر خود پر بہت ضبط کیا تھا۔

"چپ کر کے کھانا کھاؤ جا کے۔ دیا پلیز میرے حال پہ رحم کر لو کچھ۔"

وہ چبا کر کہہ رہا تھا۔ دیا دکھ میں مبتلا ہو کر ہنسی۔

"اگر میں کہوں کہ آپ مجھ پہ رحم کریں۔ اپنے بچے پر رحم کریں تو......"

"شٹ اپ! یا! میرا دماغ خراب نہ کرو تم..................۔"

وہ یکدم ضبط کھو کے دھاڑا اور اسی غصے میں اٹھ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ دیا ساکن بیٹھی اس کے اشتعال کو سوچتی اور ہولتی رہی تھی۔

دیا کی آنکھیں پھٹنے سی لگیں۔ وہ ساکن پلکیں لیے اسے عجیب نظروں سے تکتی رہی۔

"میری ضد میں؟ ہے نا؟"

اس کا خون کھولنے لگا۔ مستقیم نرمی سے مسکرایا اور سر نفی میں ہلایا تھا۔

"بدگمان نہیں ہوتے سوئٹی! اکچولی یہ سیزن ہے ہمارے کام کا۔"

"اس کام کے بھی سیزن ہوتے ہیں؟" وہ طنز اور غصے سے کہہ رہی تھی۔

"نہیں...... آج کل شادیوں کا سیزن ہے نا۔ اس لیے ہمارے کام کے بھی منتظ... ہیں۔ تب ہم یہی پس انداز کیا ہوا کھاتے ہیں اور مہینوں اپنے اس ٹھکانے سے باہر نہیں نکلتے۔"

وہ کتنے صلح جو انداز میں اسے تفصیلات فراہم کر رہا تھا۔ اس کے دکھ اس کی نظروں کی ... سرے سے نظر انداز کیے۔

"اگر آپ کی کوئی اپنی بہن نہیں ہے خلیفہ مستقیم تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم دوسروں ... بہنوں......"

اس کے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دینے پر دیا سلگتی ہوئی نظروں سے اسے تکنے لگی۔

"اللہ گواہ ہے میں نے کبھی کسی عورت کی عزت خراب نہیں کی۔" اس کا لہجہ تیکھا اور ترش ... دیا طنز سے ہنسنے لگی۔

"مگر ان کے گھر...... ان کی قسمیں ضرور خراب کی ہیں۔ شادیوں کے سیزن میں ڈاکہ ... ہے۔ واہ...... یعنی ان لڑکیوں کا جہیز اڑاتے ہو۔ شادی کیسے ہوتی ہوگی ان کی؟ کیا ان کے گھر ... دل بسنے سے پہلے نہیں اجڑ جاتے ہوں گے مستقیم!"

وہ ایک دم رونے لگی۔ مستقیم نے تھم کر مگر بے حد عاجز ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"دیا تم......"

"کچھ مت کہیں مستقیم! کچھ مت کہیے۔ بس سوچیے۔ غور کیجیے۔ شاید آپ کا دل لرز جائے ... آپ کو اس دکھ کا اندازہ ہو جائے جن سے وہ معصوم لڑکیاں اور ان کے بوڑھے والدین گزرتے ... گے جنہوں نے اپنے پیٹ کاٹ کاٹ کر بیٹیوں کے جہیز اکٹھے کیے تھے۔ جن کی آنکھوں سے ... عمر بھر کی نیندیں چھین کر انہیں آنسو بخش دیے۔"

وہ یونہی روتے ہوئے کہتی رہی تھی۔ مستقیم کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا ... رونے میں شدت آنے لگی تھی۔

ایک بار پھر وہ کامیاب اور شاداں فرحاں لوٹے تھے۔ مگر دیا کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اس کے خیال میں غلطی کرنا غلطی نہیں تھا۔ غلطی کو بار بار دانستہ دہرانا غلطی بلکہ گناہ عظیم تھا۔ مستقیم نے دانستہ نادانستہ جتنی بار بھی اسے مخاطب کیا وہ منہ سجائے اس کی ہر بات نظر انداز کر گئی۔ اس طریقے کو ناکام پا کر اس نے بات منوانے کا دوسرا طریقہ سوچا تھا۔ وہ سب کمرے میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ جب ہی وہ وہاں چلی آئی۔ وہ سب اسے دیکھ کر محتاط ہوئے اور ہنسی مذاق کا سلسلہ روک دیا۔ خلیفہ مستقیم ابھی اسے اس طرح سب کے بیچ پا کر قدرے حیران نظر آنے لگا تھا۔ اس وقت اس کی حیرانی اشتعال میں ڈھلنے لگی جب دیا نے اپنی انگلی میں موجود وہ اکلوتی انگوٹھی اتار کر امانت کے سامنے رکھی جس کے متعلق وہ مستقیم سے کئی مرتبہ اپنی جذباتی وابستگی ظاہر کر چکی تھی کہ یہ اسے بابا نے امتحان پاس کرنے پر تحفہ دی تھی۔

''مجھے آپ سے کام تھا امانت بھائی! پلیز اسے بیچ کر مجھے ایک کلہاڑی لا دیجیے گا۔''

اس مطالبے پر وہاں موجود سب ہی نفوس کے چہروں پر تحیر و استعجاب اتر آیا تھا۔ راجو تو باقاعدہ اچھولگا۔

''کلہاڑی......''

امانت نے ایسے تحیر کے زیر اثر سوال کیا جیسے سماعت نے دھوکہ دیا ہو۔ جبکہ مستقیم کے چہرے پر خطرناک سنجیدگی کا تاثر تھا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ اس کے شدید اشتعال کے گواہ تھے۔

''کیا کریں گی اس کا آپ؟''

اس کے سر کو اثبات میں جنبش دینے پر امانت نے جز بز ہو کے اگلا سوال کیا۔

''آج رات کو جب کھانا پکے تو اسے پہلے کسی کتے کو کھلا کر چیک ضرور کر لینا۔ ایسا نہ ہو محترمہ ہمیں نیند کی دوا ملا کر کھانے میں سلا دیں اور سوتے میں ہم سے ہی منگوائی کلہاڑی سے ہمارے گلے اتار ڈالیں۔''

راجو بے حد خصیلے موڈ میں بولا تھا۔ حسام بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ جبکہ باقی سب خاموش اور متفکر تھے۔ دیا نے سرخ چہرے کا رخ راجو کی جانب کیا اور جتلانے والے انداز میں پھنکار رہی تھی۔

''بے فکر رہیں۔ مجھے اگر ایسا کرنا ہوتا تو آلہ قتل آپ لوگوں سے منگوا کر ہرگز بھی شک میں نہ کرتی اور اطلاعاً عرض ہے کہ میں اس طرح کے متعدد مواقع پا کر بھی ایسا نہیں کر پائی تو اس کا مطلب واضح ہے کہ مجھے مجرموں کے درمیان رہ کر بھی گناہ و ثواب کے فرق اچھی طرح ازبر ہیں۔ الحمدللہ!''

اس کا لہجہ آپ ہی آپ طنزیہ ہو گیا تھا۔ انہیں ان کے شرمندگی کے احساس میں مبتلا چھوڑ کر وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی پلٹ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی خلیفہ مستقیم دندناتا ہوا اس کے سر پر آ کر سوار ہوا تھا۔

''کیا کرو گی تم اس کلہاڑی کا؟''

وہ آف موڈ کے ساتھ اس سے مخاطب تھا۔ مگر دیا نے اس کے موڈ کی پرواہ نہیں کی۔ وہ خود اس سے بہت خفا تھی۔

''جب کروں گی تو دیکھ لیجیے گا۔''

اس نے بے اعتنائی اور روکھائی کا مظاہرہ کیا۔

''بہرحال تم مجھ سے بھی کہہ سکتی تھیں۔''

وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ دیا نے اسے جواباً تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''میں آپ سے سخت خفا ہوں محترم! یاد رہے میں اب آپ سے ہرگز کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔''

وہ درشتی سے کہہ رہی تھی۔ مستقیم نے اسے گھورا تھا مگر وہ خائف نہیں ہوئی۔

''مقابلہ کرو گی میرا؟'' وہ غصے سے بھڑنے لگا۔

دیا کے کاندھے اچکانے نے مستقیم کو بالکل ہتھے سے اکھاڑ دیا تھا۔ اس نے دیا کا بازو پکڑا اور تقریباً گھسیٹ کر بستر پر پٹخ دیا۔

''ٹھیک ہے کرو میرا مقابلہ۔ میں دیکھتا ہوں کتنی کامیاب ہوتی ہو تم؟''

اس نے غراہٹ زدہ آواز میں کہا اور کھانے کی ٹرے اٹھا کر اس کے سامنے پٹخی۔

''زحمت کرو گی یا میں کھلاؤں؟''

''میں بھوک سے مر تو جاؤں گی مستقیم! مگر یہ حرام کا نوالہ نہیں لوں گی۔''

وہ جواباً چیخی اور ٹرے اٹھا کر پھینک دی۔ مستقیم اسے بیقراری سے روتا پا کر بے ساختہ ہونٹ بھینچ گیا۔

''کلہاڑی کیوں منگوائی ہے؟''

اس کا پست لہجہ گواہ تھا کہ وہ ایک بار پھر اس کے آنسوؤں کے آگے ہار گیا ہے۔

''کام کرنے کو۔ لکڑیاں کاٹوں گی جنگل میں۔ انہیں بیچوں گی، پھر ان سے حاصل شدہ رقم سے

اپنے لیے کھانے کا انتظام کروں گی۔ کیونکہ میں......"

اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ خلیفہ مستقیم جو اس کی بات حیرانی سے سن رہا تھا۔ حلق سے امڈنے والے قہقہے پر قابو نہ رکھ سکا۔

"تم...... یعنی تم لکڑیاں کاٹ کر بیچو گی پھر کچھ کھاؤ گی؟ یعنی اپنے زور بازو سے......؟"

بہ مشکل ہنسی روک کر وہ سرخ پڑتا ہوا بولا۔ دیا کا چہرا ہتک کے احساس سے دہکنے لگا۔ اس نے ہونٹوں کو باہم بھینچتے ہوئے سلگتی نظروں سے کچھ دیر اسے دیکھا تھا۔ پھر پھنکارنے کے انداز میں بولی۔

"آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا؟"

اس کا لہجہ بے حد غصیلا تھا۔ مستقیم بے اختیار گڑبڑایا۔ مگر صاف مصنوعی انداز تھا۔

"یار...... تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔ میرا کیا قصور اگر ہنسی آ گئی تو۔ اتنی دھان پان سی ہو اور عزائم......"

کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا وہ اس کی قہر بھری نظروں کو خود پر جمے پا کر بھی دوبارہ ہنسے گیا۔

"میرا وجود جتنا بھی کمزور اور نازک کیوں نہ ہو مسٹر مستقیم! مگر میرے ارادے بہت مضبوط ہیں۔ میں آپ کو ایسا کر کے دکھاؤں گی ان شاء اللہ! یہ طے ہے کہ میں جیتے جی اپنی اولاد کو حرام پر پروان چڑھا سکتی۔"

اس نے دو ٹوک اور قطعی انداز میں کہا تو مستقیم بھی قدرے سنجیدہ ہو گیا اور ہاتھ اٹھا کر درشتی سے بولا۔

"بس...... بہت ہو گیا مذاق۔ یہ کچھ دوائیں اور پھل ہیں۔ تمہیں ضرورت ہے۔ اچھی خوراک کی اور......"

"مگر میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ سنا نہیں آپ نے کہ میں اپنے بچے کی بنیاد حرام پہ نہیں رکھنا چاہتی۔"

وہ اس کی بات کاٹ کر چیخ پڑی۔ مستقیم کی صبیح پیشانی پر اک شکن نمودار ہوئی۔ اس نے دیا کے ہٹ دھرم اور ضدی انداز کو محسوس کیا تھا اور سرخ آنکھیں اس پر جما دیں۔

"اب تم جھگڑا کرو گی مجھ سے؟"

وہ جانتا تھا اس کی آنکھیں بہت پاورفل ہیں۔ وہ ان آنکھوں سے ہی اسے زیر کر رہا تھا۔

"میں نہیں...... آپ جھگڑا کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو فورس تو نہیں کیا ناں؟ آپ اپنی مرضی کے اگر مالک ہیں تو میں بھی اپنی مرضی کی مالک ہوں۔"

"یہ مشقت طلب کام ہمارے بچے کو نقصان پہنچا دے گا دیا! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ بری طرح زچ ہوا تھا۔

"تو ٹھیک ہے۔ آپ لائیں میرے لیے حلال رزق کما کر۔ نہیں کرتی میں مشقت طلب کام۔"

یہ فرمائش پہلے سے کڑی تھی۔ خلیفہ مستقیم کے دماغ میں خون ٹھوکریں مارنے لگا۔

شہر کے تھانوں میں میری تصویریں چسپاں ہیں۔ حلال رزق کمانے جاؤں تاکہ دیکھتے ہی گولی کا نشانہ بنا دیا جاؤں۔ یہی حکم ہے کوتوال کا میرے لیے۔ پھر خوش ہو جاؤ گی تم؟"

اس کا لہجہ بے حد طنزیہ تھا۔ دیا نے ہونٹ کچلنے شروع کر دیئے۔ آنکھیں پانیوں سے ڈبڈبا رہی تھیں۔ مستقیم کچھ دیر بے بسی سے اسے تکتا رہا پھر اسے شانوں سے تھام لیا۔

"پلیز......مت کرو مجھے تنگ۔ کھا لو کھانا۔"

دیا کی پلکوں سے شفاف موتی ٹوٹ کر بکھرے مگر اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ہونٹ بھینچے دوسری جانب تکتی رہی۔ صاف ظاہر تھا۔ یہ سودہ منظور نہیں تھا۔ مستقیم جھلانے لگا۔

"نہیں مانو گی؟"

خاصی تاخیر سے اس نے سوال کیا تھا۔ یوں جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔ دیا نے بھی فی الفور سر کو نفی میں ہلا دیا۔

"جہاں تک میری ذات کا سوال تھا خلیفہ مستقیم! میں نے خود پر جبر کر لیا۔ مگر اولاد کے بارے میں بھی کچھ روا نہیں ہوگا۔ یاد رکھیے گا۔ میں آپ کے ہر فیصلے سے یونہی ٹکرا جاؤں گی۔ پہلے تو مجھے اپنی عزت کا خوف پسپا کر گیا تھا۔ اب کیا کریں گے بھلا آپ؟ ماریں گے مجھے؟"

اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ اس سے پہلے کہ خلیفہ مستقیم جواب میں کوئی ردعمل ظاہر کرتا۔ امانت بدحواسی میں گرتا پڑتا اندر آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے جو اطلاع دی تھی۔ اسے سن کر خلیفہ مستقیم بھی تمام تر جگرے کے باوجود اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اب تو خواہش ہے یہ درد ایسا ملے — سانس لینے کی حسرت میں مر جائیں ہم
اب تو خواہش ہے یہ ایسی آندھی چلے — جس میں پتوں کی مانند بکھر جائیں ہم
اب تو خواہش ہے یہ دنیا والوں کا غم — ایسی ٹھوکر لگائے کہ جی نہ سکیں

ایسے الجھیں یہ سینے میں سانسیں کہ پھر
کوئی ہمدم نہ راہی نہ راحت ملے
اب تو خواہش ہے یہ
ہم سر بزم شمع کی مانند جلیں
چھوڑ جائیں دنیا کو چپ چاپ ہم
اب تو خواہش ہے یہ کہ سزا وہ ملے
جس میں سالوں تلک قید ہی قید ہو
بے وفائی وہاں پہ وہ ناپید ہو
اپنی ہی ذات کے کھوکھلے بھرم میں
روئے جاؤں تو چپ نہ کرائے کوئی

ہم دوا پینا چاہیں تو پی نہ سکیں
ایک پل کا سہارا نہ چاہت ملے
دشت ہی دشت ہو ننگے پاؤں چلیں
جس کو چاہیں اسے پھر نہ پائیں کبھی
دل پہ چاہیں تو پھر بھی نہ آئیں کبھی
کوئی صحرا، قلعہ یا بیابان ہو
اپنے خالق و مالک سے میں نے جو کی
ابن آدم کی چاہت کے کڑے جرم میں
اب تو خواہش ہے یہ کہ سزا وہ ملے
دور جنگل یا پھر کسی دشت میں
ہاتھ پکڑے میرا چھوڑ آئے کوئی

سجدے میں سر جھکائے وہ سسک سسک کر بے حال تھیں۔ برس ہا برس گزر گئے تھے۔ اک ہی دعا، اک ہی التجا کرتے ہوئے۔ ان کی فریاد کا محور و مرکز وہی تھا۔ جو روٹھ گیا تھا۔ جو گیا تھا تو لوٹ کر نہ آیا تھا۔ پچھتاوا تھا۔ بے انت پچھتاوا۔

ملال تھا۔ بے پایاں ملال۔

وہ کہاں سے گزرا وقت واپس لے آتیں۔ جب انہوں نے بھی اسے دھتکار دیا تھا۔

میرے اللہ!

میرے مولا!

میں تیری بے حد حقیر بندی ہوں۔ مجھے معافی کا اشارہ عطا فرما۔ مجھے دعا کی مقبولیت کی نوید بخش۔" تسلسل سے روتے ان کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ جب ان کے شانے پر عبدالماجد کے مہربان ہاتھ کا لمس اترا تھا۔

"بس کرو بیگم، حوصلہ کرو۔ اللہ سے شاکی نہ ہو۔ شاکر رہو۔ اللہ مہربانی فرمائے گا۔"

یہ وہی عبدالماجد تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ طنز کے ہی تیر برسائے تھے۔ جب بھی بات کی تھی لہجے میں بیزاری یا پھر سرد غراہٹیں ہوا کرتی تھیں۔ دیکھا جاتا تو بہت کڑی زندگی گزاری تھی ان کی بیگم نے۔ ہر لحہ خوف ہر گھڑی ہراس کے ہمراہ۔ کب کہاں کون سی بات ناگوار گزر جائے۔ مگر اب وہ

تبدیل ہو گئے تھے۔ زندگی بھر کی کمائی تھا وہ بیٹا! جسے خود انہوں نے دونوں ہاتھوں سے لٹا ڈالا۔ کبھی اولاد کی طرح چاہا ہی نہ تھا۔ لاڈ اٹھائے ہی نہیں تھے۔ ہمیشہ تیری کی نظر ہی سے دیکھا۔ پتہ نہیں کیا مزاج تھا ان کا کہ ہر وقت چڑتے رہتے۔ وہ ذرا سہما ہوا سا لڑکا انہیں کبھی خاص اور اہم لگا ہی نہیں تھا۔ مگر جب اسے کھو دیا۔ تب جیسے ایک دم سے خالی ہو گئے۔ خالی دامن

خالی ہاتھ

خالی دل

اور خالی گھر۔

تھا بھلا ان جیسا کوئی اور بھی تہی دست۔ کیسے کیسے ارمان جاگ اٹھے تھے۔ اس کا گھر بسانے اس کی اولاد کو کھلانے کے، خود اپنے ہاتھوں اپنا آشیانہ لٹا بیٹھے تھے۔ آہ...... ملال تھے صرف ملال جو ختم نہیں ہوتے تھے۔ خود اپنے پیروں پر بھی کوئی کلہاڑی مارتا ہے۔ عمر بھر کی کمائی اپنی جذباتیت اور وقت میں گنوا ڈالی۔ اس کی بے گناہی جس روز ثمرینہ کے حوالے سے ثابت ہوئی اس روز وہ خود سے بلک کر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔

وہ باپ ہو کر مجرم ثابت ہو گئے تھے اپنے بیٹے کے۔ باپ جو اولاد کی زندگی اس کی شخصیت کو تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انہوں نے کیا کیا تھا؟ اچھے بھلے معصوم فرشتے کو خود زبردستی گناہ کے راستے پر ڈال آئے اور سارے دروازے بند کر دیئے۔ پڑھے لکھے۔ باشعور، سمجھدار ہو کر بھی۔ وہ سوچتے اور اپنی گردن پر آہنی حلقہ محسوس کرنے لگتے۔ وہ کتنی ہستیوں کے خود کو مجرم پاتے تھے۔

سب سے بڑھ کر مالک قدرت کے کہ اس نے انہیں باپ بنایا وہ حق نہ ادا کر سکے۔

اپنے ملک کے جس سے اک معمار چھین لیا۔ اس کی جگہ اس پر ایک مجرم مسلط کر دیا۔ اپنی بیوی کے مجرم تھے اس کی عمر بھر کی کمائی چھین کر اس کی ممتا کو عذاب سے دوچار کر دیا تھا۔ خود خلیفہ مستقیم کے مجرم تھے اس کی معصومیت، سادگی اور نیکی چھین لی تھی۔

اب تو ایسا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا کہ وہ ازالہ کر سکتے۔ وہ لاچار تھے۔ بے بس تھے کہ چڑیاں کھیت چگ کر اڑ چکی تھیں۔ وہ ایسے دل برداشتہ تھے کہ کہیں جائے پناہ اور سکون نہ پا کر خدا سے لو لگا بیٹھے۔ اب دن رات ایک ہی التجا، ایک ہی گذارش۔ آنسوؤں کے نذرانے کے ساتھ مالک حقیقی کے حضور جھکتے اور کبھی نہ تھکتے ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے۔

"میں مجرم ہوں اس کا۔ اللہ بھی مجھے معاف نہ کرے گا اگر میں نے خلیفہ مستقیم سے معافی نہ

مانگی اور...... کہاں ڈھونڈوں میں مستقیم کو۔"

"نہیں...... آپ نہیں۔ مجرم تو میں ہوں اس کی، آپ کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ سے ایسا تو
ہرٹ تو وہ میری وجہ سے ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے؟ کیوں اسے یہ سب کہہ ڈالا۔" ان کے
رکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ لگتا ہے اللہ بھی ہم سے خفا ہو گیا ہے۔ کوئی دعا قبول ہوتی نظر نہیں
آئی۔"

وہ پھر سے مایوسی میں گھرنے لگے۔ بکھرنے لگے۔ حالانکہ مایوسی گناہ ہے۔ وہ بھی جانتے
تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

سلائی مشین کی گھر گھر کی آواز ایک تسلسل سے اس کے کانوں میں پڑتی تھی اور وہ مضطرب
کر کروٹوں پر کروٹیں بدلنے لگتا۔ حالانکہ ڈاکٹرز نے اسے سختی سے زیادہ حرکت کرنے سے منع کیا تھا۔
اس روز پولیس نے ان کے ٹھکانے پر ریڈ کیا تھا اور جب پولیس کے جوان ان کے گرد گھیرا تنگ کر
رہے تھے اور اس کے ساتھی بھرپور مزاحمت میں مصروف تھے۔ ایسے میں ان کا ماٹو مر جاؤ یا مار دو
کرتا ہے۔ وہ بھی اسی عزم سے لڑ رہے تھے اور گرفتاری نہ دینے کا تہیہ بھی تھا۔ فائرنگ کی آواز سے
پورا جنگل گونج رہا تھا۔ ایسے میں امانت کی ایک ہی رٹ تھی۔

"تم بھابی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ مستقیم! پلیز چلے جاؤ۔ اس بار بہت بھاری نفری سے
ریڈ ہوا ہے۔ کچھ نہیں بچے گا یہاں پر۔ سب تباہ ہو جائے گا۔"

"ہونے دو۔ میں نہ بزدل ہوں نہ کم ہمت۔ پھر کیوں میدان چھوڑ کر بھاگوں؟ اگر
لڑتے ہوئے تو مر جائیں گے مگر اک دوسرے کو مصیبت میں نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ اپنی گن اٹھاتے باہر کی جانب لپکا تھا کہ امانت نے اسے کمر سے دبوچ لیا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو مستقیم! ہم سب کا متفقہ فیصلہ ہے یہ کہ تم بھابی کو لے کر یہاں سے
گے۔ ہماری بات الگ ہے مگر تم اب اکیلے نہیں ہو۔ صرف بھابی نہیں ہیں۔ تم باپ بھی بننے والے
ذرا سوچو تو سہی مستقیم! اگر ہم مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے یا گرفتار ہو گئے۔ بھابی کا کیا ہوگا؟
پولیس کی کمینگی سے آگاہ ہو تم۔ یہ لڑکی اس سلوک کی مستحق نہیں ہے خلیفہ۔" وہ مسلسل اسے
تھا۔ مستقیم کو اس مقام پر آ کر چپ لگی۔ وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہوا تھا۔ امانت کی باتیں اپنی

درست تھیں۔ وہ دیا کو آج تک کچھ نہ دے سکا تھا۔ پھر اب اتنا بڑا اخراج تو مر کے بھی وصول نہ کرتا۔
دوسری جانب اپنے ساتھیوں کو بھی اس طرح چھوڑ کر جانا آسان نہ تھا۔

"اس طرح ٹائم ضائع مت کرو خلیفہ! جنگل کا پچھلا راستہ ابھی بالکل محفوظ ہے۔ تم اسی راستے
سے نکل جاؤ۔ ہماری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جیتے جی گرفتاری نہیں دیں گے اور ہو سکا تو یہاں
سے نکلنے کی کوشش بھی کر لیں گے۔"

اور مستقیم کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کڑے وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑنا پڑا تھا کہ اس نے
جس پل ہراساں و متوحش دیا کو دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں کی خاموش التجا کو رد کرنے کا حوصلہ نہیں کر
سکا۔ اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی بے بسی کی صورت پھیل رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دیا کے سامنے
اپنا ہاتھ پھیلایا تو دیا نے بخوشی اسے اپنا ہاتھ تھما دیا تھا۔

☆......☆......☆

مستقیم اپنا حلیہ یکسر تبدیل کر چکا تھا۔ شلوار قمیص کی جگہ جینز شرٹ نے لے لی۔ داڑھی مونچھ
صاف کرا کے وہ اب کلین شیو تھا۔ آرمی کٹ نے اسے بالکل بدلا ہوا روپ دیا تھا۔ جو پہلے سے کہیں
بڑھ کے دلکشی اور خوبروئی رکھتا تھا۔ اس کے باوجود اسے پہچان لیے جانے کا دھڑکا ہر دم ستایا کرتا۔

یہ ایک غیر معروف سا قصبہ تھا۔ جس مکان کو اس نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ وہ بستی سے بہت
الگ تھلگ تھا۔ اطراف میں وسیع کھیتوں اور باغات کے سلسلے تھے۔ اور سامنے درختوں کے درمیان
گھری بہتی ہوئی نہر۔ مستقیم کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس کڑے وقت میں بھی اس نے آتے
ہوئے افراتفری میں سبھی نوٹوں کی کئی گڈیاں اٹھا کر اپنے لباس میں چھپالی تھیں۔ اس کا اسی پیسے پر
عیش کرنے کا ارادہ تھا مگر اک دیا کی ضد بھی تو تھی۔ جس کے آگے بالآخر ہار کر وہ اس روز کسی کام کے
ارادے سے نکلا تھا کہ روڈ کراس کرتے ہوئے اس کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس کا بازو اور
دائیں ٹانگ بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

چار دن ہسپتال میں گزار کر وہ گھر آیا تو دیا کو اس نے یکسر بدلے ہوئے روپ میں پایا تھا۔

"تم تو سخت مایوس ہوئی ہو گی ہے نا؟ میں مرتے مرتے پھر زندہ بچ گیا۔ جان ہی نہیں چھوٹ
رہی تمہاری۔ اوپر سے رہی سہی کسر میری اس معذوری نے پوری کر دی۔"

وہ اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہی تھی جب مستقیم نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا۔ دیا کے دل پہ
جیسے گھونسہ لگا تھا۔ آنکھوں میں کرب کے باعث نمی پھیل گئی۔ اس نے زخمی نظروں سے مستقیم کو دیکھا

اور سوپ کا پیالہ سائیڈ پر رکھ دیا۔

"اس کا مطلب آپ ابھی تک مجھے نہیں سمجھے مستقیم!"

وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے کتنے پیار سے اس کا منہ صاف کر رہی تھی۔ انداز کی دلربائی پر کوئی اور وقت ہوتا تو لازماً وہ فدا ہوتا مگر ان دنوں وہ ہر وقت جھلایا رہتا تھا۔

"میں نے کسی کو بھی کچھ نہیں سمجھا۔ ساری زندگی بس میں نے جھک ماری ہے۔ تمہیں پتہ ہے راجو پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ حسام پولیس کی حراست میں ہے اور امانت کا کچھ پتہ نہیں۔ زندہ یا مر گیا۔ اور پولیس کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتی پھرتی ہے۔ اس پر تمہاری ضد کہ میں محنت کی روزی کما کر تمہیں کھلاؤں۔ کیسے؟ میرا تو سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔"

وہ جھلا کر بولتا بلکہ اسے اور خود کو کوستا چلا گیا۔ دیا نے اسے نہیں ٹوکا۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی اس کا غبار نکل جائے۔

"فی الحال آپ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہیں مستقیم! ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میں نے یہاں کی خواتین سے سلائی کی بات کی ہے۔ دراصل شہر کی بوتیک کا کام ملتا ہے اجرت پر کرنے کو۔ میں بھی یہی کام کروں گی۔ دادی غلط نہیں کہتی تھیں۔ ان کی دور اندیشی آج میرے کام آ رہی ہے۔ ہاتھ میں ہنر ہے۔ میں اسی ہنر کو روزی کا وسیلہ بناؤں گی۔ باقی رزق کا وعدہ تو اللہ سوہنے کا ہے ہی۔ آپ ریلیکس رہیے۔ کہ میں اب آپ سے خفا نہیں بلکہ خوش ہوں اس تعاون پر۔ شکایتیں مجھے پہلے تھیں آپ سے۔ اب بالکل نہیں۔ میں تھکنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے ہمت بھی نہیں ہارنی۔ بس مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔ دیں گے میرا ساتھ؟"

اس نے بات کے اختتام پر آس مندانہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ مستقیم کچھ دیر یونہی اسے تکتا رہا۔ پھر بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ چہرے کا رخ پھیر لیا۔ دیا کے چہرے پر تاریک سایہ ضرور لہرایا مگر وہ ہمت نہ ہارنے، ہار تسلیم نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

☆......☆......☆

دیا کا مستقیم کی زندگی میں آنا ازل سے طے شدہ امر تھا۔ وہ تو ایک بھٹکے ہوئے راہی کو راہ پر لانے کا وسیلہ بنائی گئی تھی۔ جبھی اس بات کو سمجھ لینے کے بعد بڑی استقامت سے حالات کے سامنے ڈٹ گئی۔ وہ نازک کچلتی ڈھال جیسی لڑکی جو پہلی مرتبہ تخلیق کا مرحلہ طے کر رہی تھی۔ جسے اللہ نے مشکل راستے کا راہی بنانے سے قبل ہی مضبوط حوصلے عطا کر دیے تھے۔ باقاعدہ اسے اس پراسس سے گزارا

تھا اور ہمت و ظرف سے نواز کر مقصد سامنے رکھ دیا۔ مگر وہ تو ان باتوں سے نابلد تھا۔ جبھی اس کے رویوں پر حیران ہوا کرتا۔ اس روز بھی وہ سلائی کا کام نپٹا کر سبزی کی ٹوکری اٹھائے اس کے پاس آ بیٹھی تھی جب وہ اسے دیکھ کر عجیب سے دکھ کا شکار ہو گیا تھا۔

"مجھے اکثر اپنی خود غرضانہ سوچ پر ندامت ہونے لگی ہے دیا! کن جوکھوں میں ڈال دیا ہے میں نے تمہیں۔ ملال تو ہوگا تمہیں بھی۔"

اور جواباً وہ کتنی سادگی سے کس قدر رشا کر انداز میں مسکرائی تھی۔

"میں تقدیر سے شاکی نہیں ہوں مستقیم! میں جانتی ہوں تقدیر اٹل ہوا کرتی ہے۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آزمائش میں مبتلا کیے جانے والے اللہ کے مقرب اور پسندیدہ، اس لحاظ سے میں تو خوش نصیب ہوں۔ میں نے اس بات کو ذرا دیر سے ضرور جانا مگر جب جان لیا تو مانتے ہی صبر بھی آ گیا اور طاقت بھی۔ میں جان گئی ہوں میرے رونے پیٹنے سے یا غمزدہ رہنے سے حالات بدل نہیں سکتے۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہے۔ دادی کہا کرتی ہیں جو آزمایا گیا وہ خاص ہوا۔ میں بھی آزمائی گئی تھی۔ یہ میرا امتحان ہے تو میں اس میں کامیابی کی کوشش کیوں نہ کروں؟ لیکن مستقیم! میں پھر کہوں گی۔ مجھے آپ کا ساتھ، آپ کا تعاون درکار ہے۔ وعدہ کریں مجھ سے کہ ہم جیسے بھی حالات ہوں مگر اپنے بچوں کو رزق حلال سے ہی پروان چڑھائیں گے۔ انہیں ملک و قوم کے معمار بنانا ہماری ذمہ داری ہے۔ انہیں اللہ کے نائب بنانے کے لیے کوشش اور دعا کرنا ہماری اہم ترین ذمہ داری۔ وعدہ کریں مستقیم!" اس کی خوش نما آنکھوں میں کتنے ہی جھلمل کرتے خواب سجے تھے۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کیا وہ ان آنکھوں کو خوابوں سے خالی کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا؟ یقیناً نہیں۔"

جبکہ وہ اسے خاموش اور گم صم پا کر پھر سے کہہ رہی تھی۔

"ضروری تھوڑی ہے مستقیم! اگر دنیا یا دنیا کے چند فرد ہمارے ساتھ برائی کریں تو ہم بھی برائی پر ہی اتر آئیں۔ اس طرح تو ہر طرف برائی کا ہی راج ہو جائے گا۔ جبکہ رب کا حکم اچھائی کو پھیلانے اور برائی کو روکنے کا ہے۔"

وہ پھر آس بھری جواب طلب نظروں سے اسے تک رہی تھی۔ مستقیم نے بوجھل سانس کھینچا پھر سر کو اثبات میں جنبش دینے لگا۔

"میری اولین خواہش زندگی کے ہر راستے پر تمہارے ہم قدم چلنے کی ہے دیا! میں تمہیں خفا نہیں کرنا چاہتا مگر یہ لوگ، یہ معاشرہ، نہ تو کبھی میرے عیب ڈھکے گا، نہ مجھے زندگی کو نئے سرے سے شروع

کرتے دیکھ سکے گا۔ تم نہیں جانتیں یہ......"

"آپ ایک بار عہد تو کریں مستقیم! ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم واپس چلیں گے۔ آپ کے امی ابو کے پاس۔ میرے بابا اور امی سے بھی ملیں گے۔ آپ کو پتہ ہے؟ اللہ اگر کسی آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو حوصلہ اور ہمت بھی عطا فرماتا ہے۔"

وہ اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے اس کی اک ہاں کی ہی تو منتظر تھی۔ مستقیم نے سرد آہ بھری۔

"واپسی کا سفر ہمیشہ تکلیف دہ ہو یہ ضروری تو نہیں۔ اگر واپسی اس طرف ہو جہاں لوگ چوکھٹ پر چراغ جلائے آپ کے منتظر ہوں، تو واپسی کیسی آسودگی سے بھرپور ہو سکتی ہے ذرا سوچیں مستقیم!"

وہ ایک کے بعد ایک آس کا جگنو اس کی مٹھی میں تھما رہی تھی۔ مستقیم کو اعتراف کرنا پڑا اس لڑکی کو دل جیتنا ہی نہیں قائل کرنا بھی آتا تھا۔ وہ بھی قائل ہونے لگا۔

واپسی کا یہ سفر بہت تکلیف دہ ہوگا۔ بہت پرپیچ اور کٹھن۔ مگر میں اسے اختیار کرنے کی کوشش اس لیے بھی کروں گا کہ اس کی منزل بہت پرکشش ہے۔ میں گناہ کے راستوں پر چلتے بہت تھک گیا ہوں دیا! اب اندھیروں سے روشنی میں آنے کی خواہش ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ گمراہی کے اس دور میں میرا ضمیر کبھی بھی مطمئن نہیں ہو سکا۔ اور یہ بھی کہ...... مجھے ان آنکھوں کی روشنی سے بہت محبت ہے۔ اور میں انہیں ہمیشہ روشن ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس نے جھک کر کہتے اسی محبت و اپنائیت بھری عقیدت سے اس کی آنکھوں کو چوم کر یہ سرگوشی اس کی سماعتوں میں انڈیلی تھی اور مسکرا دیا تھا۔ دیا کے اندر ڈھیروں ڈھیر آسودگی اتر آئی تھی۔ دادی نے کہا تھا۔ اگر وفا کرنی ہو تو ندی کنارے لگی گھاس کی طرح کرو۔ کہیں کوئی ڈوبتا ہوا اس کا سہارا لے تو وہ اس کو بچا لیتی ہے۔ یا پھر خود بھی کنارے سے ناطہ توڑ کر اس کے ساتھ ڈوب جاتی ہے۔ حالات نے اسے ندی کے کنارے لگی گھاس کی طرح بنا دیا تھا۔ وہ کم ہمت تھی۔ ناتواں تھی۔ مگر نڈر تھی۔ اللہ نے اسے مستقیم کو بچانے کا ذریعہ بنایا تھا۔ وہ اپنی کامیابی پر سجدۂ شکر بجا لانے کو اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کامیابی جو اس کے رب کی ہی بخشی ہوئی تھی۔ پھر شکرانہ تو اس پہ واجب تھا نا۔

☆......☆......☆

"نہیں بس...... اور نہیں۔"

وہ اسے اپنے ہاتھ سے سوپ پلا رہی تھی، جب دوسرے چمچ پر ہی مستقیم نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ وہ حیران رہ گئی تھی۔

"اتنا تھوڑا سا کیوں؟"

"بس دل نہیں چاہ رہا۔"

وہ معمول سے کچھ خاموش اور گم صم لگا تھا دیا کو۔ جبھی تشویش کا رنگ اس کی آنکھوں میں اترنے لگا۔

"دل کیوں نہیں چاہ رہا؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟ درد تو نہیں ہو رہی؟"

اس کا ماتھا چھوتی وہ فکرمند نظر آنے لگی۔ مستقیم آہستگی سے مسکرانے لگا۔

"بالکل ٹھیک ہوں دیا! کیوں اتنی پریشان ہو جایا کرتی ہو یار۔"

دیا جواب میں کچھ کہے بغیر اسے ایسی نظروں سے تکتی رہی جیسے جاننا چاہتی ہو وہ سچ بھی کہہ رہا ہے کہ صرف بہلانے کی کوشش ہے۔ مستقیم نے گہرا سانس بھرا۔

"اک بات ہمیشہ کے لیے نوٹ کر لو پیاری لڑکی! تم سے نہ پہلے کبھی جھوٹ بولا۔ نہ بولوں گا۔"

تسلی کا یہ انداز بہت انوکھا اور دل موہ لیتا ہوا تھا۔ وہ ہلکی پھلکی ہونے لگی۔

"دادی کہتی ہیں مرد عموماً جھوٹ اس وقت بولتا ہے جب اس کی زندگی میں بیوی کے علاوہ کوئی دوسری عورت آتی ہے۔"

وہ مسکراہٹ دبائے کہہ رہی تھی۔ مستقیم نے کاندھے اچکا دیے۔

"پھر تو تمہیں ہمیشہ کو بے فکر ہو جانا چاہیے۔ مجھے دیا کے بعد زندگی میں مزید کوئی خواہش نہیں۔"

"واقعی؟"

وہ مصنوعی انداز میں آنکھیں پھیلا کر بولی تو مستقیم اسے گھورنے لگا۔

"دیا کو ہی اتنی مشکل سے قابو کیا ہے۔ ویسے بھی کوئی اور لڑکی کسی ڈاکو کو کیوں پسند کرنے لگی۔"

"یہاں اس ایریئے میں ہر سمت آپ کے حُسن و جمال کی دھوم مچ گئی ہے حضرت! لڑکیاں آپ کو دیکھ کے بیہوش کیا ہی کم سمجھتی ہوں گی۔"

دیا کی فراہم کردہ اطلاع جو اسے سلائی سینٹر سے کپڑے لاتے لے جاتے سننے کو ملی تھیں اس سے سنتے رہی تو مستقیم کھسیا کر ہنس پڑا تھا۔

"لڑکیاں تو بیوقوف ہوتی ہیں۔ ویسے تمہیں جیلسی ہوئی؟" وہ اسے جانچتی نظروں سے تکنے لگا۔

"توبہ...... بالکل بھی نہیں۔ بلکہ سچ پوچھیں تو فخر محسوس ہوا۔ آخر میرے ہزبینڈ کی تعریفیں ہو

رہی تھیں۔"

اس کا انداز شوخ تھا۔ چہرے پر جگمگاہٹ۔ مستقیم اسے دیکھے گیا۔

"کیا انہیں پتہ تھی یہ بات کہ ہمارا کیا ریلیشن ہے؟"

"نہیں..... لیکن جب میں نے بتایا تب ان سب کی آنکھوں میں عجیب سا رشک اور حسد [illegible] آیا تھا۔"

"عجیب بات ہے۔ وہ تمہاری تعریف نہیں کر رہی تھیں؟ مجھے کب دیکھ لیا؟" وہ الجھا۔

"بہت شروع میں۔ آپ کے ایکسیڈنٹ سے پہلے دیکھا تھا ان لوگوں نے آپ کو آتے جاتے اور اک راز کی بات بھی سن لیں۔ لڑکیاں کبھی دوسری لڑکی کی تعریف نہیں کرتیں۔ بس یہ بھی [illegible] نفسیاتی خرابی ہوتی ہے۔ پتہ ہے ذیشان اور لائبہ جب ایف ایم سنا کرتے تھے تو ذیشان فی میل [illegible] جے کی آواز کی تعریف کیا کرتا اور لائبہ کو میل کی آواز پسند آتی۔ اک بار لائبہ کہنے لگی۔ بجو یہ کیا [illegible] ہے بھلا؟ لڑکیوں کو لڑکوں میں جبکہ لڑکوں کو لڑکیوں میں اٹریکشن کیوں محسوس ہوتی ہے۔ میں اس کی بات سن کر بہت ہنسی تھی۔ یہ تو فطری طور پر ہوتا ہے نا۔ اللہ پاک نے مخالف جنس میں کشش رکھ کے ساتھ ہی گناہ وثواب کے راستے بھی کھول کر الگ بتا دیئے جو پرہیز گاری اختیار کرے گا۔ وہی [illegible] پانے والا ہے۔"

اس نے اپنی بات مکمل کی اور پھر اسے سوپ پلانا چاہا۔ مستقیم نے پھر ہاتھ سے منع کیا تھا۔

"لیں نا۔ کیا ذائقہ اچھا نہیں بن سکا۔"

اس نے اصرار کرتے ہوئے کسی خیال کے تحت پوچھا پھر مستقیم کے جواب کا انتظار کیے [illegible] چکھا۔

"تم نے میرا جھوٹا کیوں پی لیا بھلا؟ اگر محبت ہو گئی تو......؟"

مستقیم نے ٹوکا تھا پھر شرارت سے ہنسنے لگا۔

"اب کیسا خوف۔ ہو تو چکی جتنی گہری ہو گی اب تو اتنا ہی فائدہ مند ثابت ہو گی۔"

کچھ دیر اسے ہنستے ہوئے دیا نے بہت روشن اور محبت آمیز نظر سے تکنے کے بعد جو [illegible] وہ مستقیم کے اندر دور تک گلاب مہکاتا چلا گیا تھا۔ دیا کی ایسی باتیں ہی اس کے لیے تو اوٹی [illegible] کی ڈور ثابت ہوا کرتی تھیں۔ وہ صرف کہتی نہیں تھی۔ اپنے عمل سے بھی ہر چیز ثابت کر کے [illegible] ان کڑے حالات میں اس نے اپنی عمر، اپنی ہمت اور حوصلے سے بہت زیادہ ظرف کا مظاہرہ [illegible]

اپنے نازک وجود سمیت جب اسے سہارا دیتی تو خود مستقیم شرمندہ ہونے لگتا۔ وہ خود محنت کر کے کماتی تھی۔ پھر کھانا بناتی۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتی۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرتی۔ گھر کے اور سو کام۔ اس کے باوجود اسے ہر دم مستقیم کا دھیان رہتا تھا۔ مستقیم نے پڑھا تھا۔

"مرد کی محبت میں اگر حلیمی ہو اور تحمل کے ساتھ نرماہٹ ہو تو اکھڑی اور متنفر عورت بھی اس کے پیروں کی دھول بننے سے نہیں ہچکچاتی۔ اس کی انا ریت کی دیوار کی مانند مرد کے پیروں تلے ڈھیر ہو جاتی ہے کہ اسے اپنی ہار پر دکھ، افسوس یا پچھتاوا نہیں ہوتا۔ بلکہ اک طمانیت آمیز مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اس کا دل بہت وسیع ہو جاتا ہے کہ مرد کی فتح اسے اپنی شکست سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ عورت کا تقاضا تو فقط اتنا ہے کہ پہل مرد کی جانب سے ہو۔ تا کہ اس کے نسوانی وقار کو دھچکا نہ لگے۔ کیا محبت کرنے والا مرد اتنی گنجائش نہیں رکھتا کہ اسے یہ تحفظ دے سکے۔ اسے ہر دھچکا پہنچائے بغیر سمیٹ لے۔"

اس نے پہل کی تھی۔ اس نے عمل نیک کا بیج بویا تھا انجانے میں سہی۔ مگر اب وہ صلہ پا رہا تھا۔ کل جب دیا اس کے پیروں میں بیٹھی اس کی انگلیوں کا مساج اتنے دھیان سے کر رہی تھی تو مستقیم نے ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"ایسے کام تم نہ کیا کرو دیا! مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

وہ کتنا زود رنج ہو رہا تھا۔ دیا نے اسے دھیان سے دیکھا تھا۔ کیفیت کو سمجھا اور محسوس کیا تھا پھر نرمی سے مسکرانے لگی تھی۔

"مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ آپ کی خدمت کرنا۔ بلکہ خوشی ہوتی ہے۔ مستقیم! میں چاہتی ہوں آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں۔ پھر آپ کام پر جایا کریں۔ میں آپ کا انتظار کیا کروں۔ جب آپ آ جائیں تو۔"

اس کی آنکھوں میں کتنے خواب تھے۔ کتنے رنگ تھے۔ وہ ان خوابوں کی تعبیر اسے بخشنا چاہتا تھا مگر اسے لگتا وہ ہار جائے گا۔ دیا تھک جائے گی۔

"تم کبھی پچھتاؤ گی تو نہیں دیا!"

"مشرقی عورت ایک بار شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ محبت بھی ایک بار کرتی ہے۔ مستقیم میں دونوں کام کر چکی۔ پچھتانے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"لیکن تمہاری شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔"

وہ جتلا رہا تھا یا پھر اس سے کچھ حوصلہ افزائی کر خود کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت معذوری کے پیریڈ سے گزر رہا تھا۔ چڑچڑاہٹ اس کے مزاج کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ حساس اور زود رنج بھی ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھار تو دیا کو وہ بالکل کسی بچے کی طرح لگتا۔ شاکی، خفا اور بیزار روٹھا ہوا۔ جو منانے لاڈ اٹھوانے کو یہ ساری حرکتیں کیا کرتا ہے۔ وہ اس کو منانے بیٹھ جاتی۔ کسی ماں کی طرح سے اس کے نخرے برداشت کرتی اور لاڈ اٹھائے جاتی۔ وہ کبھی اس سے بیزار نہیں ہوتی تھی۔ وہ کبھی اس سے اکتاتی نہیں تھی۔ بسا اوقات وہ خود حیران ہونے لگتی۔ یہ خود وہی تھی جسے مستقیم سے چڑ تھی۔ اس کی محبت سے نفرت تھی۔ مگر اب خود محبت کی تھی تو مستقیم کی ہر ادا پر پیار آتا تھا۔ غصہ کیا ہوتا ہے اسے بھول بھال گیا تھا۔ اس کے لیے سب کچھ یہی شخص قرار پا گیا۔ آنکھوں کی روشنی سے لے کر دل کے قرار تک، وہ اللہ کی شکر گزار تھی۔ جس نے اس کو محبت کا انمول خزانہ عطا فرمایا تھا۔ محبت کے بغیر یہ راستہ کتنا دشوار گزار ہوتا۔

"بالکل ہوئی تھی مرضی کے خلاف۔ مگر کروانے والا اتنا پاورفل تھا کہ اپنی منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے سامنے میری اوقات ہی کیا جو انکار کر جاتی۔"

اس کے جذبات اپنے رب کے لیے ایسے ہی عقیدت مندانہ ہوا کرتے تھے کہ مستقیم مبہوت رہ جایا کرتا۔

"آپ کو یاد ہے مستقیم! آپ نے کہا تھا۔

میری آنکھوں کے جادو سے شاید تم ناواقف ہو
جس پر مجھ کو پیار آ جائے، اس کو پاگل کر دیتا ہوں
چھوڑ کے مجھ کو جانے والا لوٹ کے واپس آئے گا
دائیں بائیں آگے لگا کر آگے جنگل کر دیتا ہوں

اس کی مسکان گہری ہو رہی تھی۔ اس نے مستقیم کی حیران آنکھوں میں جھانکا تھا پھر گویا ہوئی۔

"آپ بہت چالاک تھے۔ ان آنکھوں کے سحر میں جکڑ لیا مجھے۔ کتنا چاہا تھا اس کٹھن راستے پر قدم نہ رکھوں۔ کتنا بدکتی رہی مگر آپ نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ میرے دائیں بائیں آگ لگی تھی۔ سامنے جنگل تھا اور ان ساحر آنکھوں کی جکڑتی ہوئی کشش۔ پاگل تو ہونا تھا مجھے۔"

اب کے اس کے لہجے میں مصنوعی بیچارگی اور بے بسی تھی۔ مستقیم کھل اٹھا تھا۔ جبھی ایک دم سے

پڑا گیا۔ اس کی بجھتی آنکھوں میں کیسے روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

"یار اتنی خوبصورت باتیں اور اتنے فاصلے سے۔ کچھ اتنی اچھی نہیں لگ رہی۔ یہاں آؤ نا ذرا۔"

اس نے اپنے پہلو کی جانب اشارہ کیا۔ انداز شوخی سموئے ہوئے تھا۔ دیا گڑبڑا سی گئی۔

"آرام سے بیٹھے رہیں۔ بہت کام ہے مجھے۔ رات تھوڑی نہیں ہے رومینس جھاڑنے کو۔ میں حیران ہوں۔ آپ کے محبت کے خزانے آخر کتنے بھرے ہوئے ہیں۔ ختم ہی نہیں ہوتے۔"

شریں مسکان لبوں پر سجائے وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔ مستقیم نے جواباً اسے چمکتی نظروں سے دیکھا پھر سرد آہ بھری۔

"محترمہ ہم تو ہر کام ڈھنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ چاہے وہ محبت ہو یا پھر کوئی گناہ...... آپ کی طرح کسی کے سونے کا یقین کرنے کا انتظار نہیں کرتے۔"

اس کے جتلاتے ہوئے شریر مگر معنی خیز لہجے پر دیا بے ساختہ چونکی اور کچھ خائف ہو کر اسے دیکھا۔

"ک...... کیا مطلب؟"

وہ پل کے پل ہراساں ہوئی اور اس سے جیسے نظریں چرانے لگی۔

"اب اگر ہم بتائیں گے تو مکر جائیں گی صاف۔ کاش کمرے میں کیمرے لگے ہوتے۔ ثبوت فراہم کیا جا سکتا کہ محترمہ دیا مستقیم آدھی رات کو چپکے سے اٹھ کر اپنے ہی شوہر کو چوری چوری گھنٹوں تکتی ہیں۔ صرف دیکھتی نہیں پیار بھی کرتی ہیں۔ ایویں تو خوامخواہ آنکھوں پر قصیدہ نہیں پڑھ رہی تھیں۔ اتنی پسند ہیں میری آنکھیں اور انہیں چومنے کا دل کرتا ہے تو......"

دیا نے تجاب سے جلتے چہرے کے ساتھ لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ مگر اس کی نظریں...... شریر، اتنی گستاخ ہو رہی تھیں کہ اسے حیا آمیز خفگی سے گھورتی دیا کی پلکیں لرز کر جھک گئیں۔ حیا کی کوفت، کسیاہٹ، غصہ، خجالت، وہ ہونٹ کچلتی خفت سے سرخ پڑ رہی تھی۔ مستقیم کی چمکتی سیاہ آنکھوں کی معنی خیز چمک سے اس کا لو دیتا چہرہ کچھ اور تمتمایا تو اس نے مستقیم کے کاندھے پر اپنی گھبراہٹ منانے کو بے دریغ کئی مکے مارے تھے۔

"حد سے زیادہ بدتمیز ہیں آپ۔"

شرمندگی و حیا سے جھلتے چہرے کو ہاتھوں میں ڈھانپتی وہ غصے میں چیخی۔

"مگر جواب بھی۔ کیمرے نہیں تھے کمرے میں۔ ثبوت تھوڑی ہے میرے پاس۔"

اس کا ارادہ دیا کو مزید زچ کرنے کا تھا مگر وہ بجائے جلنے کڑھنے کے اکڑ گئی۔

"میں کیوں مکروں۔ ہاں کر رہی تھی پیار، کسی کو اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہرگز جرم نہیں ہے یہ۔ بھئی شوہر ہیں آپ میرے۔"

وہ ننھی سی ناک چڑھائے اب نخوت سے بول رہی تھی۔ مستقیم کے بلند قہقہے نے اسے روہانسا کر دیا۔

"اب آپ ایسے تنگ کریں گے مجھے۔"

وہ لڑنے کو تیار تھی۔ اس نے ہنسی ضبط کرتے سر کو نفی میں جنبش دی تھی پھر یونہی ہنسی سے بے حال ہوتا ہوا بمشکل بولا۔

"نہیں یار! یہ سب کچھ باور کرانے کا مقصد یہ ہے کہ تم اسی طرح اب بھی مجھ سے پیار جتاؤ۔ اس بیچارے شوہر کا حق ہے جو ہر وقت اپنی بیوی کی تعریف کرتا ہوا اس سے پیار بھی کرتا ہو۔"

خوابیدہ۔ دھیما ارمان جگاتا ہوا سرگوشیانہ لہجہ دیا کے جسم و جاں میں پر حدت سنسنی پھیلاتا چلا گیا۔ وہ شپٹا کر تیزی سے پیچھے ہوئی تھی۔

"منہ دھو رکھیں۔ اونہہ..... اب اتنی بھی حسین اور قاتل نہیں ہیں آپ کی آنکھیں۔"

اس کے شریر و شوخ معنی خیز انداز سے دیا کا شرم سے برا حال ہو رہا تھا۔

"بہت کھنور ہو۔ خیر میں بھی معاف کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ پوچھ لوں گا رات کو۔ آنا تو ہے نا میرے پاس۔"

وہ مصنوعی غصے سے کہتا منہ پر ہاتھ پھیر کر گویا عہد باندھ رہا تھا۔ انگ انگ سے سرور چھلکاتی دیا کی پلکوں پر ڈھیروں بوجھ آن گرا۔ کچھ کہے بغیر وہ تمتمائے چہرے سمیت کچن میں جا گھسی۔

☆......☆......☆

نیم کی شاخوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ کچھ پیالے میں رکھے دانے اور پانی سے اپنی بھوک مٹانے میں مصروف بار بار پھڑ پھڑا کر چارپائی پر نیم دراز مستقیم کو چونکا دیتیں۔ دیا کی سلائی مشین کی آواز رکی ہوئی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دکھایا۔ وہ سوئی میں دھاگہ ڈالے ترپائی کرنے میں مگن تھی۔ صبیح چہرے پر بالوں کی موٹی لٹیں اس کے گالوں کو بار بار چومنے لگتیں۔ جنہیں وہ مصروفیت سے میں کانوں کے پیچھے اڑستی مگر وہ بیتابی سے پھر لپک کر اس کے رخساروں پہ اٹھکیلیاں کرنے لگتیں۔ مستقیم کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکان بکھر گئی۔

چوم لیتی ہیں مچل کر ہونٹ کبھی گال
تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

شادی کے محض تیسرے دن جب وہ نہا کر نکلی تھی اور بالوں کو تولیے کی قید سے آزاد کرنے کے بعد سلجھانے میں مگن تھی مستقیم نے اس کی لٹوں کو گال سے اٹھکیلیاں کرتے دیکھ کر شرارت سے کہا تھا۔ تب کتنی روہانسی ہو گئی تھی وہ۔ بات، بات پر جھگڑتی اور بلی کی طرح پنجے مارنے کو تیار۔

"مجھے ہاتھ مت لگایا کرو۔ مجھ سے بات مت کیا کرو۔"

اس وقت بھی اس کی گستاخی پہ دیا کے سر پہ جیسے خون سوار ہو گیا تھا مگر مجال ہے جو وہ پرواہ کرتا ہوا اس کی ناراضگی کی۔

"سوری زوجہ! اس کے بغیر تو گزارہ نہیں ہو سکتا۔"

اور وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"کاش..... اے کاش! اس حادثے سے پہلے کوئی ایک مر گیا ہوتا۔ تم یا پھر میں۔"

اور مستقیم اس کی برہمی کی شدت سے بڑھ کر لہجے کی نفرت سے لخت لخت ہوا تھا۔

"میں نے تم سے محبت کی ہے دیا! تمہارا احترام بھی بہت کرتا ہوں۔ میرے جذبوں کو پذیرائی بخشو نہ بخشو مگر ان کی توہین بھی مت کرنا کہ میں ڈرتا ہوں۔ میرے اندر کا کوئی منفی احساس محبت کے اس خوشنما احساس کو بدنما نہ کر دے۔ وارث شاہ کہتا ہے۔ "محبت کی آگ میں جل کر انسان سونے سے کندن بن جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات تپش محبت سونے کو پگھلا کر اس کی ہیئت ہی بگاڑ دیتی ہے۔"

میں ایک بار بگڑ اور ٹوٹ چکا۔ دوسری مرتبہ اس اذیت سے گزرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں محبت کی متعین کردہ راہوں پر چلنا بہت کٹھن اور صبر آزما ہے کہ بعض اوقات طویل سفر کے بعد بھی منزل نہیں ملتی۔ اور بے نام مسافت کی تھکن سے موت کی آغوش میں پناہ لے لی جاتی ہے۔ میں نے تمہارے سامنے کاسۂ دل پھیلا دیا ہے۔ یہ تمہاری مرضی ہے اس میں اپنی توجہ اور التفات کے سکے ڈالو یا نہ میں عمر بھر منتظر رہوں گا۔ موت کی آغوش میں سونے سے پہلے تک۔ دیا! محبت کے بغیر بھی زندگی گزر تو جاتی ہے مگر یاد رکھنا محبت زندگی کا بے حد اہم جزو ہے۔ اس کے بغیر یہ زندگی بے مقصد رہتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا میری زندگی بے کار بے مقصد گزرے۔ قاری کے یہ اشعار تمہارے نام کرتا ہوں ہمیشہ کے لیے۔"

خبر رسید اشب کہ نگار خواہی آمد

سر من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد
باہم رسیدا جانم تو بیان کہ زندہ مانم
بیہیں ازاں کہ من نمانم بہ چہ کا خواہی آمد
یار من بیا بیا ، ہاں من بیا بیا

(مژدہ سنا ہے کہ آج رات تو آئے گا۔ میرا سر ان راہوں پر قربان ہو جن سے تیری سواری گزرے گی۔ میری جان لبوں پر آ گئی ہے۔ تو آ کہ میں زندگی ہو جاؤں۔ میرے مرنے کے بعد آیا تو تیرا آنا میرے کس کام کا۔ میرے یار آ جا۔ تو آ جا۔")

کتنی شدت تھی تب اس کے لہجے میں۔ اس کے انداز میں۔ جس نے اس وقت تو پتہ نہیں دیا کو کتنا اثر کیا تھا مگر اب جبکہ بے خیالی میں ہی اس کے ہونٹوں پر "یار من بیا بیا!" کی گردان جاری ہوئی تو ضرور دیا اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس چلی آئی تھی۔

"خیریت؟"

وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ مسکرانے پر کچھ حیران ہوئی۔

"میں نے دل میں پکارا تھا تمہیں یار! تم آ گئیں تو اس کا مطلب دل سے دل کا تعلق کچھ اور گہرا ہوا ہے۔"

مستقیم کی بات سن کر دیا نے منہ پھلا لیا تھا اور شاکی نظروں سے اسے تکنے لگی۔

"جی ہاں! بالکل ...... اتنا گہرا ہوا ہے تعلق کہ پہلے کی طرح کے سارے پیارے انداز بھولتے جا رہے ہیں۔"

عجیب شکوہ ہوا تھا۔ مستقیم کی تو آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔

"یار عجیب لڑکی ہو تم! پرسوں محبتوں کی شدتوں سے گھبرا کر شکوے کر رہی تھیں اور آج ......"

"مستقیم آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے۔ بدل رہے ہیں آپ۔ یاد ہے پہلے کیسے بات بات پر مجھے شاعری سنایا کرتے تھے اور اب ......"

اس نے پھولے ہوئے منہ کو کچھ اور سوجھا لیا تو مستقیم کی ہنسی چھوٹنے لگی تھی۔

"وادی کہتی ہوں گی اگر شوہر کو بدلتا ہوا محسوس کرو تو اسے آرام سے محبت سے پیارے احساس دلاؤ۔"

وہ مسکراہٹ دبائے کہہ رہا تھا۔ دیا نے چونک کر اسے دیکھا پھر خجالت سے سرخ پڑتی اس کے بازو پر گھونسے مارنے گئی۔

"نہیں کیا ضرورت تھی مجھے ایسی پٹی پڑھانے کی۔" وہ خفا ہوئی۔

"ہاں کاش پڑھا دی ہوتی۔ میرا بھلا ہو جاتا۔ تم ہر اچھی بات اتنے فاصلے سے تو نہ کرتیں۔"

وہ مسکراہٹ دبائے کہہ تھا۔ دیا ناراضی کا تاثر چہرے پر سجائے اٹھی۔ مستقیم نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"آپ کو کیا؟" وہ نروٹھے پن سے کہہ گئی۔

"مسکراؤ گی نہیں؟ میں تمہیں خفا نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ سمجھا رہا تھا۔ صاف لگتا تھا مسکہ لگا رہا ہے۔

"اونہہ ......" دیا نے اپنا ہاتھ جھٹکے سے چھڑا لیا۔ مستقیم نے دوپٹے کا پلو بہت عجلت میں پکڑا تھا۔

میرا ایمان محبت ہے محبت کی قسم!
مسکرا جانِ بہاراں کہ سویرا ہو گا
دور صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہو گا
عشق کی راہ کہاں روک سکے اہل ستم
میرا ایمان محبت ہے محبت کی قسم!

وہ بہت آہستگی سے گنگنایا تھا۔ دیا خوشگوار حیرت میں گھرتی بے اختیار اس کی جانب پلٹ گئی۔

"بس ...... یا کچھ اور؟"

"کچھ اور ......" اس نے مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام ہوتے کھلکھلا کر کہا۔ مستقیم نے سر خم کیا تھا اور گلا کھنکارا۔

عجیب تعلق سا ہو گیا ہے۔
تمہاری آنکھوں کے جلتے بجھتے سے ان آئینوں سے
یہ کیا مراسم نکل پڑے ہیں
تمہارے دل کی اداس گلیوں میں رہنے والے
دکھوں کے سارے ہی موسموں سے
کمال رشتے میں بندھ رہے ہیں

جو درد کا ہے جو روح کا ہے
جو زندگی کی شکستگی کے عذاب کا ہے
یہ لگ رہا ہے کہ جیسے آنکھوں میں
سارا منظر ہی خواب کا ہے سراب کا ہے
عجیب تعلق سا ہو گیا ہے
تمہاری آنکھوں کے جلتے بجھتے سے ان آئینوں سے

نظم سنانے کے دوران ہی اس نے دھیرے دھیرے دیا کا دوپٹہ کھینچتے اسے خود سے نزدیک کر لیا تھا۔ باقی فاصلہ دیا نے خود سمیٹ دیا اور اسی کے سینے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

"یہ بالکل سچ ہے دیا!"

اس کا لہجہ مدھم مگر مضبوط اور پُر یقین تھا۔

"میں جانتی ہوں۔"

دیا نے آنکھیں موند لیں۔ پھر یونہی بند آنکھوں کے ساتھ سرگوشی سے مشابہ آواز میں بولی تھی۔

مستقیم ہمہ تن گوش ہوا اور اس کے گرد اپنے دونوں بازو حمائل کر دیئے۔

"آپ میری زندگی کی سب سے اہم خوشی ہیں مستقیم! میری زندگی کا سرمایہ اور اثاثہ۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ، آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ پلیز کبھی مجھ سے دور مت ہونا۔"

"جیتے جی ایسا ممکن نہیں ہے۔ جان مستقیم! تم بھی سن لو۔ اگر بیچ میں مگن ہو کر تم نے مجھ سے دور ہونے یا نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ہر روز لڑائی ہوگی۔"

وہ بھی دھمکانے لگا۔ دیا جواباً کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ زندگی میں بہت کچھ نہ ہونے کے باو... زندگی مکمل تھی۔ آسودہ تھی اور بھرپور تھی۔ مگر ضروری تو نہیں وقت ایک جیسا رہے۔ البتہ یہ بات ابھی وہ دونوں ہی نہیں جانتے تھے۔

☆......☆......☆

اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ جبھی دوا لے کر لیٹ گئی۔ آنکھ لگی تو بھلا وقت گزرنے کا احساس کہاں رہتا تھا۔ جاگی تو سہ پہر شام میں ڈھل رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بال سمیٹتی باہر آئی تو پہلے مرحلے پر ہی تھم سی گئی۔ آنگن دھلا دھلایا صاف شفاف تھا۔ گھر سمٹا ہوا چمکتا۔ حالانکہ جب وہ لیٹی پورا گھر ... ہو رہا تھا۔ کل اسے آرڈر پورا کر کے بھیجنا تھا جس میں لگ کر باقی کے کام رہ ہی گئے تھے۔ خاص ...

تھی کی صفائی۔ صبح بھی مستقیم کو بس ناشتہ ہی دیا تھا یا نماز پڑھ سکی۔

"یہ صفائیاں وغیرہ آپ نے کیں؟ اور اب یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

وہ حیران پریشان سی کچن میں آئی تو مستقیم کو رخ پھیرے مصروف پا کر اسے مخاطب کیا۔ وہ چونک کر پلٹا تھا مگر دیا کو ہونق کر دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس کے کہنیوں تک آٹے لتھڑے ہاتھ دیکھتی یکدم منہ پہ ہاتھ رکھے ہنسنے لگی۔

"یار...... پلیز! جان چھڑاؤ میری۔ میں تو مدد کر رہا تھا تمہاری۔ تم مذاق اڑا رہی ہو۔"

وہ زچ سے جھنجھلایا۔ دیا یونہی ہنستے ہوئے اس کے قریب آئی پھر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"کس نے کہا تھا ایسی مدد کرنے کو۔"

"دیا......" وہ دھاڑا۔

"اوکے...... اوکے...... آیئے ادھر۔" وہ خشک آٹے سے گیلا آٹا اس کے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر نرمی سے اتارنے لگی۔

"آپ مجھے اٹھا لیتے۔ اگر بھوک لگی تھی تو۔"

"وہ اب برتن میں پانی لے کر خود اس کے ہاتھ دھو رہی تھی۔ مصروف رہ کر بولی۔

"طبیعت جو ٹھیک نہیں تھی تمہاری۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ آپ بتایئے اتنے کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ساری احتیاط بھلا دی۔"

وہ فکر مند تھی۔ مستقیم مسکرا دیا۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ سوچ رہا ہوں کل سے کسی کام پہ بھی چلا جاؤں۔ بیکار بیٹھے عاجز آ گیا ہوں سچ مچ۔"

"یہ بیکاری نہیں تھی مستقیم! احتیاط اور پرہیز تھی۔ میں خود آپ کے زخم دیکھوں گی پھر ہی بتاؤں گی۔ ابھی کام پہ جانا ہے یا نہیں۔ اور ہاں آئندہ ایسے کام نہیں کیجیے گا۔"

وہ اس کے ہاتھ دھو کر صاف کر چکی تھی۔ دوپٹے سے خشک کرنے کے بعد آٹے کی سمت متوجہ ہو گئی۔

"کیوں نہ کروں بھلا کام! ہاتھ بٹانے میں کوئی حرج ہے؟ میں تو سوچ رہا ہوں باقاعدہ سیکھ لوں آہستہ آہستہ۔ آگے جیسی تمہاری حالت ہو جانی ہے ڈلیوری کے نزدیک جا کے تو مشکل نہیں ہوگی۔"

وہ سنجیدہ تھا۔ پیڑھی گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا تو دیا نے آٹا گوندھتے ہوئے سر اٹھا

کراسے دیکھا۔اس کے چہرے پر حجاب کا تاثر اتر رہا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں۔اس مسئلے کا حل تو بہت بہترین سوچا ہے میں نے۔"

وہ مطمئن تھی۔مستقیم نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟ کوئی ملازم رکھو گی تم؟"

اس سوال پر دیا زور سے ہنس پڑی تھی۔

"ایسی پوزیشن میں آنے کے لیے تو ہمیں بہت اسٹرگل کرنے پڑے گی۔میں نے کچھ اور سوچا ہے۔"

"ہاں...... اتنی اسٹرگل کہ تم میرا پہلا نہیں شاید بارہواں تیرہواں، بچہ جنم دینے والی ہوگی۔"

اس کے چہرے پر جھولتی لٹ کھینچ کر شرارت سے بولا تو دیا بری طرح سے جھینپی تھی۔

"اف......اتنے خطرناک ارادے ہیں آپ کے؟"

وہ چیخ پڑی۔مستقیم ہنسنے لگا۔

"اس سے بھی زیادہ...... بتاؤں؟" وہ اس پر جھکا۔دیا نے اسے آنے سے پہلے ہاتھوں سے پیچھے دھکیل دیا۔

"قسم سے تم بہت ان رومینٹک لڑکی ہو۔"

وہ سرد آہیں بھر رہا تھا۔دیا ان سنی کیے روٹی پکانے کی تیاری کرنے لگی۔وہ چولہا جلا رہی تھی۔یہ بھی اک مرحلہ ہوا کرتا تھا۔اس نے زندگی میں کبھی لکڑیاں نہیں جلائی تھیں۔مگر اب زندگی کا یہ ڈھب تھا۔وہ کتنی مشکل سے آگ جلا کر کھانا تیار کرتی تھی۔شروع میں کئی بار اس کا ہاتھ جلا۔مستقیم اسے منع کرتا تھا اور تنور سے روٹیاں اور سالن بھی لاتا رہا۔مگر کب تک دیا خود بھی نہیں چاہتی تھی۔وہ عادی ہوتی جا رہی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں دیا! کیا سوچا حل تم نے؟"

آگ جل چکی تھی۔توا چولہے پر چڑھ چکا تھا۔جس سے آگ کے لمبے شعلے زبانیں نکال رہے تھے دیا نے روٹی بیلتے ہوئے اک جھانچتی نظر اس پر ڈالی۔وہ جیسے اس کے جواب کا ہی منتظر تھا۔

"پہلے بتائیں آپ خفا تو نہیں ہوں گے۔"

وہ محتاط انداز میں جس طرح سوال کر رہی تھی اس نے مستقیم کو حیران کر کے رکھ دیا۔

"ارے...... ہر بات کیوں سوچی تم نے بھلا؟ یار من مستقیم کے دل پر آپ کی حکومت ہے

آپ سے خفا ہونے کی مجال۔"

خفا معاً وہ ہنسنے لگا مگر دیا کی سنجیدگی کا وہی عالم تھا۔

"مجھے لگ رہا ہے۔آپ لازمی خفا ہوں گے۔"

"اب تو مجھے اور بھی بے چینی لگ گئی ہے۔آخر ایسی کیا بات ہے؟ اچھا چلو پرامس! نہیں ہوتا خفا۔تم بتاؤ تو۔"

وہ متجسس بھی تھا۔حیران بھی۔دیا نے روٹی سینک کر چنگیر میں رکھی اور سالن کی کٹوری سمیت اس کے سامنے کی۔

"آپ کھانا کھائیں۔پھر بتاتی ہوں آپ کو۔"

وہ رسان سے کہتی اگلی روٹی بیل رہی تھی۔مستقیم بدمزا ہونے لگا۔

"یہ بھلا کیا بات ہوئی دیا! تم مجھے الجھا رہی ہو۔"

"دادی کہا کرتی تھیں مستقیم! جس بات کا پہلے سے خدشہ ہو کہ وہ سامنے والے کا موڈ خراب کر دے گی اسے ایسے وقت میں کرنا چاہیے جب اس کا مناسب وقت ہو۔"

"یار سب سے پہلی بات تو یہ کہ تمہاری دادی مجھے اچھی خاصی لاجیکل خاتون لگی ہیں۔ان کی باتیں سن سن کر میرا اپنا دل بھی ان سے ملنے کو چاہنے لگا ہے۔اور بات سنو۔کیا یہ مناسب وقت نہیں ہے بات کا تو پھر کب......؟"

"ہے نا؟ میں خود یہ چاہتی ہوں کہ آپ کو دادی سے ملاؤں۔وہ بہت پیاری بہت ہی نائس ہیں مستقیم!"

دیا جوش میں آکر تیز تیز بولنے لگی۔مستقیم نے اسے سنجیدگی سے دیکھا تھا۔

"تم نے میری دوسری بات کا جواب نہیں دیا۔"

دیا کا جوش و خروش مدھم پڑا اس کی جگہ ہلکی خفگی نے لے لی۔

"آپ نے بھی تو میری بات کا جواب نہیں دیا مستقیم مگر میں......"

معاً اس نے سر جھٹکا پھر نروٹھے پن سے بولی تھی۔

"یہ کھانے کا وقت ہے۔کسی گھمبیر ٹاپک کو اگر چھیڑا جائے تو کھانے کے وقت بدمزگی اور انتشار پھیلتا ہے جو مناسب نہیں۔رزق سامنے رکھ کر لڑنا جھگڑنا بالکل غلط ہے۔دادی جبھی منع کرتی تھیں اس بات سے۔

''اوکے فائن! وہ بہت سمجھ دار خاتون ہیں بلاشبہ! خدا ان کی عمر دراز فرمائے آمین مگر بیوی اس وقت تو تم نے خود اپنا موڈ خراب کرلیا ہے۔''

وہ مسکراہٹ چھپاتا گویا اب اسے چھیڑ رہا تھا۔ دیا دبک سی گئی۔ مگر کچھ کہا نہیں۔

''چائے پئیں گے؟''

وہ کھانا کھا چکا تو دیا نے سوال کیا تھا۔ مستقیم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

''تم کھاتی رہو کھانا۔ میں خود بنالیتا ہوں۔ تم پیو گی؟''

''نہیں...... موسم بدل رہا ہے۔ اب دل نہیں کرتا۔''

''اچھا پھر دودھ ضرور پی لینا۔''

دیا نے محض سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔ وہ دونوں کچن سے نکلے تو عصر کی اذان کی آواز اٹھنا شروع ہوگئی تھی۔

''آپ بھی نماز پڑھا کریں مستقیم!''

وہ وضو کے ارادے سے واش روم کی سمت جاتی معمول کی تاکید کررہی تھی۔ جس پر مستقیم نے حسب سابق کان نہیں دھرا تھا۔

''میں منتظر ہوں دیا! اور سنو اب ہرگز بہانہ نہیں۔''

اس کا انداز اتنا سنجیدہ تھا کہ وہ سرد آہ بھر کے رہ گئی تھی۔ کچھ دیر سر جھکائے انگلیاں چٹخاتی رہی پھر اسے دیکھا تھا اور ملتجی ہوکر بولی۔

''آپ مان لیں گے نا میری بات؟''

''چلو...... اب پھر شرطیں۔''

وہ جیسے سر پیٹنے والا ہوگیا۔ پھر جیسے اس کے حال پر رحم کھایا۔

''چلو مان لوں گا۔ اب بولو۔''

دیا کے چہرے پر یکلخت روشنی سی چھا گئی۔ اٹھی اور اس کے ہاتھ جوشیلے انداز میں تھام لیے۔

''مستقیم! ہم واپس چلتے ہیں۔ آپ کے امی اور بابا کے پاس۔ دیکھیں......''

وہ اگر سہم کر بات ادھوری چھوڑ گئی تھی تو اس کی وجہ مستقیم کا انتہائی سرد انداز تھا۔ جس میں اس نے یکدم دیا کے ہاتھ جھٹک دیئے تھے۔

''اچھا...... تو یہ بات تھی۔ جس کے لیے اتنی شرطیں منوائی جارہی تھیں۔

وہ یکدم ضبط کھو کر چیخ پڑا۔ دیا اسی قدر گھبرائی۔ سٹپٹائی۔

''خلیفہ میری بات......''

''میں نے تمہیں کہا تھا نا دیا! اس موضوع پر بات نہ کرنا مجھ سے۔''

وہ غرایا اور انگلی اٹھا کر یاددہانی کرائی۔ اس کی آنکھیں یکدم کتنی سرخ ہوگئی تھیں۔ دیا کو کم از کم اب اس سے اتنے شدید رویئے کی توقع نہیں تھی۔ منہ پہ ہاتھ رکھے سسکیاں دبانے لگی۔

''اگر تم چاہتی ہو دیا کہ ہمارے تعلقات میں سردمہری نہ آئے تو آئندہ یہ تقاضا نہیں کرنا۔ میں ابھی پہلے زخم بھرنے میں ناکام ہوں۔ تم چاہتی ہو میں پھر......''

''ضروری تو نہیں ہے مستقیم! حالات اب بھی وہی ہوں۔ عین ممکن ہے وہ پچھتاوے یا ملال''

دیا کہنا چاہتی تھی مگر خلیفہ مستقیم نے اسی شدید موڈ کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اس کی بات قطع کردی۔

''بات سنو...... تم تو محض اک قیاس آرائی کررہی ہو تاں؟ اگر مجھے کوئی آکر یہ گواہی بھی دے کہ وہاں ایسی کوئی صورتحال ہے تو بھی میں پلٹ کر وہاں جانا گوارا نہیں کروں گا۔ سمجھیں؟''

اس کے لہجے میں غراہٹیں در آئی تھیں۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا۔ تن فن کرتا ہوا گھر سے ہی نکل گیا۔ دیا بے دم سی ہوتی گرنے کے انداز میں وہیں بیٹھ گئی۔ آنسو بے آواز اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ زندگی کا ہر مرحلہ کٹھن تھا بہت کٹھن۔ پتہ نہیں وہ کس حد تک لڑ سکتی تھی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے وہ خود پر ضبط کھو کر اللہ سے ہمت اور حوصلے کے ساتھ جائز نیک مقصد میں کامیابی کی درخواست بھی پیش کررہی تھی۔

☆......☆......☆

فضا میں لیموں کے پھولوں کی ترش سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی سبز شاخوں میں سفید پھول کھلے تھے۔ لیموں کے پیڑ نیا پھل دینے کی تیاری کررہے تھے۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے ان پیلی اور سیاہ دھاریوں والی تتلیوں کا انتظار کررہی تھیں۔ جو ہر روز آتی تھیں۔ ساتھ اسے خلیفہ مستقیم کا بھی انتظار تھا جو تب کا گیا واپس نہیں لوٹا تھا۔ وہ اداس تو تھی ہی مضطرب بھی ہونے لگی۔ مستقیم کی سخت اور تلخ کلامی نے بہت دکھ دیا تھا اسے۔ اس پر طرہ یہ کہ خود خفا بھی ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پہلو بدلتے ہوئے بے تحاشہ بیرونی دروازے کی جانب دیکھا۔ جس کے پار اس کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

جاتی سردیوں کا دھیما ان تپا سورج پردہ مغرب میں غڑاپ سے ڈوب گیا۔ شفق کی سرخی نارنجی شیڈز دھیرے دھیرے اندھیرے میں بدلے تھے اور مکمل طور پر دھرتی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد وہ پریشانی میں جتلا بیرونی دروازے کے پاس آ کر ٹہلنے لگی۔ تنہائی کے خوف کے ساتھ مستقیم کی ناراضی اور یوں بے احتیاطی کا غم زیادہ کھا رہا تھا اسے۔ اس سے پہلے کہ گھر کر رو پڑتی وہ چلا آیا تھا۔ دستک سے بھی پہلے وہ اس کے قدموں کی آہٹ پہچان کر دروازہ کھول چکی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟ میرا دل بند ہو رہا تھا جیسے۔"

وہ بولی تو آواز بھرائی ہوئی تھی۔ مستقیم نے اک نظر اسے دیکھا ضرور مگر کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا۔ دیا دکھ سے شل ہوتی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ خاصی دیر سے اندر آئی تو صاف لگتا تھا ایک بار بہت سارا روئی ہے۔ مستقیم کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"دیا!" وہ بے حد بوجھل آواز میں بولا تھا۔ دیا نے محض بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا بولی کچھ نہیں۔

"آئی ایم ساری! مجھے تم سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پتہ نہیں کیوں۔ بہت غصہ آ گیا ہے مجھے۔"

وہ متاسفانہ انداز میں گویا تھا۔ دیا نے ہونٹ کچل کر گویا پھر سے بہہ جانے کو تیار آنسو ضبط کیے۔

"اٹس او کے! میں آئندہ خیال رکھوں گی۔"

وہ رقت آمیز آواز میں بولی تھی۔ پلکیں ہنوز جھکی تھیں۔ جن پر نمی چمکنے لگی تھی۔

"پلیز دیا! خفا مت ہو۔ دیکھو....."

"مستقیم! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ میں تو......"

وہ دکھ سے بوجھل آواز میں کچھ کہتے کہتے چپ کر گئی۔

"میں جانتا ہوں۔ مگر دیا! مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ سب دکھوں کا ازالہ ہو سکتا ہے جو اس کے تم سمجھو تو۔"

وہ بے حد عاجز اور بے بس نظر آ رہا تھا۔

"ڈلیوری کے وقت آپ مجھے نہیں سنبھال سکتے ہیں مستقیم! کسی سمجھ دار بزرگ خاتون کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے حالات ہیں۔ ہم کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے۔ میرا مقصد یہی تھا۔"

دیا کے کہنے پر مستقیم نے سرد آہ بھری۔

"اللہ مالک ہے۔ تم فکر مت کیا کرو۔"

"ہم بہت اکیلے ہیں مستقیم! مجھے کم از کم میرے اپنوں سے تو ملنے کی اجازت دیں آپ۔"

وہ عاجزی سے کہہ رہی تھی۔ انداز میں دکھ بھرا ہوا تھا۔ مستقیم چونک کر، بلکہ ٹھٹک کر اسے تکنے لگا۔

"اپنی قسمت سے سمجھوتہ کر لو دیا! مجھے نہیں لگتا اب تمہاری فیملی تمہیں ایکسپٹ کرے۔"

اس کے ناصحانہ انداز پر دیا جیسے تڑپ کر رہ گئی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا خلیفہ مستقیم! میں بے قصور ہوں میری فیملی آگاہ ہے اس بات سے۔"

مستقیم نظریں چرا گیا تھا۔

"میں تمہیں شاید پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ اغوا شدہ اور گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک ہی سلوک سے نوازا جاتا ہے۔"

اس کا لہجہ مدھم اور مجرمانہ تھا۔ دیا چند ثانیوں کو ساکن رہ گئی۔ جانے کون کون سے ہراساں کرنے والے خدشات اس کی دھڑکنوں میں اتھل پتھل مچانے لگے مگر اگلے لمحے وہ اس احساس کو سر جھٹک کر دور کر چکی تھی۔

"نہیں..... میرے والدین ایسے نہیں ہیں۔ وہ مجھے جانتے اور سمجھتے ہیں۔ کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ بلکہ آپ دیکھیے گا۔ وہ منتظر ہوں گے میرے۔"

اس کا لہجہ خوش گمان اور پر وثوق تھا۔ مستقیم کچھ کہے بغیر اس کی آنکھوں میں جگمگاتی آس کو تکتا رہا پھر گہرا سانس کھینچا۔

"اللہ کرے تمہارا یقین سلامت رہے۔"

دیا نے اس دعائیہ انداز پر چونک کر اور خوشگواریت میں گھر کر اسے دیکھا تھا۔ پھر ایک دم چہکی۔

"یعنی آپ کو برا نہیں لگا؟ خلیفہ میں مل سکتی ہوں نا اپنے گھر والوں سے؟"

"تمہارا گھر والا تو بس میں ہی ہوں۔ ہاں البتہ تم اپنے والدین اور ڈیئرسٹ دادی سے مل لو گی تو مجھے بھلا کیا فرق پڑے گا۔"

وہ کاندھے اچکا کر کہہ رہا تھا۔ دیا ایک دم سے نہال ہو کر کھلکھلائی۔

"اف..... مستقیم! آپ کتنے اچھے ہیں۔ کاش میں آپ کو بتا سکتی۔"

وہ بھیگی آنکھوں سے ہنستی ہوئی بہت معصوم اور پیاری لگی تھی مستقیم کو۔ وہ بھی اسے اجازت نہ دے کر دوسرے لفظوں میں آزمائش نہیں چاہتا تھا مگر جس طرح دیا کو جھڑکا تھا اور وہ اس بات کو لے کر رنجیدہ ہو چکی تھی۔ اب وہ مزید اسے مایوس اور دل برداشتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی

کہ وہ ابھی تک خود کو دیا کا مجرم سمجھتا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ تھا۔ وہی تھا جس نے اس بے حد معصوم لڑکی کی زندگی سے ہر حسین اور خوبصورت رنگ نوچ کر پھینک دیا تھا۔ اب وہ مزید اس کی دل آزاری چاہتا تھا نہ ہی اس کی حق تلفی کا گناہ کرنا چاہتا تھا۔ جبھی اسے نرم مسکان کے ساتھ تکتا رہا۔

"مثلاً کتنا؟" اس کا انداز چھیڑتا ہوا اور شرارتی تھا۔

"بہت...... بہت زیادہ...... سب سے زیادہ...... پوری دنیا سے بھی۔"

وہ اس طرح چہک رہی تھی۔ جھوم کر بولی تو مستقیم کو شرارت سوجھ گئی۔

"وہ کیا ہے کہ فاصلوں سے کہی باتیں میرے حافظے میں محفوظ نہیں رہتیں۔ پاس آ کر سمجھاؤ تو بات بنے۔"

دیا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں بلا کی شرارت ٹپک رہی تھی۔ سرگوشیانہ لہجے کا بھاری پن، مخمور گھمبیرتا اس کے رومینٹک موڈ کی غماز تھی۔ وہ یکدم حجاب اور خفت سے سرخ پڑ گئی اور نظریں چرا گئی۔

"موسم بدل گیا ہے۔ میرا خیال ہے باہر سونا چاہیے۔ میں چارپائیاں بچھاتی ہوں۔"

وہ کترا کر نکلنا چاہتی تھی مگر مستقیم نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی نرمی سے تھام لی۔

"تم خوش ہو دیا!"

دیا کو وہ بہت سنجیدہ محسوس ہوا۔ وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے پھر پرجوش ہو گئی۔

"آپ دیکھیے مستقیم! دادی اور امی تو مجھے مشکل ہی ہے واپس بھی آنے دیں۔ وہ اپنے پاس رکھ لیں گی۔ ڈلیوری تک۔ ان دنوں مجھے کیئر کی ضرورت ہے۔ جو ماں یا پھر ساس ہی کرتی ہوتی ہیں۔"

وہ مسکرا رہی تھی۔ آنے والے وقت کا دلکش تصور ہی اس کے چہرے پر روشنی بن کر پھیل رہا تھا۔ مستقیم کچھ نہیں بولا۔ بس اس کی چمکتی ہنستی آنکھوں کو تکتا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرے گیا۔

"اگر امی نے مجھے واپس نہ آنے دیا۔ جو کہ وہ آنے ہی نہیں دیں گی تو آپ رہ لیں گے اتنے دن میرے بغیر؟"

ہونٹ کا کونہ دبائے وہ شرارتی نظروں مچلتی مسکان کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ مستقیم چونک گیا۔ دیا کو سمجھ نہیں آئی وہ اتنا گم صم کیوں ہے۔

"مجھے تمہاری خوشی زیادہ عزیز ہے۔ اگر تم وہاں رہنا چاہتی ہو تو ... کر لوں گا گزارہ بھی کسی طرح۔"

اس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ دیا کچھ سست سی پڑ گئی۔ اس کے خیال میں تو مستقیم کو یہ بات

نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی وہ اس کے رہنے والے آئیڈیے کو رد کرے گا اور صاف کہے گا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں پتہ تو ہے میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر۔"

مگر صورتحال کی تبدیلی نے اسے آزردہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

"کب جاؤ گی تم؟ اور ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں تم نے کہ تم میرے بغیر رہ لو گی؟"

وہ بالآخر تاخیر سے سہی مگر اس کے دل میں مچلتا سوال کر چکا تھا۔

"نہیں...... میں نہیں رہ سکوں گی خلیفہ! مجھے آپ بہت یاد بھی آئیں گے اور مجھے آپ کی فکر بھی رہے گی۔"

وہ اپنے جذبات مخفی نہیں رکھ سکی۔ جبھی پوری دیانت داری سے جواب دیا تھا۔ مستقیم کے چہرے پر بھی جیسے رونق سی اتر آئی۔

"تو پھر مت رکنا! واپس آ جانا۔ ٹھیک؟"

"نہیں خلیفہ! یہ رسم ہوتی ہے۔ میکے والے بیٹی کا پہلا چلہ اپنے ہاں کرواتے ہیں۔ خیر یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ آپ مجھ سے ملنے تو آیا ہی کریں گے۔"

یہ اگر سوال ہوتا تو وہ نظر انداز بھی کر دیتا۔ وہ تو اپنا خیال بلکہ یقین ظاہر کر رہی تھی۔ شاید اپنے ساتھ ساتھ اس کی حیثیت کو بھی فراموش کر گئی تھی۔ کہ وہ اغوا شدہ بیٹی ہے۔ اور داماد بھی کوئی اور نہیں اغوا کرنے والا لٹیرا ہے۔

"یار کیوں سسرالیوں سے جوتے پڑوانے کے پروگرام سیٹ کرتی ہو۔"

تمام تر اذیت کے باوجود وہ بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں بولا تھا۔ دیا نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ مستقیم! کیا آپ کی عزت میری عزت نہیں ہے؟"

اس کے انداز سے ظاہر تھا۔ اسے اس بات نے کتنا دکھ دیا ہے۔

"میں کب انکاری ہوں، مگر آپ کے والدین تو حالات جانتے ہی سب سے پہلے شوٹ کریں گے۔ زبردستی کے اس داماد اور نواسے کے خوامخواہ بننے والے باپ کو۔"

"یہ سب تب ہوگا نا جب میں کوئی ایسی فضول بات انہیں بتاؤں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔ اس قسم کی کوئی صورتحال پیدا نہیں ہو گی۔ ان شاء اللہ!"

☆......☆......☆

چوتھا حصہ

''گڈ ،مثلاً'' کیا کہیں گی آپ وہاں سب سے میرے متعلق؟

مستقیم مسفرانہ نظروں سے دیا کو تکنے لگا۔ اس کی نظروں کی آنچ سے دیا نے اپنا چہرہ جھلستا محسوس کیا۔ ''کم ازکم ایسا کچھ نہیں جو آپ کی عزت میں کمی کرنے کا باعث ہو۔ اک بات یاد رکھیے گا مستقیم! میرے رشتے میرے لیے بہت اہم ہیں۔ مگر ان کی اہمیت کسی بھی طور آپ سے بڑھ کر نہیں ہے اب۔''

اس کے لہجے میں جو رسان کے ساتھ مان کی کیفیت تھی وہ ایسا کر لینے کی صلاحیت سے مالامال تھی مستقیم پہ قدرتی سا اثر ہوا۔ اس کے نقوش میں ابھر آنے والا تناؤ خود بخود اپنا تاثر کھونے لگا۔ ذہن ریلیکس ہوا تو لبوں کے گوشوں میں نرم مسکان اتر آئی۔ اس کا مطلب تھا دیا اسے اتنا سمجھنے اور جاننے لگی تھی کہ اس کے اندر کی کیفیات اس کے خدشات تک پہ بھی رسائی حاصل کر چکی تھی۔ کچھ کہے بغیر اس نے دیا کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ انداز میں عقیدت اور محبت کا ایسا جادوئی اثر رنگ تھا جس کا مہکتا احساس دیا تک بھی پہنچا تھا۔ جب وہ جھینپ کر مسکرانے لگی۔

''قدرت ہے اللہ پاک کی۔ نواز نے پہ آئے تو رحمتوں کے دریا بہا دے۔ دیا! میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا تم کبھی اتنا بھی بدل جاؤ گی۔ اتنا بھی مجھے چاہو گی۔ ساری عمر اپنی قسمت سے شاکی رہا میں اور اس حدیث پہ دل سے ایمان لانے سے گریزاں۔ ''اللہ اپنے ایک بندے سے بھی ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔'' مگر اب مجھے کسی قسم کا کوئی شبہ۔ کوئی شک نہیں رہا۔ تمہارا ساتھ، تمہاری محبت عطا فرما کر اللہ نے یہی تو بتایا مجھے۔ یہی تو سمجھایا ہے دیا کہ وہ مجھ سے بھی اتنا ہی پیار کرتا ہے۔ جس قدر اپنی ساری مخلوق سے۔ اُس نے مجھے یقین کامل سونپا۔ مجھے ایمان کو مضبوط کرنے کا موقع دیا ہے۔''

وہ بول رہا تھا تو اس کا ایک ایک لفظ مہکتا تھا۔ دیا مسکراتے ہوئے طمانیت و آسودگی کے احساس سمیت اسے دیکھتی اسے سنتی رہی۔ یہی تو چاہا تھا اس نے مستقیم کا یہی رنگ دیکھنا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مستقیم! اللہ کے ہر کام میں ہمارے لیے بہتری اور مصلحت پوشیدہ

ہوتی ہے۔ میں بھی شروع میں نہیں سمجھی اور شاکی ہوتی رہی۔ مگر اب''

وہ رکی جھینپی اور نچلا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روک گئی۔ مستقیم جو اس کی ادھوری بات پہ بے چین ہو چکا تھا۔ لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مگر اب ....؟'' اس کا لہجہ سوالیہ، انداز اشتیاق آمیز تھا۔

''کچھ نہیں'' دیا کا گریز بڑھا۔ اسے شرم محسوس ہوئی تھی۔ اس اظہار میں جو وہ کرنے جا رہی تھی۔ مستقیم نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

''بات ادھوری نہیں چھوڑ سکتیں تم۔ یاد کرو۔ میں دن میں ستر سو مرتبہ اظہار محبت کرتا ہوں تم سے۔ اگر تم بھی اک بار کہہ دو گی تو ہرگز بھی نسوانیت کی توہین نہیں ہو گی۔ آخر بیوی ہو تم میری۔''

وہ اسے گھور رہا تھا مگر انداز سے چھلکتا ہوا لاڈ اور مان ہی تھا جو دیا کی مسکراہٹ کو گہرا کرتا چلا جا رہا تھا۔

''یعنی اب ضروری نہیں ہے کہ میں بھی محبت کے اظہار کے جواب میں اظہار کرنا شروع کر دوں۔''

اب دیا نے دانستہ مستقیم کو تنگ ہی کیا تھا۔ مستقیم نے کچھ کہے بغیر اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔

''ضروری ہے۔ بہت ضروری۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے دیا! میری توانائیوں کے لیے کیا یہ اور کتنا ضروری ہے۔''

اس کے لہجے میں جو پیاس تھی۔ جو تشنگی تھی۔ اس نے دیا کو جکڑ کر رکھ لیا۔ وہ جانتی تھی مستقیم کی وحشت، آگاہ تھی اس کی ہر بے کلی کی۔

''میں نے اپنا سب کچھ کھویا تو آپ مجھے ملے تھے مستقیم! اور کھونا اتنا آسان کبھی بھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی بڑی مشکلوں سے آتا ہے۔ مجھے بھی آ گیا۔ اس وقت میرے لیے اللہ کی تمام نعمتوں میں سب سے انمول نعمت آپ ہیں۔ بہترین تحفہ آپ کی محبت ہے۔ مجھے عمر بھر بھی اب کچھ اور نہیں چاہیے تو میں آپ کے ساتھ ہمیشہ شاکر اور آسودہ رہ سکتی ہوں۔''

اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ محبت کا جانفزا احساس تھا۔ آنکھوں میں اس پل ان گنت ننھے جگنو چمک رہے تھے۔ جو اس کے الفاظ کی سچائی کی گواہی دیتے تھے۔ مستقیم اسے دیکھنے لگا۔ اسے لگا وہ محبت کی دیوی ہے۔ روشنی کا پیکر ہے۔ بے حد خاص انعام۔ ایسا انعام جو خدا سے معافی کے مقیم احساس کا ثبوت بن جایا کرتا ہے۔ دیا نے اس کی جامد خاموشی کے جواب میں جھجکی پلکیں اٹھا کر اسے

دیکھا۔ اتنے خوب صورت اور والہانہ اظہار کے جواب میں یہ خاموشی اسے حیران کرنے کا باعث بن رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

مستقیم کی وارفتانہ نظروں کو محسوس کرتے ہی وہ سرخ پڑنے لگی۔ مستقیم نے جواب نہیں دیا البتہ اس کی نظروں کا تبسم معنی خیزیت سمیٹ لایا۔

"اپنی بیوی کو دیکھ رہا ہوں۔ میں سمجھتا تھا تم صرف حسین ہو۔ مگر آج انکشاف ہوا تم باتیں بھی بہت خوب صورت کرتی ہو۔"

وہ متبسم ہوا تھا۔ دیا اس قدر جھینپی اور لجائی۔ مستقیم کی نظروں کے مخصوص مردانہ رنگ اسے خوب صورت رنگ میں نہلانے لگے۔ وہ آج بھی اس کی ان نظروں سے شپٹانے لگتی تھی جبھی منمنائی۔

"ایسے مت دیکھیں نا مجھے۔"

اور مستقیم کا قہقہہ چھت اڑانے لگا تھا۔

"کیوں نہ دیکھوں بھئی؟ بیوی محبوبہ بھی ہو تم میری۔"

مستقیم نے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے خود سے قریب تر کیا۔ وہ اس قدر گھبراہٹ کا شکار کسمسانے لگی۔

"میں کھانا لاتی ہوں۔ چھوڑیں۔"

"بھوک نہیں ہے یار۔ اور پلیز...... ٹوکو نہیں مجھے۔ محترمہ میکے جانے والی ہیں۔ پھر پتا نہیں کب لفٹ کرائیں ہمیں۔"

وہ اس میں مگن ہو چکا تھا۔ بھاری لہجہ مزید بوجھل اور خمار آلود ہوتا چلا گیا۔ دیا نے گھبرا کر ہنس کر بھرا اور۔ شرمگیں چہرہ اسی کے سینے میں چھپا کر آنکھیں موند لیں۔ زندگی اس پل مکمل تھی اور بہترین نعمت۔ جس کا وہ جی جان سے شکر بجالانے کو تیار تھی۔

☆......☆......☆

"سب ٹھیک تو ہے نا مستقیم! شادی کے بعد پہلی بار میکے جاتے لڑکی بہت ایکسائٹڈ ہوتی ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کوئی کمی نہ رہے۔ دادی کی خواہش تھی میں سارے سنگھار شادی کے بعد کروں۔ جبھی تو وہ مجھے ڈھنگ کا پہننے اوڑھنے نہیں دیتی تھیں۔ لیکن اب اگر مجھے سادہ دیکھا تو بہت خفا بھی ہوں گی اور یہ پراندہ......"

بات ادھوری چھوڑ کر وہ کھلکھلائی اور ست رنگا پراندہ جو چوٹی میں سجا رکھا تھا پکڑ کر اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔

"اماں کو بہت پسند ہے۔ وہ چاہتی تھیں میں ہر وقت پراندہ پہنوں۔ لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میرے تو بال ہی اتنے تھے۔ پراندہ پہن کر اور زیادہ مصیبت میں جان پڑ جاتی۔ جبھی پہنتی نہ تھی ان کی ضد کے باوجود، مگر آج یہی پہنوں گی تاکہ انہیں بھی اچھا لگے۔"

وہ خوش تھی۔ بہت پرجوش۔ یہ اس کی بات چیت ہر انداز سے عیاں تھا۔ چمکتا چہرہ، جگمگاتی آنکھیں زندگی سے بھرپور جوشیلی آواز۔ صحیح معنوں میں اس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ اس نے خوب ہی تیاری کی تھی اور مستقیم کا سارا جمع شدہ پیسہ لگ گیا تھا۔ لیکن وہ اسے نہال اور خوش دیکھ کر خوش تھا۔

"آپ کو اندازہ ہے مجھے دیکھ کر سب سے زیادہ خوش کون ہوگا؟"

راستے میں جب وہ بس کے اڈے پر اپنے روٹ کی بس کے انتظار میں کھڑے تھے دیا نے اپنا چوڑیوں سے بھرا ہاتھ اٹھا کر مستقیم کو شانے سے ہلا کر اپنی جانب متوجہ کیا وہ مسکرایا اور حجاب سے جھانکتی اس کی دلکش آنکھوں کو ناسمجھی کے تاثر سمیت تکنے لگا۔

"بابا! وہ مجھے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ دادی سے بھی زیادہ۔"

وہ چہکی تھی اور یونہی چہکتی رہی۔ اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا ضروری نہیں سب کچھ اس کی سوچ اور توقع کے مطابق ہو۔ کچھ الٹ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ ہٹ کے بھی۔ وہ ان کی بیٹی ضرور تھی۔ مگر لکا بیٹی جو اغوا ہو چکی تھی۔ وہ بیاہی ضرور گئی تھی۔ مگر ان کے ہاتھوں رخصت نہیں ہوئی تھی۔ نہ مرضی سے۔ وہ شرمندگی کا باعث تھی۔

وہ ذلت کا بھی باعث تھی۔

اور کچھ واقعات اتنے تلخ ہوتے ہیں کہ انہیں بھول جانا ہی بہترین اور فائدہ مند ہوتا ہے۔ خاموشی میں عافیت ہوتی ہے۔ یا پھر ان سے مکر جانا بھی سودمند ثابت ہوا کرتا ہے۔ وہاں ایسا کچھ ہو تا ہے۔ وہ نادان احمق اور جذباتی لڑکی آگاہ نہیں تھی، نہیں جانتی تھی۔ قربانی آزمائش اور کھونے کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اسے اس کے ساتھ چلنا ہے۔ نہ جانے کہاں تک۔ نہ جانے کب تک، وہ خوش و سرشار تھی اور مطمئن تھی مستقیم اس کے بالکل برعکس اسی قدر خائف، مضطرب اور خدشات کا شکار جبھی گم صم اور کھویا ہوا لگتا تھا۔

"افوہ..... دیکھیں ذرا میری عقل۔ مٹھائی لی نہ پھل وغیرہ، خالی ہاتھ جائیں گے بھلا۔"

وہ چلتی ہوئی ایک دم تھمی۔ وین انہیں اُتار کر جا چکی تھی۔ اور مین روڈ سے پہلی گلی ہی تو تھی جہاں گھر تھا اس کا۔ اس کے میکے کی دلفریب گلیاں۔ جہاں کھیلتے کودتے اس نے اپنا سارا بچپن گزار دیا تھا اور جہاں قدم رکھتے ہی ان گنت خوش گواریاں اس کا گھیراؤ کرتی چلی گئی تھیں اور بیگانے ہو جانے کے بعد میکے کی یہ فضائیں، یہ گلیاں اور ماحول کی اپنائیت، کس درجہ مانوسیت کا باعث لگتی ہے یہ بھی اس نے ابھی جانا۔

"اوہ.....سوری یار۔ مجھے ہی خیال کر لینا چاہیے تھا۔ تم رکو میں ابھی لاتا ہوں۔"

مستقیم اچھا خاصا شرمندہ نظر آیا تھا اس کی بات کے جواب میں۔ گلی کے نکڑ پہ پھلوں کے ٹھیلے اور چند قدم آگے سویٹ شاپ بھی تھی جسے وہ ابھی دیکھ چکا تھا۔ جبھی جیب تھپتھپاتا ہوا پلٹا تھا کہ دیا نے بے اختیار ٹوکا۔

"خلیفہ.....! بات سنیں۔ اب یہاں میں کیا کھڑی رہوں گی، یہ دیکھیں..... یہ ہے گھر ہمارا۔ پھل وغیرہ لے کر یہیں آ جائیے گا۔ ٹھیک ہے۔"

اس نے ہاتھ سے چند گز کے فاصلے پہ براؤن دو منزلہ سفید چونا پھری عمارت کی جانب اشارہ کیا۔ جس کے تازہ رنگ و روغن کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا اس کی قدامت چھپانے کو یہ کوشش اچھا بھرم ہے۔

"یار.....! تم میرے ساتھ ہی چلو ناں۔ اکیلا آتا کیسا....."

اس کے ہاتھ کے اشارے کے جواب میں سسرالی گھر پہ اس نے اک نگاہ ایسے ڈالی گویا سسرالیوں کو ہی دیکھا ہو۔ عجیب ہچکچایا ہوا انداز تھا۔

"ساتھ.....؟" دیا نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"یہ وہ شاپس ہیں جہاں ہم اپنے بچپن سے لڑکپن تک کروڑوں چکر لگا چکے ہیں۔ اور وہ کاکا چاچے ماے اب بھی مجھے پہچاننے میں اک لمحہ نہیں لگائیں گے۔ مستقیم مجھے شرم آئے گی نا پلیز! اور ویسے بھی اب مجھ سے اک لمحہ بھی صبر نہیں ہو رہا۔ جا رہی ہوں میں۔ آ جائیے گا اب خود ہی۔"

وہ بہت تیز تیز بولی تھی۔ مستقیم گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ دیا اب براؤن دروازے کے آگے کھڑی کال بیل پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ چہرے کی تمتماہٹ مستقیم اتنی دوری کے فاصلے سے بھی محسوس کر سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

انہوں نے دودھ ابالا اور آنچ دھیمی کر کے اس پر جھالی رکھ دی۔ تب ہی بیرونی دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے صاف ستھرے کچن کو مطمئن نظروں سے دیکھا اور باہر نکلتے اپنے پیچھے کچن کا دروازہ بند کر دیا۔ صحن کے اختتام پہ براؤن ملی سیڑھی کے پہلے زینے پہ گھات لگائے بیٹھی تھی۔ دروازہ بند ہوتا دیکھ کر جیسے اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔

"افوہ..... کون آ گیا اس وقت؟"

تسلسل سے بجتی بیل کی آواز پہ وہ جھنجھلاتی تھیں۔ ذیشان کی یہی عادت تھی۔ مگر ابھی تو اس کے کالج سے واپسی کا ٹائم نہیں ہوا تھا۔ لائبہ بھی دادی اور بابا کے ساتھ کچھ پہلے ہی شاپنگ کے ارادے سے نکلی تھی۔ انہیں اسی کا خیال آیا تھا۔ جبھی بھی تیز قدموں سے لپک کر بنا پوچھے چٹخنی گرا کر دروازے کے دونوں پٹ اک ساتھ وا کرتے بولی تھیں۔

"چنو گھر بھول گئی تھیں جو....."

مگر ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ لائبہ کی بجائے دیا کو اتنے عرصے بعد روبرو پا کے انہیں سکتہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا گویا۔ مگر اس کیفیت میں خوشی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ شاک اور ناگواری غالب تھی۔

"امی.....!!" وہ جیسے کراہی تھی۔ سسکی تھی اور اگلے لمحے ان کے ساکن و سامت وجود سے آ چمٹی اور تب..... تب اس کا لمس پا کر ہی جیسے امی گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھی تھیں۔ اگلے لمحے ان کے چہرے..... ان کی آنکھوں میں رعونت و تنفر امڈ آیا۔

"تم.....؟" انہوں نے ایک خفیف سے جھٹکے سمیت اسے خود سے الگ کیا اور ایک طرح سے دھکیلا۔ دیا ہکا بکا ہو کر رہ گئی۔

"کیوں آئی ہو اب؟"

ان کا لہجہ کڑا تھا۔ شاید ملامتی بھی۔ دیا شاکڈ ہونے لگی۔

"امی..... لم..... میں۔"

وہ سسکی اور جیسے رو ہی دی۔ ان کا یہ اجنبی بیگانہ انداز جیسے اسے دو دھاری تلوار بن کر کاٹ رہا تھا۔ وہ اسے پہچان نہ پاتیں تو اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ اسے جان لینے کے باوجود جھٹلا رہی تھیں تو سبب کا اندازہ کون کر پاتا۔ نہ سوال، نہ جواب، نہ وضاحت، نہ صفائی، نہ گلہ، نہ کھار، نہ رس، کچھ بھی تو نہیں۔ کوئی حق بھی نہیں اور صرف سزا اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے روبرو کھڑی ہے۔

"چلی جاؤ یہاں سے۔ اس سے پہلے کہ کوئی دیکھ لے، جاؤ۔"

انہوں نے ہیجان زدہ مگر دبی آواز میں کہتے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ مگر اس سے قبل وہ اس کا بھرپور جائزہ لے چکی تھیں۔ اس کا بھرا بھرا جسم جو متوقع تبدیلی کا مظہر تھا۔ از خود اس پہ بیت جانے والی داستان کا گواہ بنا ہوا تھا۔ دیا گنگ ہونے لگی تھی۔ ان کی نظروں کی چبھن ان کے لہجے کی کاٹ سے...

"ماں بننے والی ہو تم؟ بچہ جائز ہے یا......؟"

"امی......"

وہ ایسے پھڑ پھڑائی اور بے ساختہ بلکی جیسے جانور چھری تلے آخری بار کسمسائے۔ لبالب پانی سے بھری آنکھیں لمحے کے ہزارویں حصے میں چھلک گئیں۔ وہ خود پر ضبط کھو کر پھپھک کے رو پڑی۔

"میری شادی ہوئی ہے امی اور......"

"دیا میری بیوی ہے اور یہ ہمارا جائز بچہ ہے۔"

دیا کی بھراہٹ زدہ آواز پہ مستقیم کی مضبوط بھاری آواز غالب آ گئی تھی۔ یونہی بھرا ہوا دروازہ کھول کر وہ جانے کب اندر آ گیا تھا۔ دیا حواسوں میں کہاں تھی جو جان پاتی۔ انہوں نے [illegible] اس اونچے پورے مضبوط جسم کے مالک بے حد شاندار نوجوان کو دیکھا تھا۔ پھر گہرا سانس بھرا اور بے حس مگر کٹھور لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

"دیکھو لڑکے تمہاری جیسے بھی اس سے شادی ہوئی مجھے دلچسپی نہیں ہے جاننے میں۔ میں بس جانتی ہوں کہ اس کی وجہ سے ہمارا پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا۔ مزید کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں......" انہوں نے توقف کیا پھر بالخصوص دیا کو دیکھا جس کے آنسو گہرے صدمے کی شدت کے باعث بارش وار برستے تھے۔

"دیا! لائبہ کی شادی بڑی مشکلوں سے طے ہوئی ہے۔ ہمارے معیار سے بہت کم تر درجے پر اور یہ بھی تمہاری وجہ سے، ہم تمہیں مردہ سمجھ کر تم پہ رو دھو کر صبر کر چکے۔ سمجھ لو ہماری زندگی میں تمہاری کہیں کوئی گنجائش باقی نہیں۔ میری مجبوری کو سمجھو۔ جیسے ہم تمہارے بغیر جینے کے عادی ہو گئے ویسے ہی تم بھی ہم پہ صبر کر جاؤ۔ واپس چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ کوئی تمہیں دیکھے۔ میں...... ہم مزید نقصان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" انہوں نے دیا کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے ایک ایک لفظ پہ زور دیا تھا۔ مستقیم کے ہاتھوں سے فروٹ اور مٹھائی کے شاپر چھوٹ گئے۔ کسی بہت خصوصی اہمیت کی تو توقع تھی ہی نہیں اسے مگر اس قدر ذلت آمیز سلوک کا بھی نہیں...

اپنی ماں کا بدلا ہوا رویہ دیکھا تھا۔ آج اک اور ماں کی نظروں کے بیگانے رنگ دیکھے تو برسوں پرانے زخم پھر رسنے لگے تھے۔ کچھ کہے بغیر اس نے دیا کو شانوں سے تھام لیا۔

"آؤ دیا! چلتے ہیں۔"

اس کا لہجہ مدہم اور ٹوٹا ہوا تھا۔

"ہاں جاؤ اور اپنا چہرہ پھر ڈھانپ لو۔ میں نے کہا نا۔ یہاں سب تمہیں بہت پہلے مار چکے۔"

انہوں نے گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونکی تھی۔ مستقیم کے ہونٹوں پر زہر خند مسکان اتری اور ہر لمحہ گہری ہوتی چلی گئی۔ واپسی کا یہ سفر بہت کٹھن تھا۔ بہت تکلیف دہ۔ وہ سارے رستے روتی سسکتی رہی تھی۔ تڑپتی رہی تھی۔ کہنے کو بہت کچھ تھا مگر وہ دونوں خاموش تھے۔ یوں جیسے الفاظ کھو گئے ہوں اس اوکھے غیر متوقع دکھ کے سامنے۔

☆......☆......☆

پھر وہ دنوں نہیں ہفتوں تک سنبھل نہ پائی تھی۔ ملول، غمگین، اور شرمسار۔ مستقیم سے نظریں بھی چار نہ کرتی اور مستقیم...... وہ اسے سمجھاتے بہلاتے بھی تھکنے لگا تھا۔ مگر جھنجھلاتا نہیں تھا۔ دونوں نے جان لیا تھا۔ اس کائنات میں بس وہی اک دوجے کے لیے زندگی جینے کا باعث ہیں۔ اس وقت بھی مستقیم تھرموس سے روئی لایا تھا۔ ٹرے سجا کر اس کے سامنے رکھی پھر اس کی جانب دیکھ کر بالخصوص مسکرایا۔

"دیا! اب بس بھی کرو یار۔"

اور جواب میں دیا کی آنکھیں پھر سے جھلملاتی چلی گئی تھیں۔

"آپ ٹھیک کہتے تھے مستقیم! اغوا شدہ اور گھر سے بھاگنے والی لڑکی سے معاشرہ ہرگز امتیازی سلوک نہیں کرتا۔ مگر وہ تو میرے اپنے...... میری ماں تھیں۔"

وہ بے اختیار سسکنے لگی۔

"مگر یہ بھی تو سوچو وہ صرف تمہاری ماں نہیں تھیں دیا! ان کی باقی اولادوں پر بھی ان کا حق تھا۔"

مستقیم کا انداز ناصحانہ تھا۔ مگر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں خلیفہ! وہ میری بھی تو ماں تھیں۔ صرف لائبہ کی تو نہیں۔"

وہ سسک کر کہہ رہی تھی۔

"ان کی مجبوری کو سمجھو دیا! سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ تمہیں صبر آ جائے گا۔ انہوں نے تمہیں آباد دیکھ لیا تھا۔ تم دنیا میں بے سہارا نہیں۔ وہ جان کر مطمئن ہو گئی تھیں۔ اب وہ دوسری بیٹی کی جانب سے

بھی ایسے اطمینان کی خواہاں تھیں تو عجب تو کچھ بھی نہیں تھا۔"

اس کے پُر رسان انداز پہ دیا ساکن و جامد بیٹھی رہ گئی۔ صاف لگتا تھا وہ اسے بہلانے کی خاطر صورت حال کو اس قدر جامع بنا کر اس کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ سب کچھ ہو جانے کے باوجود مثبت رکھ کر سوچنا بھی مثبت عمل کی جانب پیش رفت کا ذریعہ بنتا ہے۔ مستقیم اس ذریعہ کا خواہاں تھا۔ وہ ٹوٹی ہوئی تھی وہ اسے جوڑ رہا تھا۔ بالکل ویسے جیسے کبھی دیا نے اسے جوڑا تھا۔ اسے جوڑنا چاہا تھا۔ حالات کی تمام تر مایوسی اندھیرے کے باوجود۔

"میں کتنے دنوں سے سوچ رہا ہوں کام پہ جانے کا، مگر تمہاری جانب سے مطمئن نہیں ہوں۔ دیا! پلیز خود کو سنبھالو۔ تمہیں پتا ہے اب یہ ٹینشن ہمارے بچے پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔"

نوالہ اس کے منہ کی جانب بڑھاتے اس کا لہجہ اس کا انداز زندگی کی جانب بلاتا ہوا تھا۔ حوصلہ افزا اور خوش امیدی کا باعث۔ دیا بوجھل دل کے ساتھ جبراً ہی مسکرائی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

مستقیم نے اس کا سر تھپکا تھا پھر اسے کھانے کی جانب متوجہ کیا۔ دیا بے دلی سے لقمے لینے لگی۔ مستقیم کے تلخی سے بھرتے ذہن میں کبھی کی پڑھی نظم کے اشعار ابھرنے لگے جو اس وقت کی کیفیات کی بالکل صحیح عکاس تھی۔

ہمارے قافلے کا ہر گھڑی منظر بدلتا ہے
کبھی رہزن بدلتا ہے کبھی رہبر بدلتا ہے
لباس فخریہ کی آرزو تو سب ہی کرتے ہیں
کہاں ملبوس کے اندر کوئی پیکر بدلتا ہے
تم اک انساں کے بدلے ہوئے تیور پہ حیراں ہو
یہ وہ موسم ہے پنچھی بھی اپنے پر بدلتا ہے

"آپ بھی [illegible] میں نا مستقیم!"

دیا کے ٹوکنے پہ وہ چونکتا ہوا جیسے خیالوں سے باہر آیا، اور سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے ساتھ نوالے لیتے ہوئے وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ ان کٹھن حالات میں اللہ نے انہیں اک دوسرے کا سہارا، آسرا اور آس بنا دیا تھا۔ ورنہ زندگی کی تنی بالآخر بہت جلد ہڑپ کر لینے میں کامیاب ٹھہرتی۔

☆ ☆ ☆

دیا نے آخری سلائی لگا کر مشین روک دی۔ قینچی سے دھاگہ کاٹا اور جھٹک کر شرٹ کی تہہ لگانے کے بعد یہ پیس بھی باقی قمیضوں کے ساتھ شاپر میں ڈال کر گرہ لگا دی۔ پھر اٹھی اور ادھر ادھر بے ترتیب ہوتی ہوئی چیزیں اٹھا کر ان کے ٹھکانوں پر رکھنے لگی۔ وہاں تھا ہی کیا...... دو چار پائیاں، چند گھسے ہوئے بد رنگ اس کے اور مستقیم کے جوڑے اور کچھ دوسری انتہائی ضرورت کی چیزیں۔ جنہیں ہر بار اجرت ملنے پہ وہ خرید لاتی تھی۔ یہ ترقی تھی اس کی۔ یہی کامیابی۔ مگر وہ پھر بھی خوش رہنا چاہتی تھی۔ وہ حقیقت یہ تھی کہ اسے امی کا لہجہ بھولتا تھا نہ آنکھوں کا تاثر...... کسی میں بھی تو اس کے لیے گنجائش نہیں تھی۔

وہ ماں تھیں......؟

وہ خود سے سوال کرتی تو آنکھیں نم ہونے لگتیں۔

ماں ایسی بھی ہوتی ہے؟

ماں ایسے کر لیتی ہے اولاد کے ساتھ؟

وہ ابھی ماں بھی نہیں تھی۔ اس مرحلے میں تھی مگر اسے اپنے بچے سے ایسی انسیت ایسی رچی محبت ایسی کہ وہ محسوس ہوتا کہ اکثر اس کے لمس کو پانے کی شدید خواہش اسے گہری نیند سے جگا دیا کرتی۔ وہ تخیل تصور میں اسے اپنی گود میں ہمکتے محسوس کرتی اور تھکتی نہ تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا لمس، اس کا روئی کے گالے جیسا وجود کیسی گدگدی سی ہوتی تھی دیا کو سوچ کر بھی۔ جب بھی تو اتنے حوصلے سے وہ اس مرحلے کی ہر اذیت کو بڑی ہمت اور جرأت سے جھیل رہی تھی۔

اسے مستقیم کے دکھ کا اندازہ ہوا۔ وہ بھی ایسے ہی ٹھکرایا گیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی ٹوٹنے کے مرحلے سے گزرا تھا۔ اسے تو مستقیم نے سنبھال لیا تھا۔ تب مگر وہ اکیلا تھا۔ پتا نہیں ان کے راستے ایک ہوئے تھے تو نصیب کیوں ایک جیسے ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ بار بار خود سے عہد باندھنے لگی وہ کبھی اپنی اولاد میں امتیازی سلوک کرے گی نہ کبھی کیسے ہی حالات ہوں انہیں یوں ٹھکرا کر ایسی اذیت سے دوچار کرے گی جس کا شکار اسے اور مستقیم کو ہونا پڑا۔

سورج کی کرنوں کی تپش بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ دھوپ سمٹتی دیواروں پہ جا چڑھی۔ تب اس نے کمرے سے نکل کر رات کے کھانے کی تیاری کا آغاز کیا۔ یہاں اس گھر میں لائٹ تو تھی مگر وہ بچت پسند بہت کم بجلی استعمال کرتی اور سر شام ہی کام نپٹا لیا کرتی۔ دال صاف کر کے رکھی تھی۔ اس نے ہانڈی میں پانی ڈالا اور دال دھو کے چولہے پر چڑھا دی۔

اب اسے آگ جلانے میں بالکل کوئی دقت نہیں ہوا کرتی تھی۔ کچھ دیر چولہے کے آگے بیٹھی راکھ کریدتی رہی پھر اٹھ کر بیرونی دروازے کی جانب گئی۔ جس کی دیوار نسبتاً چھوٹی تھی۔ جیسے کچے گاؤں کے گھروں کی ہوا کرتی ہیں۔

اس کی نظریں گاؤں کی طرف آنے والی کچی سڑک پہ جم گئیں۔ جہاں اس وقت عملاً بھینسوں اور کسانوں کا قبضہ تھا۔ گاؤں کے باسی دن بھر اپنے جانوروں کو چرانے اور نہر پہ نہلانے کے بعد اب واپس لوٹ رہے تھے۔ برگد اور پیپل کے درخت پہ چڑیوں اور کوؤں کے علاوہ دیگر طائروں نے شور مچا رکھا تھا۔ فضا میں تندور اور چولہوں سے نکلنے والے دھوئیں کے ساتھ مختلف پکوانوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ مارچ کے مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی حساب سے گندم کے کھیت میں ہری شاخیں بالشت بھر اونچی ہو گئی تھیں۔ سورج اب اپنے اختتامی مرحلے میں تھا۔ دیا کو مستقیم کا انتظار تھا۔ جو آج پہلے دن کام پہ گیا تھا۔ مزید کتنی دیر وہاں کھڑی وہ اس کی راہ تکتی رہی تھی۔ مغرب کی اذان کی آواز سن کر وضو کے ارادے سے اندر آ گئی۔ خود کو ہزار سنبھال لیا تھا۔ مگر اک اداسی اور بے چینی تھی کہ ہر لمحہ دل میں گھر کرتی جاتی تھی۔ یہ خیال کہ وہ اب کبھی بھی اپنوں سے نہیں مل پائے گی۔ جیسے کوئی کند چھری تھی۔ جو اسے جھنجوڑتی اور کاٹتی رہتی تھی۔ حالانکہ اس کی اس بات کو دیکھتے مستقیم نے اسے اس کی بات یاد بھی کرائی تھی۔

"تم تو سب کچھ کھو کر بھی میرے ساتھ پہ قانع و شاکر رہ سکتی تھیں اور......"

مجھے سب کچھ یاد ہے خلیفہ! کچھ بھی نہیں بھولا۔ جبھی تو دکھ کی اس شدت میں بھی باحواس نظر آتی ہوں آپ کو۔ ورنہ......"

"بھول جاؤ دیا! یہی بہتر ہے۔"

خلیفہ نے دانت بھینچ لیے تھے اور وہ آنسو ضبط کرنے لگی تھی اور وہ آنسو تب ضرور بہتے جب ان کے الفاظ دل میں شگاف ڈالتے اور مستقیم سامنے نہ ہوتا۔ اب بھی دُعا کو ہاتھ پھیلاتے ہی غم آنکھوں کے رستے بہنے کو تیار تھا۔ ٹپ ٹپ اس کی گلابی شفاف و گداز ہتھیلیوں پر کتنے آنسو گرے تھے۔ تب ہی بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ دیا نے آنسو پونچھے۔ جائے نماز تہہ کی اور تیز قدموں سے بیرونی دروازے کی جانب آ گئی۔

"بہت دیر کر دی آپ نے۔"

"وہ گرد مٹی اور پسینوں میں نہایا تھکا ہوا پژمردہ اس کے سامنے تھا۔

"ہاں بس کام میں دیر سویر ہو جایا کرتی ہے۔"

اسے سامنے سے ہٹا کر مستقیم دروازہ بند کرتا ہوا اندر آ گیا۔ دیا نے لپک کر پہلے چارپائی بچھائی تھی۔ مستقیم نے ہاتھ میں پکڑا شاپر چارپائی پہ رکھ دیا۔ جس میں کھیرے اور ککڑی تھی اور اپنی قمیض کے بٹن کھولنے لگا۔ وہ جانتا تھا دیا کو سلاد پسند ہے کھانے کے ساتھ اور یہ سستا ترین شوق بھی آج کل بہت شاہانہ خرچہ لگتا تھا۔

"میں کپڑے رکھتی ہوں آپ کے، پہلے نہا لیں۔"

دیا الٹے قدموں اندر بھاگی۔ مستقیم نہا کر باہر نکلا تو دیا کھانے کی ٹرے سجائے اس کی منتظر تھی۔

"سارے کھیرے کیوں کاٹ دیے، میں تمہارے لیے لایا تھا۔"

اس کی نگاہ نفاست سے سجے سلاد پہ پڑی تو ٹوکے بغیر نہیں رہا۔ دیا نرمی سے مسکرائی۔

"اور مجھ سے آپ کے بغیر کچھ نہیں کھایا جاتا۔"

مستقیم نے پلیٹ اٹھائی مگر منہ سے بے اختیار سسکاری سی نکل گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسے پلیٹ چھوڑتے پا کر دیا نے پریشان کن نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ جس کے اجلے چہرے پہ خفیف سی سرخی کا رنگ اتر آیا تھا۔

"کچھ نہیں۔ پانی دینا مجھے۔"

مستقیم نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ دیا کی نگاہ اس کے ہاتھ پر ہی تھی۔ مستقیم کی کوشش ناکامی کا شکار ہوئی تھی۔ جب بھی دیا اس کے ہاتھوں پہ اترے ہوئے زخم اور آبلے دیکھ چکی تھی۔ جبھی ہاتھ پکڑ کر سیدھے کرتے وہ چند ثانیوں کو شدید صدمے کے باعث کچھ بول نہیں پائی۔ مستقیم کے ہاتھوں کے آبلے پھٹنے کے بعد زخم مزید گہرے کر چکے تھے۔ شفاف زخموں کے ساتھ خون آلود بھی تھیں۔ دیا کی نم آنکھیں اتنی تیزی سے چھلکیں کہ بے قرار موتی ٹپ ٹپ اس کے ہاتھوں پر برسے تھے۔ اگلے لمحے وہ اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے انہی پر چہرا ٹکائے سسک پڑی تھی۔ مستقیم کے چہرے پر ناقابل بیان کرب کا تاثر ابھر آیا۔

"پلیز دیا اس طرح کرو گی تو میں ہار جاؤں گا۔ میرا عزم میری ہمت ہار جائے گی۔"

کچھ دیر ہونٹ بھینچے رکھنے کے بعد وہ بے حد بوجھل اور تھکن زدہ لہجے میں بولا تھا۔ دیا نے ہچکیوں کو روکتے اس کے ہاتھوں کو لبوں سے چھوا تھا۔ اور ہونٹ بے دردی سے کچلتے آنکھیں رگڑ رگڑ کر پونچھنے لگی۔ مگر صورت حال یہ تھی کہ وہ جتنا خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ضبط اتنا ہی بکھرتا جاتا تھا۔

آنسو، آہیں، بے قراری، مستقیم سخت مضطرب ہوا۔

"یہی تو چاہتی تھیں تم دیا! پھر اب ...."

"میرا اتنا ضا رزق حلال تھا۔ خلیفہ میں ...."

"اور رزق حلال اتنا آسان نہیں ہوا کرتا۔ خاص طور پر ان حالات میں ——— میں اک مفرور ڈاکو ہوں۔ مت بھولا کرو تم۔"

وہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوا۔ اس کے لہجے میں کڑواہٹ بھی تھی اور بے بسی بھی۔ دیا کے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ اٹھی تھی۔ اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ واپس لوٹی تو ہاتھ میں سرسوں کے تیل کی شیشی تھی۔ تیل میں تھوڑا سا پانی ملا کر اس نے اس کے زخموں پر نرمی سے لگایا تھا پھر کپڑے کی پٹی باندھتے وہ منہ ہی منہ میں سورہ فاتحہ پڑھ کر دم بھی کرتی رہی تھی۔ جب یہ سمت تنہا ہوتی ہے اور بے یار و مددگاری بھی۔ تب خدا سے بڑھ کر کوئی حامی و ناصر اور ہمدرد و غمگسار نہیں لگتا تھا۔ اس کا بھی سارا دھیان، ساری توجہ عرصہ ہوا سمٹ کر اللہ پہ آ گئی تھی۔ اور یہ سچ ہے بھی حالات چاہے جیسے بھی ہوں۔ اللہ سے بڑھ کر کوئی حامی و ناصر ہمدرد و غمگسار نہ ہوتا ہے نہ ہوگا۔ مگر انسان جو ازل سے ناشکرا اور کم ظرف ہے۔ یہ اہم راز مصیبت پڑنے پہ تکلیف میں مبتلا ہونے پہ جان پاتا ہے اور جان بھی وہی پاتا ہے۔ جسے اللہ کی جانب پلٹنا ہو اور انسانی تاریخ گواہ ہے ہر ٹھوکر کھانے والا ضروری نہیں سنبھلنے والا بھی ہو۔ یہ سنبھلنا ہی خوش بختی کی علامت ہے اور دیا اس خوش بختی پہ اللہ کی شکر گزار تھی۔

"میں خود کھا لوں گا۔ ابھی معذور تو نہیں ہوا ہوں۔"

دیا نے نوالہ اس کے منہ کی جانب بڑھایا تو مستقیم کے چہرے پر بدمزگی پھیل گئی تھی۔ روزگار کا پہلا کٹھن اور کڑا دن اس کا حوصلہ اور ہمت بہا لے جانے میں کامیاب رہا تھا۔ دیا کا دل غم اور تفکر سے بھرنے لگا۔ وہ جانتی تھی یہ تلخی حالات کی بخشی ہے۔ اس کا برا کیا ماننا۔

"لیکن میرا دل کر رہا ہے کہ اپنے ہاتھ سے کھلاؤں آپ کو۔"

وہ زبردستی مسکرائی تھی اور یاس زدہ نظروں سے مستقیم کے خفگی چھلکاتے چہرے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر گہرا سانس بھر کے جیسے ہتھیار ڈال دیے اور اس کے ہاتھ سے کھانے پر رضامند ہو گیا۔

دیکھو مجھے ڈر لگتا ہے غصے سے تمہارے
تم مجھ سے خفا ہو بھی تو اظہار نہ کرنا

وہ ہولے سے دھیرے سے گنگنائی تو مستقیم نے بے طرح چونک کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر یونہی تکتا رہا۔ کچھ جھنجھلاہٹ سے۔ کچھ غصے سے۔ پھر اسے خائف ہوتا پا کر بے اختیار ہنس دیا تھا۔ دیا کی حلق پہ اٹکی جان جیسے خلاصی پا گئی۔

"تھینک گاڈ! کچھ تو موڈ بحال ہوا۔"

وہ واقعی ریلیکس لگ رہی تھی۔ مستقیم کے ذہن و دل اور جسم کا ہیجان آمیز تناؤ بھی دور ہونے لگا تو اس نے گہرا پرسکون سانس بھرا اور دیا کا ہاتھ پکڑا دیا اور دھیرے سے دبایا۔

"دیا! یہ سچ ہے۔ زندگی کے اس مقام پہ اگر تم میرے ساتھ ہوتیں تو میں خودکشی کر لیتا۔ مجھے ایسی زندگی نہیں جینی تھی۔ جس کا کوئی مقصد نہیں تھا۔"

اس کی رنگت میں کسی اضطراب کا احساس پھر سرخیاں بھر رہا تھا۔ دیا نے کچھ کہے بغیر چنگیر اٹھا کر سائیڈ پہ رکھی اور پھر خود اس کے پیروں میں اس طرح بیٹھی کہ سر اس کے گھٹنوں پہ رکھ دیا تھا۔

"اللہ پہ بھروسہ کریں مستقیم! اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوا کرتی ہے۔ میں نے یہ جانا ہے تو بہت پرسکون ہوں۔ آپ بھی محسوس کر کے دیکھیں۔"

اس کا لہجہ مدہم تھا۔ پرسکون اور آسودہ۔ اس کا انداز دل موہ لینے والا تھا۔ اس کی ادا بہت پیاری تھی۔ وہ صرف خوب صورت نہیں تھی۔ دل بھی حسین رکھتی تھی۔ اسے محبت کرنا آتی تھی۔ جب بھی وہ مضطرب ہوتا۔ بے قرار ہوتا دیا کی محبت نرم پھوار کی صورت اس پر اپنی عنایت برسانے لگتی۔ حالات کی سختی۔ تمام تر تلخی جیسے بھاپ بن کر اڑنے لگتی۔ اگر وہ سمجھتا اگر وہ جانتا تو یہ بھی اللہ کی محبت تھی اس پر۔ اس کی محبت کا اظہار جو وہ دیا کی صورت اس پہ نازل فرما رہا تھا۔ اگلے دن دیا نے اسے کام پہ جانے سے منع کیا تھا مگر مستقیم نے انکار کر دیا۔

"بڑی مشکلوں سے کام ملا ہے مجھے دیا! ان کے پاس مزدوروں کی کمی نہیں ہے۔ ایک دن کی چھٹی گویا کہ مستقل چھٹی ہو گی اور جب زندگی کا یہی ڈھب ہے تو مجھے اس نازک مزاجی کو خیر باد کہنا ہو گا۔ بات ایسے بننے والی نہیں ہے۔ اس گھر کو۔ تمہیں بہت ساری توجہ اور بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت پیسے سے ہی پوری ہو گی۔"

اس کے پُر رسان لہجے پہ دیا کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ گرمی کا موسم شروع ہو رہا تھا اور دیا کے پاس موجود لباس جگہ جگہ سے گھس چکا تھا کثرت استعمال کے باعث تن ڈھانپنے، پیٹ بھرنے کو پیسہ بنیادی اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ اس

کے جانے کے بعد وہ خود بھی سلائی کا کام نپٹانے لگی۔ اللہ جانے مہنگائی بہت زیادہ تھی یا ان کی ضروریات کہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرنے کے باوجود بھی اخراجات پورے نہیں ہو پاتے تھے اور ضروریات منہ پھاڑے نگلنے کو تیار نظر آتیں۔ مکان کا کرایہ، بجلی کا بل اور گھر کی ہر چیز کا نئے سرے سے بننا...... زندگی واقعی آزمائش تھی۔ جو اس کی خوب صورتی۔ دلکشی نزاکت و جاذبیت کو بے دردی سے نگل رہی تھی۔ وہ کیا سے کیا ہوتی جا رہی تھی اور شاید اسے اس بات کا احساس بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس بات کی فکر کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ کچھ دن قبل جب شام کے ڈھلتے سایوں کے ہمراہ وہ اپنے اور مستقیم کے اکلوتے جوڑے اکٹھے کر کے دھونے کے ارادے کے صحن میں لگے نلکے کے پاس آ کر بیٹھی تب بھی اسے اس تبدیلی کا احساس نہیں تھا۔ شاید ماحول یا پھر حالات تغیر نے از خود اس کے اندر پیدا کر دی تھی۔ مگر کمرے سے نکل کر آتے مستقیم نے ضرور محسوس کیا تھا اور اسے دیکھتا بے اختیار تھم سا گیا تھا۔ نلکے کے نیچے پکے فرش پہ پلاسٹک شیٹ بچھائے دیہاتی عورتوں کے انداز میں دوپٹے کو سر پہ منڈھ کر دونوں سروں پر پیچھے کی جانب گرہ لگائے، آستین چڑھائے چھپ چھپ کپڑوں پر ہاتھ مار رہی تھی۔ سورج کی نارنجی گلابی کرنیں اس کے زردی مائل اجلے چہرے پر لالیاں بکھیرنے کی اپنی سی کوشش میں معروف تھیں۔

اس نے جو لباس پہن رکھا تھا۔ وہ کثرت استعمال کے باعث گھس چکا تھا۔ جسے جسم کی بدلی ساخت کے باعث اس نے سائیڈوں کی سلائیاں کھول کر دوبارہ لگائی تھیں۔ جب بھی وہ کچھ اور بھی عجیب اور برا لگتا تھا۔ مستقیم کا دل جانے کس کس احساس کے تحت بھاری اور بوجھل ہوتا چلا گیا۔ یہ وہ لڑکی تھی، جس نے اس پر اس کے دل پہ حکومت کی تھی۔ جس کے سامنے وہ اتنا بے بس ہوا تھا کہ خود پر ہر قسم کا اختیار کھو دیا تھا۔ اتنی اہم اتنی ہی خاص تھی وہ اس کے لیے۔ جب بھی تو اس کی خواہش تھی وہ اس من موہنی سی لڑکی کے قدموں میں ساری دنیا کی نعمتیں ڈھیر کر دے مگر......

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ ایسے؟"

دیا اس کی نظروں کی تپش محسوس کر کے ہی متوجہ ہوئی تھی۔ اس کی محویت کے عالم پہ قدرے مسکرائی تھی۔ مستقیم چونک سا گیا اور گہرا سانس بھر کے خود کو سنبھال لیا۔

"یہی کہ تم چند دنوں میں ہی پکی دیہاتن لگنے لگی ہو۔"

دیا اس کی بات سے زیادہ اس کی نظروں پہ جھینپی تھی اور گیلے ہاتھ اٹھا کر کپڑا سر سے کھولنے لگی۔

"دادی ایسے کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ دوپٹہ تنگ نہیں کرتا نا پھر۔"

خفت زدہ سی وضاحت پیش کرتی وہ مستقیم کو کھل کر ہنسنے پہ اکسا گئی تھی۔

"رہنے دو دیا! اچھی لگ رہی ہو مجھے تو ایسے بھی۔"

وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ دیا نے ان سنی کی اور دوپٹہ کھول کر پھیلا لیا۔ پھر گیلا کپڑا نلکے میں دیکھ کر کھنگال کر باہر نکالا۔ اس کے بازوؤں کی آستینیں کہنیوں تک مڑی ہوئی تھیں۔ جگمگاتے ہوئے اجلے گداز بازو شفق رنگ کرنوں اور پانی کے قطروں سے جھلملا رہے تھے۔ مستقیم کی نگاہ اس پہ ٹھہر گئی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس جاذب نظر لڑکی کے حسن کو گہن لگ جائے۔ اس کی خاطر ہی تو سب چھوڑ دیا تھا اس نے وہ لمحہ لمحہ گھلنے گوارا کیسے کر لیتا۔ وہ آگے آیا اور ہاتھ بڑھا کر دیا کا بازو گرفت میں لے لیا۔ پانی کے ٹھنڈے قطرے اس کی ہتھیلی میں جذب ہو گئے۔ اس ٹھنڈک میں بھی اک لو دیتا احساس تھا۔ آنچ تھی۔ جو جذبوں کی تھی۔ جو محبت کی تھی۔ جس کا اثر براہ راست دل پہ ہوتا تھا۔ دیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نیم باز آنکھوں میں عجیب سا سوز اور شکوہ بھرا ہوا تھا۔

"صرف اپنے دل کی نہیں۔ اس سلطنت کی بھی ملکہ بنایا تھا تمہیں، کیوں اتنے مشکل راستوں کا انتخاب کر بیٹھی ہو دیا!"

دیا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دھلے ہوئے کپڑے اٹھاتے ہوئے اس کی گرفت سے نکلنے والے بازو کو دیکھا۔ نازک شفاف جلد پہ مردانہ انگلیوں کی گرفت کے دباؤ اور سختی سے سرخیاں سی پھیل گئی تھیں۔ بازو کا وہ حصہ سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ "اس جہان کی تن آسانی اس جہان میں بہت نقصان کا باعث بنتی ہے مستقیم! علم رکھتے ہوئے بھی عمل نہ کرنا بہت بڑی بدنصیبی ثابت ہوا کرتی ہے۔ یہ آزمائش [illegible] تو جلد کٹ جائے گی۔ میں ہمت ہار کر اپنے رب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔"

اس نازک نظر آنے والی لڑکی کا حوصلہ مضبوط اور لہجہ مستحکم تھا۔ مستقیم اسے دیکھتا رہ گیا۔

"اور اگر تم تھک گئیں؟ اگر تم پچھتائیں......؟"

جانے وہ اسے آزما رہا تھا یا خود کو۔ دیا ضرور تڑپ گئی تھی۔ لرز گئی تھی۔

"اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے خلیفہ!"

اور وہ ندامت سے سر جھکا کر رہ گیا تھا۔ دیا کو خوف آنے لگتا۔ اسے اپنے سے زیادہ مستقیم کی فکر ہونے لگتی تھی۔ وہ ایسی طرز زندگی کا عادی نہیں تھا۔ وہ تھک بھی سکتا تھا پچھتا بھی۔ یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ تبھی اس کی دعاؤں میں شدت آتی جاتی تھی۔

☆......☆......☆

ملے ہیں بعد مدت کے بابا کے سرد ہیں لہجے
کہ جلنا بھی نہیں ممکن، پگھلنا بھی نہیں ممکن
امیدیں ٹوٹ جانے سے تعلق ٹوٹ جاتے ہیں
دلوں میں حسرتیں لے کر بہلنا بھی نہیں ممکن
بہت ناکامیاں لے کر ہوئے ہیں خاک کے قیدی
چلو اب آج سے گھر سے نکلنا بھی نہیں ممکن
اسے اتنا نہ سوچا کر، تیری عادت نہ بن جائے
پھر ایسی عادتیں محسن! بدلنا بھی نہیں ممکن

وہ ہچکیوں سے روتی تھیں۔ جانے کیسا روگ لگا تھا جو بڑھتا جاتا تھا۔ بابا حیران دادی پریشان ہوئی جاتیں۔ لائبہ کی عزت وآبرو سے ہو جانے والی شادی تو ایسی تسلی بخش احساس تھا جو تمام فکروں سے آزادی بخش گیا تھا۔ کچھ دن قبل ہی دونوں مستقل انگلینڈ رہائش پذیر ہونے کو رخصت ہوئے تھے۔ پھر یہ رونا عجیب تھا۔ یہی تو سب چاہتے تھے۔ لائبہ پہ دیا کے حوالے کا معمولی سایہ بھی نہ پڑے۔ اب جب کہ اللہ نے خواہش پوری کر دی اور اس کے چانس تک ختم ہو گئے تو یہ اضطراب سمجھ سے باہر تھا۔ دیا کو بھلائے اور اس زخم کو سہتے تو ایک خاموش سمجھوتہ ہو ہی چکا تھا۔

''کیوں ایسے خود کو ہلکان کرتی ہو بیٹی! بچی اپنے گھر کی ہوئی ہے۔ عزت سے رخصت ہو کر اپنے گھر خوش بھی رہے گی انشاءاللہ! بس دُعا کرو اور حوصلہ جمع رکھو۔''

دادی نے بہو کا شانہ تھپتھپا کر اپنے مخصوص دھیمے انداز میں تسلی سے نوازا تو ان کے منہ سے کراہیں نکلتی چلی گئیں۔

''اس کی جانب سے تو بے فکری ہی ہے۔ فکر تو اس بدنصیب کی ہے۔ جو جانے کیسے زندگی کے دن پورے کرتی ہو گی۔ میرے جگر کا ٹکڑا تھی وہ اماں! سب سے پہلی اولاد۔ بھولنا اتنا آسان تھوڑی ہے۔''

وہ زار وقطار رونے لگیں۔ دادی کے اعصاب پر صدمے کی تیز ضرب لگی تھی۔ یہ دکھ ایسا تھا جس پہ قرار نہیں آتا تھا۔ مرے ہوؤں پہ صبر آ جانا قدرتی عمل ہے۔ بچھڑے ہوؤں کو انسان عمر بھر روتا ہے لیکن انہیں تو خود اپنا آپ مجرم لگتا تھا۔ اللہ جانے اتنی خود غرض اور سفاک کیوں ہو گئی تھیں وہ اس لیے کہ صرف لائبہ کی ماں رہ گئیں اور اس کی کچھ بھی نہیں۔ اس کی آنکھوں کی آس کو مرتے دیکھا تھا۔

چہرے پہ اترتی مایوسی اور غیر یقینی یاد کرتیں تو جیسے خود کو کسی برزخ میں محسوس کرنے لگتیں۔ کتنا ... تھا وہ وقت...... اسی قدر کڑا بھی۔ وہ اتنی ہی بدحواس ہو گئی تھیں کہ ڈھنگ سے بات کرنا بھی ... تھیں۔ خود اپنے ہاتھوں اسے چرکے لگا دیے۔ کوئی اتا نہ پتا...... اب اگر ڈھونڈنا بھی چاہتیں تو ... تھا......

کیسا نقصان ہو گیا تھا کیسا گناہ............ جس پہ شاید ہی معافی ملتی وہ تو خود کو معاف کرنے پر ... نہیں تھیں۔

''اسے تو اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ وہی محافظ و نگران ہے اس کا۔ ساری دعائیں اسی کے نام تو ... ہیں۔ اللہ نے چاہا تو اک دن دیکھ بھی لیں گے۔''

دادی آنسو پونچھ رہی تھیں۔ وہ مزید کمزور مزید بوڑھی ہو گئی تھیں۔ امی اس پل ان سے نگاہیں ... نہ کر سکیں۔ یہ ایسا گناہ تھا۔ ایسی لغزش تھی جس پہ زبان کھولنے کی ان کی ہمت نہیں تھی۔ اللہ رازداں ... گار بھی، اب دادی کی طرح انہیں بھی اُسی سے غم کہنا تھا۔ معافی طلب کرنی تھی اور ازالے ... موقع فراہم کرنے کی التجا بھی، کہ ساری غلطی جاننے کے باوجود معاف کرنے درگزر کرنے کی شان ... وہی رکھتا ہے۔

☆......☆......☆

سورج کی کرنوں کی تپش آہستہ آہستہ کم پڑتی جا رہی تھی۔ اس کے اٹھتے ہوئے قدم بوجھل تھے ... وجود کے ساتھ ساتھ جیسے ہڈیوں کے گودے میں بھی سرائیت کرتی جا رہی تھی۔ اس کی زخم ... ہتھیلی میں اس کی دن بھر کی اجرت کے طور پر دو سو روپیہ دبا ہوا تھا۔ جان توڑ محنت کے بعد اتنا ... معاوضہ...... یہاں گاؤں میں تو اجرت اور بھی کم ملتی تھی۔ اس جیسے نئے اور کام سے نابلد آدمی کو ... بھی کم ... فصل کٹائی کا کام ختم ہوا تو ایک بار پھر بے روزگاری نصیب بن گئی، وہ اس علاقے میں ... کوئی کیریکٹر سرٹیفکیٹ پیش نہ کر سکنے کے باعث اسے کوئی باعزت پیشہ نہیں مل سکا تھا۔ مثال کے طور پر ... دکان میں سیلز مین جیسی نوکری بھی۔

آج کل نہروں کی بھل صفائی ہو رہی تھی۔ فوجی جوان اس کام میں لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کے ... جوان بھی اس قومی خدمت میں حصہ ڈال رہے تھے۔ ٹریکٹر ٹرالیاں اور دوسری مشینیں نہر سے ... نکال کر کناروں پہ ڈال رہی تھیں۔ افسران ان کی نگرانی میں مصروف تھے۔ مستقیم نے یہ منظر دور ... دیکھا تھا اور زیر تعمیر عمارت کو تکنے لگا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ خود کو یہاں کھپا دیتا۔ اس

نے گہرا سانس بھرا تھا اور ٹھیکیدار سے بات کرنے کو آگے بڑھ گیا۔ سارا دن اس نے خود کو مصروف کیے رکھا۔ شام ڈھلے وہ تھکن سے لبریز تھا تو ملنے والی اجرت نے اس تھکن میں اضافہ کر ڈالا تھا۔ وہ دیا کو سہولت، آرام اور سکھ دینے کی کوشش میں ناکام ہوا جاتا تھا تو نا امیدی اس کے اندر گھر کرنے لگتی تھی۔

''السلام علیکم!''

اس کی دستک کے جواب میں دیا نے دروازہ کھول کر پر جوش انداز میں سلامتی بھیجی۔ مستقیم نے نگاہ بھر کے اسے دیکھا۔ پتا نہیں وہ کیسے اتنی مگن اور مطمئن رہ لیتی تھی۔ اک لمحے کو مستقیم کو اس کے اطمینان پہ رشک آیا۔ مگر اک لمحے...... کو پھر وہ اس بے دلی سے اسے سامنے سے ہٹا کر اندر چلا آیا تھا۔

''سلام کا جواب تو دیا کرتے ہیں مسٹر خلیفہ مستقیم!''

وہ اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر ہلکا سا جھنجھوڑتے ہوئے ناز بھرے انداز میں گویا ہوئی تھی۔ مستقیم نے پھر اسے دیکھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی شعاعوں کی ٹھنڈی پر سکون لالی اس کے چہرے پر بکھر کر انوکھی سی روشنی اور دمک پیدا کر رہی تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر رہا۔ یہ روشنی اور دمک امید کی تھی۔ حوصلے و عزم کی یا پھر اس کی خوب صورتی و خوب سیرتی کا اجالا اسے منور کر رہا تھا۔

''وعلیکم السلام!''

وہ اسے دیکھے گیا۔ البتہ سنجیدگی و رنجیدگی میں ہرگز فرق نہیں آیا تھا۔

''بیٹھیں۔ پانی لاتی ہوں آپ کے لیے، پھر نہا لیجیے گا۔''

وہ اسے چارپائی کی جانب سے ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے نرمی سے کہتی جیسے ہی پلٹی۔ مستقیم نے اس کی بانہہ پکڑ کر روک لیا۔

''رہنے دو دیا!''

وہ آنکھیں بند کرتا وہیں نیم دراز ہو گیا۔ انداز کی پژمردگی اور بے زاری صاف عیاں تھی۔

''بہت تھک گئے ہیں۔''

دیا اس کی پائنتی کی جانب آئی اور نرمی سے اس کے پیر دبانے شروع کیے۔

ہاں تھک تو بہت گیا ہوں۔ ہر لحاظ سے

وہ متاسف بھی تھا۔ ملول بھی دیا کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ معمول سے زیادہ زود رنج نظر آتا تھا۔

''کوئی بات ہوئی ہے مستقیم!''

دیا فکر مند تھی۔ اس کی اداسی جیسے دیا کے دل میں پنجے گاڑنے لگی۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔ مستقیم دانستہ نظر انداز کیے اسی طرح پڑا رہا۔ دیا نے کچھ دیر منتظر جواب طلب نظروں سے اسے دیکھا تھا پھر بے تاب ہوتے اس کے پیروں پہ دباؤ ڈالا۔ گویا توجہ حاصل کرنی چاہی۔

''مستقیم......!!!''

''تمہارے مطلب کی نہیں ہے۔''

وہ جیسے طوعاً و کرہاً بولا تھا۔ دیا کچھ مزید الجھی۔

''آپ کے مطلب کی ہے؟''

سوال ہوا تھا۔ مستقیم چند ثانیوں کو ساکن رہ گیا۔ پھر گہرا سانس بھر کے محض ہنکارا بھرا۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے۔ اگر آپ کے مقصد کی ہے تو میرا انٹرسٹ خود بخود ہو گیا۔ بتائیے...... وہ مسکرائی تھی اور اس کے پہلو میں سرک آئی۔ ہاتھ بڑھایا اور اس کا بازو آنکھوں سے ہٹا دیا۔ مستقیم کو اٹھنا پڑا تھا۔

''کچھ معاملوں میں ہمارے انٹرسٹ بالکل میچ نہیں کرتے ہیں دیا! سو بہتر ہے رہنے دو۔''

وہ صاف اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ دیا نے اب کے خفگی سے اسے دیکھا۔

''اس بات کا فیصلہ بعد میں ہو گا، بس آپ بتائیے مجھے۔''

اس کے لہجے میں جو مان اور دھونس تھی۔ وہ مستقیم کی محبت کی ہی بخشی ہوئی تھیں اور کبھی وہ وقت بھی تھا جب مستقیم ترسا کرتا تھا اس کی جانب سے ایسے مان و اصرار کو جو اس وقت اسے کچھ اتنا خاص نہیں لگ رہا تھا۔ جبھی تو اکتایا ہوا لگنے لگا تھا۔

''تم بہت ضدی ہو۔''

''جیسی بھی ہوں۔ آپ جناب کی ہی ہوں اب تو میں۔''

وہ جواباً چہکی اور مستقیم کے چہرے پہ برجستگی و بے ساختگی کے ساتھ اپنائیت کے اس مظاہرے نے خفت و بے زاری کو دور کر کے مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

''ہاں یہ تو ہے۔ بجا فرمایا۔ خوب فرمایا۔ مگر بہت فاصلے سے فرمایا یہاں تشریف لائیے بیگم صاحبہ!''

اس کا موڈ لمحوں میں تبدیل ہوا تھا۔ آنکھوں میں شوخی بھرتی چلی گئی دیا اتنی ہی جھینپی اور خفت سے

سرخ پڑ گئی۔ بجائے قریب آنے کے وہ مزید دور ہوئی۔

"آپ کچھ کہہ رہے تھے غالباً۔"

وہ جیسے کترائی۔

"ہاں یہی کہ ذرا قریب آؤ۔"

مستقیم مسکراہٹ دبا رہا تھا۔ دیا کی خفت بڑھی مگر اسے گھورا ضرور۔

"اصل بات سے نہ پھریں۔"

اور مستقیم ہنستا چلا گیا تھا۔

"ہمارے ٹریک پہ آتے ہی رومانس کی پڑی سے الٹے قدموں بھاگتی ہو تم۔"

وہ جیسے چھیڑ رہا تھا۔ دیا اسی لحاظ سے سرخ پڑ گئی۔ "آج میں نے دال چاول پکائے ہیں۔ باتوں میں ٹھنڈا کر دیا کھانا آپ نے۔ نہالیں تو میں کھانا نکال لاؤں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولی تھی۔ مستقیم گہرا سانس بھرتا خود بھی کھڑا ہو گیا اور جب نہا کر وہ اس کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا تو بنا اس کے کہنے خود ہی اس موضوع کو چھیڑ لیا تھا۔

"آج جس گھر میں مزدوری کی میں نے ...... پتا ہے کس کا تھا وہ ......؟"

نوالہ منہ میں لے جاتا دیا کا ہاتھ اسی زاویے پر لحہ بھر کر ساکن ہوا اور سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر آن ٹھہریں۔

"امانت اور شائلہ کا۔ وہ دونوں عنقریب شادی کر رہے ہیں۔"

مستقیم کے جواب نے دیا کا سارا سکون غارت کر کے رکھ دیا۔ چہرے پر اضطراب اور گھبراہٹ بتدریج گہری ہوتی چلی گئی۔

"کیا ٹھاٹ ہیں امانت کے۔ میں تو اسے دیکھتا رہ گیا۔ جبکہ وہ اسی قدر متاسف تھا مجھ پر۔"

مستقیم کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ دیا کے حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔ اس نے بولنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ خلیفہ تو جیسے کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔

"مغرور وہ بھی ہے، مگر ہماری طرح ذلیل نہیں رہا۔ اس نے جو مال وہاں سے اٹھایا تھا اس پر عیش کر رہا ہے۔ جبکہ تم نے کچھ بھی استعمال نہیں کرنے دیا مجھے ...... دیا ......! زندگی ایک بار ہی ملتی ہے۔ کیوں اپنے ساتھ میری بھی برباد کرنے پر تلی ہو۔"

وہ اسی ٹرانس میں بول رہا تھا۔ دیا کا پھیکا چہرہ اس لمحے بالکل زرد پڑ گیا۔

اس نے غمناک نظروں میں سہم بھر کے مستقیم کو دیکھا تھا۔

"آ گئے نا آپ اس کی شیطانی باتوں میں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے دوبارہ اس سے ملنے کی۔"

وہ دبے ہوئے لہجے میں چیخی تھی اور غصے میں پلیٹ دور سرکائی۔ مستقیم نے چونک کر اس کا لال بھوکا چہرہ دیکھا اور حیران رہ گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟"

وہ بے اختیار سسکی۔

"تو اور کس سے پوچھوں؟ بلاوجہ تم چیخ رہی ہو کوئی اور نہیں۔"

مستقیم بھی سخت بدمزا ہوا تھا۔ جبھی بھی ناگواری سمٹ آئی تھی اس کے لہجے میں۔ دیا ایک لمحے کو صدمے سے گنگ رہ گئی۔ یہ ضبط کا چھلکنا، بات بے بات تلخی لہجوں میں سمٹ آنا، حالات کی سختی کی دین تھی اور اسے یاد رکھنا چاہیے تھا۔ یہاں اس مرحلے اس مقام پہ ساری ہمتیں ساری توانائیاں اسے ہی صرف کرنی تھیں۔ ساری ذمہ داریاں اسے نبھانا تھیں۔ خلیفہ کو سنبھالنا، اسے قابو میں رکھنا اور باطل راہوں کی کشش سے بچانا آسان نہیں تھا۔ اس کی دعاؤں کے ساتھ اس کے حوصلوں اور بے حد اعلیٰ ظرف کی ضرورت تھی یہاں۔ اسے خود کو کمپوز کرنا پڑا۔ جبھی گہرے سانس بھرنے لگی۔

"اک بات کہوں آپ سے خلیفہ!"

وہ بے اختیار ملتجی ہوئی۔ مستقیم نے بھینچے ہونٹوں کے ساتھ اس بے بس لڑکی کو دیکھا۔ جس کی محبت اور بے چارگی قدم قدم پہ رکاوٹیں کھڑی کر دیتی تھی اس کی راہ میں۔

اور وہ اس جیسا خود پسند، من موجی اور اکھڑ انسان اس معمولی، عام نازک سی لڑکی کی مرضی کے خلاف جانے کا حوصلہ کر ہی نہ پاتا تھا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ تھکے ہوئے انداز میں مسکرایا۔ یوں جیسے بنا کہے اس کا مطالبہ جانتا ہو۔ اتنا ہی تو سمجھنے لگا تھا وہ جناب۔

"آپ امانت سے نہیں ملیں گے۔ بلکہ اس کے سائے سے بھی بچیں گے۔ وعدہ کریں۔"

وہ اس پر ہراساں تھی۔ مگر پیاری لگتی تھی۔ ہرنی کی جیسی معصوم معصوم سی۔

"میں اب بھی نہیں ملا تھا۔ وہی مجھے پہچان کر میرے پاس آیا تھا۔ اب کیا بات کا جواب بھی نہ

دیتا۔؟"

"نہ دیتے جواب بھی۔ ہمارا ان لوگوں سے تعلق واسطہ نہیں ہے۔"

وہ بے اختیار بولی تھی۔ مستقیم کچھ کہے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"تمہیں ابھی تک مجھ پہ بھروسہ نہیں کرنا آیا دیا!"

وہ شاکی تھا۔ یا ہرٹ ہوئی تھی جیسے۔

"مجھے ان لوگوں پہ بھروسہ نہیں ہے خلیفہ! یہ لوگ شیطانی کام کرتے ہیں اور شیطان ہمیشہ برائی کے راستے کو مزین کر کے دکھاتا ہے۔ اتنی کشش محسوس کراتا ہے کہ زاہد خشک بھی بھٹک جائے۔ اللہ سے ہمیں ایمان کی سلامتی، نفس کی حفاظت اور برائی سے پناہ کی التجا کرتے رہنا چاہیے۔ خود پہ کیسا مان و بھروسہ بھلا؟"

اس کا انداز ناصحانہ تھا۔ مستقیم کی اسے تکتی آنکھیں لو دینے لگی تھیں۔ کچھ کہے بغیر وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرائے گیا تھا۔ ایسے...... اس قدر کہ دیا کی ساری سنجیدگی و بردباری حجاب کے زبردست ریلے میں بہہ گئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

وہ اپنے آپ میں سمٹی۔ مستقیم نے سرد آہ بھرلی۔

"امی یاد آ گئیں تمہاری باتیں سن کر۔ بالکل ان کی پسند کے مطابق ہو تم۔ ایسی ہی لڑکی کو وہ میری بیوی بنانے کی متمنی تھیں۔ کہتی تھیں میری بہو کو صرف سمجھ دار نہیں بہت خوب صورت بھی ہونا چاہیے۔ سمجھدار اور نیک اس لیے کہ وہ اک نسل کی امین ٹھہرتی ہے۔ خوب صورتی مرد کو باندھے رکھنے کے لیے بے حد ضروری ہے تاکہ اگر وہ کبھی بھٹکے...... بھٹکے تو بیوی اپنی اس خوبی کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے محرم کو واپس اس کے مرکز پہ لا سکے۔ وہ پر یقین رہتی تھیں کہ اگر بیوی خوب صورت ہو اور شوہر کی من پسند بھی تو شوہر کو ہمیشہ باندھ کر جکڑ کر رکھ سکتی ہے۔ اس سے کچھ بھی منوا سکنا اس کے لیے ہرگز مشکل کام نہیں۔"

اس نے توقف کیا اور دیا کے تمتماتے چہرے پہ گہری نگاہیں مرتکز کرتے ہوئے مسکراہٹ دبائی۔

"اور ان کی ہر بات حرف بہ حرف سچ ثابت ہو چکی۔ دیا تم نے بھی مجھے باندھ لیا ہے۔ مجھ کو یہ ایسی ان دیکھی ڈوریاں ہیں جو محسوس ہوتی ہیں نہ نظر آتی ہیں مگر تاثیر میں اتنی مضبوط ہیں کہ مجھے تم سے الگ ہونے ہی نہیں دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ میری سوچوں تک کو بھی اپنے حصار میں مقید کر

لیا ہے۔"

وہ پہلی بار یوں کھل کر اپنی ماں کے متعلق بول رہا تھا۔ دیا خوشگواری کے ساتھ ساتھ خوش امیدی بھی احساس میں گھری تھی۔

"امی دیکھنے میں کیسی تھیں مستقیم!"

اس کا لہجہ اشتیاق اور شوق میں بسا ہوا تھا۔ مستقیم جیسے کہیں دور کھونے لگا۔

"اگر میری نظر سے انہیں دیکھو تو دنیا میں ان سے بڑھ کر کوئی اور عورت اتنی حسین نہیں تھی۔ لیکن ابو کی نفرت اور بے زاری مجھے باور کراتی تھی کہ وہ ایک عام بے حد گئی گزری خاتون تھیں۔ جبھی تو کبھی ان کے دل میں جگہ نہیں بنا سکیں۔ اس سے بڑھ کر ان کی ناکامی اور دوسری نہیں تھی۔ یہی ناکامی، یہی ناکامی آج زندگی میں ہمیں اس مقام پہ لا کر کھڑا کر چکی ہے۔ میں تہی ست تہی داماں اور وہ دونوں جانے کس حال میں ہوں گے۔ ہوں گے بھی یا......"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ دیا نے دیکھا اس کی آنکھوں کے زیریں کنارے سرخ اور سطح گیلی۔ وہ جیسے خود پر بہت ضبط کر رہا تھا اور ناکام تھا۔ دیا نے جانا تھا وہ جتنا کٹھور، جتنا بے حس اور سخت نظر آتا تھا۔ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ دیا کا دل گداز ہوا تھا اور آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ یہ دکھ مستقیم کا کوئی تھوڑی تھا۔ ایسے ہی کبھی نہ مندمل ہونے والے زخم اس کے بھی سینے کا ناسور بن گئے تھے۔

"آپ کو اک بار سہی۔ ان کی خبر تو لینی چاہیے تھی مستقیم!"

دیا نے ہچکچاتے ہوئے کہا تھا۔ مستقیم خاموش رہا۔ یوں جیسے خود کو سنبھال رہا ہو اور اک کٹھن حالت سے دوچار ہو۔"

"اک بار پھر سے تو آزما لیں۔ شاید حالات بدل گئے ہوں۔ شاید وہ لوگ پچھتا رہے ہوں۔"

وہ ڈرتے ڈرتے پھر کہہ رہی تھی کہ مستقیم کی آنکھوں کی سرخیاں اسے خائف کر جاتی تھیں۔ وہ جانتی تھی ایسی بات سننا پسند نہیں ہے اسے، مگر وہ پھر بھی کہنا چاہتی تھی۔ کیا خبر اثر ہو جائے۔

"جو لوگ ہماری زندگی میں در آنے والے کمزور لمحوں کے گواہ ہوتے ہیں ناں دیا! ان کے سامنے پھر سر اٹھا کر عمر بھر اعتماد سے بات کرنا مشکل بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ الزام جھوٹا ہو یا سچا فرق پڑتا ہے، بس ان کی تحقیر آمیز استہزائیہ نظریں ہمیں کمتر اور بے حیثیت و مجرم ہونے کا احساس دلاتی ہیں اور ہم کوشش کے باوجود اپنی صفائی یا دلیل پیش نہیں کر سکتے۔"

وہ گم صم سا بول رہا تھا۔ دیا کا دل انجانے اور بے تحاشا بوجھل کر دینے والے دکھ سے لبریز ہو

گیا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنا ہاتھ اس کے بازو سے گزار کر خود کو اس کے نزدیک کیا اور سر اس کے کاندھے سے ٹکا دیا تھا۔ ڈھارس کا یہ بھی ایک بہت پاورفل انداز تھا۔ دونوں بنا کہے اک دوسرے کے دکھ کو محسوس کرتے اور رنجیدہ ہوتے رہے تھے اور محبت ان کے درمیان ڈھارس بنی اپنا احساس بخش رہی تھی۔

☆......☆......☆

"یہ کچھ پیسے ہیں رکھ لو۔ اور کسی جاننے والی سے کہہ کر بازار سے اپنے لیے چند جوڑے منگوا لو۔ پہلی فرصت میں۔"

مستقیم نے پس انداز کی ہوئی رقم جو چند سو پہ مبنی تھی اس کے ہاتھ پہ رکھی۔

دیا سوچ میں پڑ گئی۔ دیگر کئی ضروریات بھی منہ کھولے کھڑی تھیں۔ مگر کپڑے بنائے بغیر بھی گزارا ممکن نہ تھا کہ لباس اب جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔

"کھانے میں کیا ہے؟"

قمیض کے بٹن کھولتا ہوا وہ چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔

"کیری کی چٹنی بنائی ہے۔ ساتھ میں کیری کا ہی مربہ۔ لے آؤں کھانا؟"

وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر اسے تکنے لگی تھی۔ انداز سوالیہ تھا۔ مستقیم نے کف کا بٹن کھول کر آستین کہنی تک فولڈ کر لی اور کالر پیچھے کی جانب لڑھکا یا۔ اس کا لباس بدرنگ تھا۔ کئی جگہ سے گھسا ہوا وہ واقعی کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ امانت صحیح ترس کھاتا تھا اس پر۔ آج پھر وہ اسے سمجھاتا اور اکساتا رہا تھا۔ اس کی خاموشی کے جواب میں کتنا جھنجلانے لگا تھا۔

"تمہیں خود پر رحم کیوں نہیں آتا خلیفہ؟ اور اتنی غلامی مت کرو بیوی کی۔"

"تم جاؤ یہاں سے امانت!"

وہ ٹوک کر سرد انداز میں بولا تھا۔ امانت نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"اتنا ڈرتے ہو بھابھی سے۔؟ یار وہ دیکھ نہیں رہی ہیں تمہیں۔"

وہ ہنسنے لگا تھا اور مستقیم اسے گھورنے

"یہ ڈر نہیں محبت ہے، لحاظ ہے، احساس ہے۔"

وہ ساکا اور امانت کی ہنسی گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

"تو بالکل ہی سٹھیا گیا ہے خلیفہ! سچ کہا سیانوں نے، محبت شاہوں کو ملنگ بنا سکتی ہے۔ دیکھ کر یقین آ سکتا ہے۔"

اور خلیفہ مستقیم نے ایسا تاثر دیا کہ بولتے رہو۔

"اگر تم کہو تو عزت مآب بھابھی سے میں سفارش کر دوں؟"

"وہ سر پھاڑ دے گی۔ تمہارے ساتھ میرا بھی، کہ میں نے کیوں آنے دیا تمہیں۔"

اور فرمانبرداری والا ڈ کا یہ مظاہرہ امانت کو سخت گراں گزرا تھا۔ جبھی ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"عورت کو سر پہ سوار نہیں کیا کرتے ہیں مستقیم! کا سے جوگا نہیں رہتا انسان۔"

اس کے لہجے کی ناگواری مستقیم کو بری لگی تھی۔

"میں انسانوں کو ان کی حیثیت و مرتبے کے مطابق مقام دینے کا عادی ہوں۔ دیا اس قابل ہے کہ اسے اتنی اہمیت دی جائے۔"

اس نے سرد مہری دبانے کی کوشش نہیں کی تھی اور امانت سرد آہ بھر کے رہ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی! لیکن تھوڑی سی گنجائش نکالو ہمارے لیے بھی۔"

اس کا انداز ملتجیانہ تھا۔ مستقیم نے الجھ کر نافہم نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہماری شادی ہے۔ تم بھابھی کے ساتھ شامل ہو گے تو میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ مستقیم اتنا تو کر سکتے ہو ناں تم؟ یہاں اس انجان بستی میں اتنے غیروں کے بیچ صرف ہم شناسا ہیں۔ اک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی۔"

اس کا انداز قائل کرتا ہوا تھا اور مستقیم نے اسے ٹالنے کو محض کاندھے اچکا دیے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اب وہ اپنا اور امانت کا کوئی جوڑ میل نہیں پاتا تھا۔ اس کا ہر بار کا امانت کا سامنا اسے کمتری کے احساس سے لبریز کر جایا کرتا تھا مگر امانت نہیں سمجھ سکتا تھا شاید۔ جب بھی تو اصرار کرتا جاتا تھا۔

"کیا سوچ رہے مستقیم! کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہیں؟"

دیا کی آواز پہ وہ چونکا تھا اور گہرا سانس بھرتے سر جھٹکا۔

"تم بھی کھاؤ نا۔ آ جاؤ۔"

وہ سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ دیا پانی کا جگ لیے قریب آ گئی۔

"پریشان لگتے ہیں۔ خیریت.............؟"

"پریشان تو تم بھی لگتی ہو۔ تم بتاؤ خیریت ہے کہ نہیں؟"

وہ اپنی پریشانی یا اضطراب جھٹک کر پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔ دیا کے بجھے ہوئے چہرے پر موجود اضمحلال گہرا ہو کر رہ گیا۔

"پتا نہیں یہ آزمائش ہے یا اللہ ہم سے ناراض ہے۔ مجھے رونا آنے لگا ہے مستقیم!"

اس کی آواز بھیگی ہوئی اور بھراہٹ زدہ تھی۔ مستقیم فطری طور پر مضطرب اور بے چین ہوا تھا۔

کچھ کہے بغیر اس کی جانب سرکا اور اس کا سر اپنے کاندھے سے لگا کر تھپکا۔

"کیا ہوا ہے؟ بتاؤ مجھے۔"

"وہ ہچکیاں بھرتی خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔"

"سلائی سینٹر بند ہو گیا ہے مستقیم! یعنی مزید پیسے کی کمی، ہم اب کیا کریں گے۔

وہ باقاعدہ رونے لگی۔ مستقیم کے کشیدہ اعصاب یکدم ڈھیلے پڑنے لگے۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے دیا! اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو میں خود روک دیتا۔

اب تمہیں سلائی سے۔ یہ کام مناسب نہیں ہے تمہارے لیے۔ ہمارے بچے کے لیے۔ میں کس لیے محنت کر رہا ہوں۔ تمہاری خاطر ناں۔ چلو رونا بند کرو۔ میں سمجھا پتا نہیں کیا ہو گیا خدانخواستہ، بہت بے وقوف ہو تم۔"

وہ اس کا سر نرمی سے تھپک رہا تھا۔ دیا کے دل پہ دھرا بے انت بوجھ تھوڑا سا سرکا۔

"ایسا کیسے چلے گا مستقیم! ہمارے اخراجات اور فیملی بڑھنے والی ہے۔"

وہ آنسو پونچھتی بھی فکرمند تھی۔ مستقیم ہولے سے مسکرایا تھا۔

"خود ہی کہتی ہو اللہ مالک ہے۔ اب بھی اُسی پہ بھروسہ کرو۔"

اور دیا ٹھٹک گئی تھی۔ ساکن ہو کر اسے تکنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو اترنے لگے تھے۔ اب جیسے کچھ کہنے کچھ سننے کی گنجائش اور طلب نہیں تھی۔ یہ احساس محسوس کرنے کا تھا۔ خوش ہونے کا تھا۔ شکر بجالانے کا تھا۔ ایسے بندے کو رب یاد آیا تھا جسے بھولا ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی بات طمانیت کا باعث ہو سکتی تھی۔

☆......☆......☆

بیرونی دیوار کے ساتھ سرو کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کنکریٹ کی دیوار کے پار جامن اور نیم کے پیڑوں کے جھنڈ تھے۔ سہ پہر کے وقت ادھر کوئی گہما گہمی نہ ہونے کے باعث درختوں کے جھنڈ پر ہو کا عالم طاری رہتا۔ فضا کے سکوت کو کبھی کبھی ابھرنے والی کوئل کی آواز توڑ جاتی اور پھر سے

ہی خاموشی کا راج ہو جاتا۔ اس نے سر اٹھا کر آموں کے بور سے لدی ہری شاخوں کو دیکھا۔ جن کی مخصوص مہک ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ کیسی سست مگر دلچسپ زندگی تھی یہاں کی۔ مگر دلچسپی کا باعث نہیں کہ ان کی خوشیاں اور سکون جس سے وابستہ تھا۔ اسے خود کھو یا تھا۔ زندگی کے اس مقام پہ آ کر دونوں خود کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ صرف اپنی نہیں۔ وہ اپنے بیٹے کی بربادی کے بھی خود ذمہ دار تھے۔ یہ ملال یہ پچھتاوا دل کا روگ بن چکا تھا۔ دکھ کا کوئی شمار تھا نہ پچھتاوے کا۔

انہیں دل کا دوسرا دورہ اس روز پڑا تھا جب انہیں معلوم ہوا تھا۔ ان کے لخت جگر کے سر کی قیمت دو کروڑ مقرر ہوئی۔ وہ مفرور تھا۔ زندہ یا مردہ حالت میں پولیس کے حوالے کرنے والے کو انعام کا حقدار ٹھہرایا جاتا۔ ایک قیامت تھی جو ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک طوفان تھا جو آ کے ٹھہر گیا تھا۔ اضطراب سا اضطراب تھا۔ اذیت سی اذیت وہ روتے جاتے تھے اور چپ ہونے کو دل نہ کرتا تھا۔ آنسو ختم ہو گئے۔ مگر غم نہیں ڈھل سکا۔ دعاؤں میں لرزتا دل اور ہونٹ بھی ہمتیں کھونے لگے۔ امتحان ختم ہو کر نہ دیتا تھا۔

ڈاکٹر نے ان کی صحت یابی کے لیے کھلی آب و ہوا کے علاقے میں رہنے کا مشورہ دیا جب کہ وہ گھر چھوڑ کر جانے پہ کسی طور پر آمادہ نہ تھیں۔

"نہیں عبدالحمید ماجد صاحب! مجھے یہاں سے نہ لے کر جائیے۔ ایسا نہ ہو۔ میرا بیٹا یہاں آئے اور ماں کی منتظر آنکھوں کو نہ پا کر مایوس لوٹ جائے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی تھیں گڑگڑاتی تھیں۔ ان کو سمجھانا بجھانا کسی کام نہ آتا تھا۔ ہر گزرتا دن انہیں کمزور تر اور لاغر بنا جاتا۔ مگر امید دم نہ توڑتی تھی۔

"میں نے جس در سے آس لگائی ہے۔ وہاں سے ناامیدی کا خیال بھی گناہ عظیم ہے۔ اُس کے ہاں دیر ضرور ہے۔ اندھیر بالکل نہیں۔ میں اپنے حصے کا انتظار کروں گی۔ وہ دے گا مجھے۔ میرا ایمان کامل ہے۔"

وہ ہر بار اصرار پر یہی فقرہ دہرایا کرتیں۔ جو اتنا مخصوص تھا کہ اب انہیں بھی ازبر ہو گیا تھا۔ سب کچھ تھا ان کے پاس مگر وہ نہیں تھا۔ جس کی عدم موجودگی کے باعث ہر شے ہر نعمت کا احساس ماند پڑتا جا رہا تھا۔ وہ اسی ایک لمحے میں جی رہی تھیں۔ جس میں انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کر دیا تھا۔ وہ خود کو یہ لمحہ کبھی بھولنے نہیں دیتی تھیں۔ کیوں بھلا وہ ماں ہو کر ممتا کے تقاضوں پہ پوری نہ اتر سکیں۔ وہ صرف مستقیم کی مجرم تھوڑی تھیں۔ وہ تو اپنے پیدا کرنے والے کی مجرم بن گئی

تھیں۔ جو اپنی محبت کو ستر ماؤں کی محبت سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ اسی بے ریا، پر خلوص محبت میں شک اور غرض کی آلائش کی جرم دار ٹھہری تھیں۔ وہ خود کو معاف کیسے کر دیتیں، وہ خود کو معاف نہیں کر سکتی تھیں۔

☆......☆......☆

"تم کام پہ نہیں آئے تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ بس آ پہنچا تمہیں ملنے کو۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں تمہیں ڈھونڈنا اتنا مشکل یا ناممکن تھوڑی ہے۔"

امانت اس کے سرہانے آ بیٹھا تھا۔ ساتھ میں شمائل بھی تھی۔ پہلے سے بڑھ کر چمکتی دمکتی حسین اور دل آفریں۔ مگر وہ مستقیم کو دیکھتی تھی۔ یک ٹک۔ مبہوت کر اسے وہ نظر آیا تھا جس کے نظر آنے پر اس کے محسوسات بڑی لے بڑی ترنگ میں آ جاتے تھے۔ اسے یوں کسی کا بھی احساس کیے بنا مستقیم میں گم پا کر دیا کا دل بہت دور گہرائیوں میں ڈوبا وہ جتنی جز بز تھی۔ باقی سب اس قدر مگن اور خوش باش۔ مستقیم کو موسمی بخار نے آن لیا تھا۔ دیا نے ہی اسے کام پہ جانے کی اجازت نہیں دی تھی اور امانت کو تو جیسے بہانہ چاہیے تھا یہاں آنے کا۔

"دیا! چائے بنا لاؤ۔"

مستقیم کو ہی خیال آیا تھا۔ جبھی اس نے دیا کو احساس دلانے والے انداز میں کہا۔ وہ بے دلی سے اٹھی تب جیسے شمائل کی نظروں میں آ گئی۔ اس کے چہرے پہ پہلے حیرت اُمڈی پھر عجیب سا تمسخر اور تناؤ ابھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق بھی تھا دیا کے لیے، حسد بھی نفرت بھی تھی۔ جلن اور رقابت بھی۔ وہ اسے دیکھتی نہیں...... بلکہ گھورتی تھی۔

"افوہ...... تو یہ ہیں وہ محترمہ! جن کی خاطر تم نے مجھے ہمیشہ ٹھکرایا۔ معاف کرنا خلیفہ مجھے تو اس میں کچھ بھی ایسا خاص نہیں لگا کہ تم اسے باقی سب پر ترجیح دے بیٹھے۔"

اس کے لہجے میں طنز کی واضح آمیزش تھی۔ حقارت آمیز تمسخر اڑاتا تضحیک زدہ لہجہ دیا کے ساتھ خلیفہ اور امانت کو بھی یکدم سے خاموش کرتا گیا۔ دیا کا چہرہ دھواں ہوا تھا۔ اس نے جبڑے بھینچ لیے اور اک نظر مستقیم کو دیکھا۔ جس کی رنگت بے تحاشا سرخ پڑ رہی تھی۔

"شمائل......!!!"

امانت کا لہجہ تنبیہی تھا۔ احساس دلاتا ہوا کہ اپنی حد سے باہر نہ نکلو۔ مگر شمائل کو ایسی حد بندیاں کہاں کیا کہہ سکتی تھیں۔

"جو تھوڑی بہت خوب صورتی تھی وہ بھی جاتی رہی بیچاری کی۔ اب تو بالکل خالی اور بے کار ہے۔"

وہ ٹھٹھا لگا کر ہنس رہی تھی۔ وہ اس وقت جیلسی میں حد سے زیادہ تلخ اور بے لحاظ ہو رہی تھی۔

"شٹ اپ شمائل! میں ہرگز تمہیں اجازت نہیں دے سکتا کہ تم میرے گھر پہ کھڑی ہو کے میری بیوی کی توہین کرو۔ سمجھی ہو تم؟"

مستقیم کا سارا ضبط جیسے ختم ہو گیا۔ اس کا لہجہ اتنا درشت، اس قدر غصیلا تھا کہ ایک لمحے کو خود دیا بھی سہم گئی۔ کہیں وہ اٹھ کر شمائل کو تھپڑ نہ رسید کر ڈالے۔ کچھ کہے بغیر وہ پلٹ کر وہاں سے تیزی سے نکل گئی۔ اسے لگا تھا۔ شمائل نے دانستہ اسے ذلیل کیا ہو۔

"ہرٹ کیوں ہوتے ہو میرے ہینڈسم شہزادے! چلو میں کچھ نہیں کہتی۔"

وہ دانت نکال رہی تھی۔ مستقیم کو وہ کوئی بدصورت چڑیل سے مشابہ لگی۔

"تم یہاں سے چلی جاؤ۔ میں ہرگز کوئی فضول بات برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ غرایا تھا۔ امانت گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کام ڈاؤن مستقیم! اور شمائل ......

اس نے رخ شمائل کی جانب پھیر کے جیسے دانت کچکچائے۔

"کہا بھی تھا تم سے کہ......"

"آئی ایم سوری مستقیم! میں تمہاری بیوی سے بھی ایکسکیوز کر لیتی ہوں۔"

وہ ٹھٹکی اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بے باکی سے مسکرائی۔ مستقیم نے ناگوار تاثر کے ساتھ [illegible] نگاہ کا زاویہ بدلتے چہرے کا رخ پھیر لیا۔

امانت! دیا کو تمہارا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔ اور شمائل کا مجھے۔ مجھے امید ہے مجھے اور کچھ تمہیں سمجھانے کو نہیں کہنا پڑے گا۔"

اس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ اس کی آواز میں بیگانگی تھی۔ امانت کا رنگ خفت سے سرخ پڑ گیا کچھ کہے بغیر وہ شمائل کا ہاتھ دبوچے اسے گھسیٹتا ہوا وہاں سے نکلا تھا۔

"تم بہت بدفطرت عورت ہو۔ تمہاری وجہ سے مجھے بہت جگہوں پر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"

وہ شمائل پہ برستا بیرونی دروازہ پار کر گیا۔ دیا نے پھر بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی ناراضگی اور دکھ کو محسوس کرتا ہوا مستقیم وہیں اس کے پاس آ گیا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے دیا! اس عورت کو بکواس کرنے کی عادت ہے۔"

مستقیم نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔ اس کا لہجہ بھی نرم تھا۔ دیا کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔

کچھ کہے بغیر وہ آکر اس کے ساتھ لگ کے کھڑی ہو گئی تھی۔
"میں واقعی اب بہت حسین نہیں رہی ہوں ہوں نا مستقیم!؟"
وہ دکھی تھی۔ مستقیم مضطرب ہونے لگا۔
"حسن خوش بختی کا باعث کبھی نہیں ٹھہرتا دیا! میرے نزدیک بہت سے زیادہ اہم تمہاری پاکبازی
اور خوب سیرتی ہے۔ انہی کا اسیر ہوا ہوں میں اور یہ خوبیاں ڈھلنے یا ختم ہونے والی نہیں ہیں۔
وہ اس کا گال سہلا رہا تھا۔ شاید بہلا رہا تھا۔ دیا کا دل غم سے بھرنے لگا۔ اس کے اندر خواہش
ابھری کہیں سے آئینہ مل جائے۔ وہ دیکھے وہ کیسی ہو گئی ہے کہ مستقیم بھی اسے بس تسلی دے رہا ہے۔
"لیکن آپ نے کہا تھا۔ اسی کی خواہش تھی آپ کی بیوی خوب صورت بھی ہو۔ جو آپ کو ہمیشہ
باندھ کر رکھ سکے۔"
وہ جیسے سخت گھبراہٹ اور فکر مندی کا شکار لگ رہی تھی۔ مستقیم سب کچھ بھلا کر ہنستا چلا گیا۔
"پہلی بات تو یہ ہے دیا کہ تم واقعی ابھی بھی بہت حسین ہو۔ حالات کی ستم ظریفی بھی تمہاری
جاذبیت اور دلکشی چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوا بھی کبھی تو مجھے فرق نہیں
پڑے گا۔ دیا تم میری روح کی تسکین کا باعث بنی ہو۔ صرف جسم سے محبت نہیں کی میں نے، کیسے یقین
دلاؤں کہ تم میں کون سی مقناطیسی کشش تھی۔ جس نے جکڑ لیا تھا مجھے۔"
وہ تائید طلب نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔ دیا کچھ نہیں بولی۔ ہنوز ملول اور یاس زدہ نظر آتی رہی
تھی۔ مستقیم نے گہرا طویل سانس کھینچا۔
"کیا میری محبتوں کی تمام تر شدتوں کو محسوس کر لینے کے باوجود تمہاری غیر یقینی نہیں جاتی؟"
اس کا سوال بہت اہم تھا۔ دیا سب کچھ بھلا کر سرخ پڑ گئی تھی بے تحاشا شرم کے باعث۔
"یار سنا ہے پریگننسی پریڈ میں عورت تھوڑی سی بے ڈول ہو ہی جاتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ تم بھی بعد
میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔"
اس نے پھر اس کا گال سہلایا تو دیا خفت زدہ سی مسکرانے لگی۔
"اب وعدہ کریں۔ آپ امانت سے نہیں ملیں گے۔ مجھے ان دونوں سے بہت ڈر لگتا ہے مستقیم!"
وہ پھر سے مضطرب ہونے لگی۔ مستقیم نے اب کی مرتبہ کچھ کہے بغیر محض اس کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔

شام غم کی سحر نہیں ہوتی
یا ہمیں کو خبر نہیں ہوتی

ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں
بے کلی اس قدر نہیں ہوتی
ایک جاں سوز نامراد خلش
اس طرف ہے ادھر نہیں ہوئی
رات آ کے گزر بھی جاتی ہے
اک ہماری سحر نہیں ہوتی
بے قراری سہی نہیں جاتی
زندگی مختصر نہیں ہوئی

☆......☆......☆

وہ کب سے تکیے میں منہ دیے ساکن پڑا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے کچھ کھائے پیئے بغیر۔
دیا منتیں کرتے بھی تھک گئی تھی۔ رو رو کر نڈھال ہو گئی۔ مگر وہ نہ بولنے پہ آمادہ تھا نہ اٹھنے پہ۔ کیا
کرتی وہ......؟ بات تھی بھی نہیں معمولی۔ زندگی نے دوسری مرتبہ اس کے ساتھ وہی بے رحمی والا
سلوک کیا تھا۔ اس میں قسمت کا کتنا عمل دخل تھا۔ معاشرے کی بدسلوکی غیر انسانیت سوز رویوں کا
کتنا......؟ دیا کی مفلوج ہو جانے والی صلاحیتیں سمجھنے اور جاننے سے قاصر تھیں۔ ابھی چند دن قبل تو وہ
بہت خوش تھا۔ اسے بتا رہا تھا۔ اس اتنی مشقت سے اس کی جان چھوٹ رہی ہے۔ مزدوری یا پھر گندم
کی کٹائی کا کام آسان نہیں تھا۔ اس کی بہ نسبت کسی دوکان پر سیلز مین کی نوکری بہتر تھی۔ معاوضہ بھی
اچھا مل جاتا تھا اور امانت نے اسے یقین دلایا تھا وہ اسے نوکری دلا دے گا اور یہ یقین ہی میں تھا۔
اگلے دن واقعی اس کو اس قصبے کے سب سے بڑے جنرل اسٹور پہ سیلز مین کی ملازمت مل گئی تھی۔ چھ
ہزار ماہوار پر۔ یہ بھی بہت تھا۔
ابھی وہ دونوں ڈھنگ سے شکر ادا کر پائے تھے نہ ہی پرسکون ہو سکے کہ ایسا دھچکا لگا تھا۔ جس
نے ذہنی طور پر بالکل مفلوج اور بے کار کر ڈالا۔ مستقیم کی ملازمت کے تیسرے دن دوکان میں رات
کے وقت ڈاکہ پڑا تھا اور الزام مستقیم پہ آ گیا تھا۔ ابھی وہ اس شاک سے باہر نہیں نکلا تھا کہ مالک
دوکان سمیت دیگر نے مل کر اسے زبانی کلامی لعن طعن کے ساتھ زدوکوب بھی کرنا شروع کر دیا۔
وہ شاکڈ تو تھا ہی بکھر سا گیا تو پھر سنبھالنے میں نہیں رہا تھا۔ اب وہ آٹھ سال پہلے کا کمزور اور
نوعمر لڑکا تو تھا نہیں کہ یہ دنیا اس کے ساتھ بدسلوکی کا رویہ اپناتی اور وہ بے بس تماشا دیکھتا رہتا۔ اک

عرصہ جرم کی دنیا کا باسی رہا تھا اور اس کے فنون سے بھی آگاہ۔ وہ اکیلا بھی سو پر بھاری پڑ سکتا تھا اور پڑا تھا۔ مگر اس کا اپنی ذات کے لیے اپنایا دفاعی انداز گویا اس پہ لگے جرم کے الزام کو گہرا اور پختہ کر گیا۔ اس کا پیشہ وارانہ مجرمانہ بدمعاشانہ انداز کافی تھا نا جرم ثابت کرانے کو۔

لازمی طور پر اسے پولیس کے حوالے کیا جاتا اگر جو امانت بیچ بچاؤ نہ کراتا آ کے۔ ہرجانہ اسے بھرا تھا اور اس کی خلاصی کرائی۔ مگر اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی تھی۔ دنیا نے ثابت کیا تھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی سفاک ہے۔ اسی قدر بے رحم۔ وہ مجرم نہیں تھا۔ محض اس پر اس لیے الزام دھر دیا گیا کہ وہ نیا تھا۔ کوئی واضح اور مستحکم حیثیت نہیں رکھتا تھا اور ایسے میں اگر امانت نہ ہوتا......؟

اس نقصان کو پورا کر کے اس کی جان نہ چھڑواتا تو......؟

کتنے سوال تھے جو پن بن کر چبھتے تھے۔ کیسی شرمندگی تھی جو اسے دیا سے بھی نگاہیں چار نہ کرنے دیتی تھیں۔

"کیا سمجھے گی وہ کہ میں نے واقعی کیا یہ سب؟"

اس کا دل پھر پوری دنیا کو آگ لگانے کو چاہنے لگا۔ ویسی ہی آگ جو دنیا نے دوسری مرتبہ اس کے لیے برزخ کی صورت دہکائی تھی۔ وہ سکتا تھا۔ وہ تڑپتا تھا مگر اس اذیت سے چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ ایسی مایوسی، دلگیری اور وحشت کی گھڑیوں میں اس نے وہ حرکت کی تھی جو اس نے تب بھی نہیں کی جب پہلی بار اس پہ الزام لگا تھا۔ تب بھی وہ اتنا دل برداشتہ نہیں ہوا تھا جتنا اب ہرٹ ہوا۔ جبھی تو اس نے دیا کا بھی کچھ نہیں سوچا، نہ اپنے دنیا میں آنے والے بچے کا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ یہ اس کی مایوسی کی انتہا تھی۔ یہ اس کی اذیت کی اور دلگیری کی بھی انتہا تھی۔

☆......☆......☆

شام کو یادوں کے آنگن میں اتر جاتا ہوں
اور اس بزم سے پھر رقتِ سحر جاتا ہوں
مجھ کو مقصود ہے ہر حال میں راحت تیری
بوجھ ہوں گر تو تیرے دل سے اتر جاتا ہوں
میں تو قائم ہوں ابھی عہدِ وفا پر اپنے
گر تجھے راس نہیں ہے تو مکر جاتا ہوں

پتا نہیں وہ کیوں بچ گیا تھا۔ پتا نہیں اسے بچا کر ابھی اور کتنی ذلت مسلط کرنی باقی تھی۔ وہ واللہ

بھی شاکی ہونے لگا۔ دیا کا رو رو کر سسک سسک کے برا حال تھا۔ مگر اب اسے اپنے سوا اور کسی پہ غصہ آتا تھا۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بدنصیب نہیں تھا یہ طے ہو گیا تھا۔ دیا بھی نہیں۔ کم از کم اس پہ جھوٹے الزام تو نہ لگے تھے۔ الزام...... وہ بھی جھوٹا بہت تکلیف بہت اذیت کا باعث ہے۔ وہ تو دوسری مرتبہ اسی صورت حال سے گزرا تھا۔ کیوں......؟ کیسے......؟ اس پر غور کیے بنا۔ فرصت اور ضرورت بھی کسے تھیں۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا تھا مستقیم!"

دیا اس کی پٹی سے لگی حال سے بے حال تھی۔ مگر اس کی چپ ٹوٹتی ہی نہ تھی۔

"کیا آپ کو مجھ پہ یقین نہ تھا؟"

وہ شاکی ہوئی۔

"خود سے بڑھ کر اعتبار کرتی ہوں آپ پر پھر......"

وہ جیسے بنا کہے اس کا درد جان گئی تھی۔ سمجھ گئی تھی۔ مستقیم کو اس ساری اذیت ناک سچوایشن میں پہلی بار تھوڑی سی راحت اور سکون کا احساس ہوا۔ یوں جیسے گھور تاریکی میں کہیں کوئی موہوم سی روشنی کی لَو اٹھے اور زندگی کا احساس دلائے۔

"میرا نہیں تو اپنے بچے کا سوچا ہوتا مستقیم! کیا آپ کو اس سے بھی محبت نہیں ہے۔"

وہ گھٹ گھٹ کے رو رہی تھی۔ مستقیم نے کچھ کہے بغیر اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔

"بس کریں بھابی! وہ آل ریڈی اپ سیٹ ہے۔ حوصلہ دیں اسے بس۔"

امانت نے ٹوکا تھا۔ جو فروٹ کے شاپرز اٹھائے ابھی وہاں آیا تھا۔ دیا جھجک کر مستقیم سے الگ ہوئی اور اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔ البتہ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر بہت گہرا تھا۔

"کچھ کھالو مستقیم اور خود کو سنبھالو۔ اس طرح کے معاملات نئے نہیں ہیں جنہیں ہم ہینڈل نہ کر سکیں۔"

وہ رسان سے کہہ رہا تھا۔ دیا اسے گھورتی رہی۔ اس کی نظروں کا انداز تند تھا اور ان میں بے تحاشا تپش بھری ہوئی تھی۔ ہونٹ اس نے ایسے بھینچ رکھے تھے جیسے بہ مشکل خود کو کچھ سخت کہنے سے روک رہی تھی۔ امانت سیب کاٹ کر پلیٹ میں رکھ رہا تھا۔ پھر اس کی جانب بڑھائی۔

"آپ بھی لے لیں بھابی!"

دیا کا تنفر مزید بڑھ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ جب تک

امانت موجود رہا وہ جیسے کانٹوں پر لوٹتی رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی دھپ دھپ کرتی اندر آگئی۔

"آپ اسے فی الفور یہاں آنے سے منع کریں۔ ہمیں اس کا کوئی احسان نہیں چاہیے۔"

اندر آتے ہی وہ تڑخ گئی تھی اور پیر پٹخ کر اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس کا یہ مطالبہ کلینک سے واپس گھر آ کے اور شدت پکڑ گیا تھا۔ وہ ہرگز بھی امانت کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

"وہ میرا محسن ہے دیا!"

"محسن..........؟"

وہ چیخی۔ اس کی آواز صدمے سے پھٹ گئی تھی۔ مستقیم حیران رہ گیا۔

"اس نقب زن کے ہاتھوں اتنا بڑا دھوکہ کھا کر بھی اسے محسن سمجھتے ہیں آپ خلیفہ؟"

اس نے بے حد تلخی میں آتے ہوئے کہا تھا۔ مستقیم پہلے حیران نظر آیا پھر ایسے تفہیمی انداز میں گھورا۔

"دیا تم..........؟"

"پلیز خلیفہ!...... دوست اور دشمن کی پہچان کرنی سیکھ لیں۔ یہ سب کیا دھرا امانت کا ہے اور کیوں کیا ہے یہ بھی بتاؤں آپ کو......؟"

وہ جیسے رو دینے کو تھی۔ بلکہ رو ہی پڑی تھی۔ خلیفہ نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا۔

"بدگمانی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے دیا اور نفرت کی بھی۔"

"یہ نفرت ہے نہ بدگمانی۔ حقیقت ہے۔ اسی لیے چاہتی ہوں کہ اس سے کنارہ کریں۔"

وہ اب کے چیخی نہیں تھی۔ منت پہ اتر آئی تھی۔ خلیفہ کچھ کہے بغیر اسے سرد نظروں سے تکتا رہا۔ دیا کو اس کی انہی نظروں سے دکھ ہوا تھا۔ جو اس کا یقین کرنے کو تیار نظر نہیں آتی تھیں۔

"آپ کو اعتبار نہیں ہے نا میرا؟"

وہ سسکنے لگی۔ مستقیم نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ اس کا دماغ ماؤف تھا۔ البتہ اسے دیا پہ ضرور غصہ آ رہا تھا۔ جو اسے اس مرحلے پر بھی تیز کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اسے ہمیشہ اس کا ساتھ نبھانے والی یہاں کیوں خیال نہیں کر رہی تھی۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو دیا! پلیز۔"

اس نے سر ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ چیخ پڑا تھا۔ دیا یکلخت سہم کر رہ گئی۔ اس نے خوف، جھنجھلاہٹ

نظروں سے خلیفہ مستقیم کو دیکھا۔ جو ہیجان زدہ لگ رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر اس کی جانب لپکی۔

"کیا ہوا مستقیم آپ کو؟"

وہ جیسے ہی قریب آئی اور اسے چھوا مستقیم نے اسی ہسٹریائی کیفیت کے زیر اثر اسے زور سے جھٹک دیا۔

"میں نے کہا مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ تمہیں سنتا نہیں ہے۔"

سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا وہ حلق کے بل غرایا۔ دیا کی سراسیمگی کچھ اور بڑھی۔ اسے یاد آیا مستقیم ایسے ہی ڈپریشن میں پہلے بھی خودکشی کر چکا تھا۔

"آپ کو میری بات بری لگی...... آئی ایم سوری خلیفہ! معاف کر دیں پلیز، پلیز معاف کر دیں۔ آئندہ نہیں کہوں گی۔ ہر وہ بات جو آپ کو بری لگے۔ آئی سوئیر پرامس۔"

دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ بے اختیار رو پڑی۔ مستقیم سرخ دہکتی مگر نم آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بغیر اسے بازوؤں میں بھر کے خود میں سمو لیا۔ دونوں دکھی تھے۔ دونوں رو رہے تھے اور اس وقت دونوں ہی اک دوسرے کی ڈھارس اور سہارا تھے۔

☆......☆......☆

لفظ بہت محدود ہیں میرے
سوچتا ہوں کہ اپنی ہر الجھن
زندگی کے سفر کی ساری تھکن
اپنے دکھ کی تمام تصویریں
ہجر کے غم کی ساری زنجیریں
اپنی تنہائیوں کے اشکوں کو
اتنا لکھوں کہ داستاں کر دوں
ہاں مگر بے بسی یہ ہے
لفظ تھوڑے ہیں زخم زیادہ ہیں

پیپل کے درخت میں چڑیا چہچہاتی تھیں۔ وہ ساکن بیٹھا کسی عمیق سوچ میں گم تھا۔ سوچیں جن کی لامحدود حدود سے باہر ہو رہی تھی۔ جو بپھرا ہوا ایسا سمندر تھیں جس کے تلاطم اور

تندی کے آگے ہر چیز اپنا تاثر اور مضبوطی کھو کر اس کے بے رحم تھپیڑوں کے رحم و کرم پہ آ جاتی ہے۔ دیا نے کہا تھا۔ یہ سب کیا دھرا امانت کا تھا۔ اس پہ لگنے والے الزام سے لے کر خودکشی تک کے مرحلے تک ...... حالات ایسے پیدا ہوئے نہیں تھے۔ کر دیے گئے تھے۔ یہ دعویٰ تھا دیا کا اور اب ...... اب اگر وہ کڑیوں سے کڑیاں ملاتا تو بات اتنی بھی غلط نہیں تھی۔ اب جب کہ امانت نے اسے بدنام ترین پیشہ کو پھر سے اپنانے کا مشورہ دیا تھا۔

کیسے بپھر گیا تھا وہ پھر سے اس کی نوکری کی تلاش کا ارادہ جان کر۔

"پاگل ہو تم مستقیم! کیوں خود کو ایک بے کار عہد کی خاطر برباد کرنے پہ تل گئے ہو۔ تمہارا اسٹینڈرڈ یہ نہیں ہے۔ تم اس دنیا کے باسی بھی نہیں ہو۔ جرم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہو۔ اپنی حیثیت، اپنا مرتبہ مت بھولو۔ واپس اپنی دنیا میں چلو۔ وہاں سب ویسا ہی ہے سب کچھ تمہارا منتظر۔"

اور خلیفہ خاموش ہو گیا تھا یا اسے چپ لگ گئی تھی۔ اسے دیا کی بات اس کا دعویٰ کچھ ایسا غلط بھی نہ لگا۔ دکھ کون سا نہیں تھا۔ دوستی کے بھرم کے ٹوٹنے کا اعتماد کے بکھرنے کا۔ اس کی اذیت کا انت نہیں رہا۔ اسے یاد نہیں کرنا پڑا کہ امانت نے ہی اسے مزدوری چھوڑ کر سیلز مینی کا مشورہ دیا تھا۔ پھر ملازمت بھی خود دلوائی تھی۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے شہزادے؟"

امانت کا ٹہوکا اسے سوچوں کے بھنور سے نکال لانے کا باعث بنا تھا۔ وہ ہوش میں آ جانے کے باوجود جیسے ہوش میں نہیں لوٹا تھا۔ حقیقت سے کوسوں دور تھا۔ سچائی سے دوری اسے یکدم خالی کر کے رکھ گئی۔ شاید کم از کم اسے امانت سے ایسی توقع نہیں تھی۔ یہ صدمہ بھی انوکھا تھا۔ اس کی نوعیت بھی۔ مگر وہ پھر بھی یقین کرنا چاہتا تھا نہ ہی اس پر اعتماد کھونا۔ یا شاید وہ اسی خاموشی سے تکنے پر آمادہ تھا کہ لوٹنے والا بھی شرمندہ ہو جائے۔

"پولیس تمہاری تلاش میں باؤلے کتے کی طرح دوڑی پھرتی ہے مستقیم! ہمارے کچھ اور ساتھی بھی ایسے ہی بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہم اس معاشرے میں ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تم نے بھی دیکھ لیا ناشرافت کو اپنا کر ......؟ کیا ملا؟ کچھ نہیں ناں؟ مستقیم ہم مس فٹ تھے یہاں ...... اور ہم رہیں گے۔ بتاؤ کیا ہم پھر کیوں نہ واپس لوٹ جائیں اپنی دنیا میں۔ جہاں ہم لوگوں سے نہیں لوگ ڈرتے ہیں ہم سے۔ یاد کرو۔ میں نے کہا تھا نا طوائف اور ڈاکو توبہ کر لینے کے باوجود لوگ۔ معاف کرنے پہ آمادہ ہوتے ہیں نہ قبول کرنے میں۔ وہ سوال پہ سوال داغ رہا تھا۔ گویا سوچنے کا موقع فیصلہ کرنے

میں آسانی مہیا کر رہا تھا۔ خلیفہ خاموش رہا۔ شاید وہ فیصلہ کر نہیں پایا تھا۔ یا شاید فیصلہ تھا ہی بہت مشکل۔ وہ یونہی گم صم کیفیت میں وہاں سے اٹھ کر واپس چلا آیا تھا۔ جیسا بے خیال تب تھا ویسا ہی اب بھی۔ دیا نے روٹیاں پکاتے ہوئے کئی بار اس کا یہ انداز دیکھا تھا مگر نوٹ کا نہیں۔ روٹی کپڑے میں لپیٹی۔ لکڑی چولہے سے کھینچ کر آگ پہ پانی کے چھینٹے ڈالے اور سالن کٹوری میں نکالتے پھر مستقیم کو دیکھا۔ جس کی پوزیشن میں ذرہ برابر فرق دیکھنے میں نہیں آ سکا تھا۔

"کھانا کھا لیں۔"

وہ چنگیر اٹھائے قریب آ گئی۔ مستقیم نے چونکے بنا نگاہ کا زاویہ بدل کر پہلے اسے دیکھا پھر چنگیر میں موجود ڈیڑھ روٹی کو آج پھر سالن کی جگہ آم کی چٹنی تھی۔ یہ بھی اس لیے شاید میسر تھی کہ گھر کیریوں کا درخت موجود تھا اور مالک مکان نے بخوشی انہیں آم استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔]

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

وہ بادل نخواستہ ہی بولا۔ دیا البتہ بے چین نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیوں بھوک نہیں ...... میرا مطلب ہے آپ نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔"

اس کی خشمگیں نظروں کے جواب میں وہ گڑبڑا کر خود ہی وضاحت بھی پیش کرنے لگی۔

"اس وقت اس لیے نہیں کھاؤں گا کہ روٹی ناکافی ہے۔ صبح اس لیے نہیں کھایا تھا کہ میں ایسا ناشتہ نہیں کر سکتا۔ ہو گئی تمہاری تسلی اب جاؤ یہاں سے۔"

جواب میں وہ زور سے پھنکارا تھا۔ ضبط اور حوصلہ کھو کر۔ اس کی آواز میں بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔ دیا اس کے اس طرح مشتعل ہونے کی وجہ تو نہیں سمجھی مگر سراسیمہ ضرور ہو گئی اسے قطعی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب جواب میں کیا کہے۔ جبھی آنکھیں بے بسی کے شدید احساس سمیت آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔

"کیوں کھڑی ہو۔ جاؤ یہاں سے۔"

وہ پھر چیخا تو دیا کے آنسو اس کے گالوں پہ اتر آئے تھے۔ کچھ کہے بغیر وہ منہ پر ہاتھ رکھے پلٹ کر بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ مغرب ہوئی پھر عشا بھی۔ دونوں نے اپنی پوزیشن بدلی نہ جگہ۔ وہ دکھوں اور عذابوں میں گھرا تھا۔ دیا کو رونے سے فرصت نہیں تھی۔ پھر اس نے ہی ہار تسلیم کی تھی اور آنسوؤں سے بھیگے گال رگڑتی اٹھ کر بیٹھ گئی صحن میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ پیپل اور آم کے درخت کی شاخوں کا سایہ چاندنی کے غبار میں صحن کے کچے فرش پر دور تک لمبا پھیلا ہوا تھا۔ اس سائے میں وہ کسی

مجسمے کی مانند ساکن بیٹھا نظر آتا تھا۔ ہنوز اسی پوزیشن میں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے پاس جاتے ہوئے جھجکی۔ ایسی ہی بیگانگی اور اجنبیت چھلک رہی تھی اس کے خدوخال سے۔ جو اس کے حوصلوں کو پست کرنے کا باعث تھی۔

"خلیفہ!"

وہ جیسے بول نہیں سکی تھی۔ جواب میں خاصی تاخیر سے خلیفہ نے اسے اچٹتی ہوئی ناخوش گوار نگاہ سے نوازا اور وہ جس جیسے کچھ بولنے سے کچھ کہنے سے قبل ہی سب کچھ بھولنے لگی کہ اس کا رویہ یہی کہتا لگتا تھا۔ فاصلہ رکھو۔ اپنی اوقات پہچانو۔ تکلیف دہ خاموشی غیر محسوس مگر بہت مضبوط انداز میں ان کے بیچ در آئی جسے توڑنے، دور ہٹانے کی ظاہر ہے خلیفہ کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اک رویے اک احساس نے اسے توڑا تھا۔ اب وہ یہی حربہ آزما کر اپنا کام نکالنا چاہ رہا تھا۔ اس نے جان لیا تھا۔ یہ نیکی کا دور نہیں ہے۔ اب نیکی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ حالانکہ نیکی کا کوئی مخصوص وقت مقرر نہیں۔ اس کا حکم تو ہمیشہ کے لیے ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے معاشرے کے رویوں سے غلط اور تکلیف دہ اثرات مرتب ضرور ہوا کرتے ہیں۔ جو قوموں اور نسلوں کی تباہی کا باعث ٹھہرا کرتے ہیں۔

"کیوں خفا ہیں؟"

بالآخر دیا نے پھر حوصلہ کیا تھا اسے مخاطب کرنے کا۔ اسے دیکھنے کا۔ جواباً اس کی نظروں کی سرد مہری کا تاثر مزید گہرا ہونے لگا۔ بیگانگی کچھ اور دبیز ہوئی۔ وہ بے اختیار و بے ساختہ رو پڑی کہ اس کا رویہ ایسا ہی ناقابل برداشت تھا۔ زیادہ وقت تو نہ گزرا تھا۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کے ہمدم و ہمراز تھے۔ بنا کہے ہر دکھ کو سمجھنے جاننے والے۔ کسمپرسی کے باوجود کیسی ڈھارس تھی اس اپنائیت و یگانگت کے باعث اور اب وہ یکلخت فاصلوں پر جا کھڑا ہوا تھا تو دیا خود کو ریتلی دیوار کی مانند بھربھرا کر گرتا ہوا پا رہی تھی۔

"کوئی ناراضگی ہے تو بتائیں۔ اس طرح مت کریں میرے ساتھ۔"

اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ خلیفہ مستقیم نے لہو چھلکاتی نظروں کو لمحہ بھر کو اس پہ اٹھایا تھا۔ پھر گلا کھنکارا۔

"تم مان لوگی میری بات؟"

"آپ کہیں تو..... کیا اعتماد نہیں رہا ہے مجھ پہ"

دیا کے اندر اس کی آواز سن کر ہی زندگی جنم لینے لگی۔ اس نے پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے اپنے

دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پہ رکھ دیے تھے اور منتظر سوالیہ نگاہوں سے مستقیم کو تکنے لگی۔

"امانت نے ایک پروپوزل دیا تھا مجھے۔ میں اسے ایکسپٹ کر چکا ہوں۔"

اس سے نگاہیں چار کیے بنا وہ قدرے دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ دیا کی نظروں کا استعجاب و اشتیاق خوف کی چادر میں سمٹنے لگا۔

"کیسا......؟ کیسا پروپوزل؟"

آواز اس کے حلق سے پھنس کر نکلی تھی۔ خوف چہرے کے خدوخال سے بھی چھلک پڑا۔

"دوبارہ مس گروہ کی سربراہی کا پروپوزل۔"

وہ اب بھی اس سے نگاہ ملائے بغیر بولا تھا اور کرتے کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے کے بعد کش لینا شروع کر دیا۔ جب کہ وہ فق چہرے کے ساتھ منہ پہ ہاتھ رکھے زمین پر ڈھے کر رہ گئی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرتا تھا اور تنے ہوتے ذہن کی نسیں جیسے پھٹنے کے قریب ہونے لگیں۔ صدمہ وشاک کا گہرا احساس اس کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرتا چلا گیا۔ کتنی دیر وہ پتھرائی آنکھوں کے ساتھ مستقیم کی بے نیازی کو تکتی رہی تھی پھر ضبط کھو کر زارو قطار رو پڑی۔

"آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں مستقیم! آپ نے وعدہ کیا تھا مجھ سے کہ......"

"چپ ہو جاؤ دیا! فارگاڈ سیک! نام مت لینا میرے سامنے کسی وعدے وعہد کا۔ سنا تم نے؟ سنا؟"

وہ مشتعل ہو کر کہتا ایک جھٹکے سے کھڑا ہو کر حلق کے بل چیخا۔ اس طرح کہ دیا سہمی ہوئی چپ ہو کر ساکت دیکھنے لگی۔ اس کے غصیلے اور بپھرے ہوئے انداز نے دیا کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

"کیا مل گیا تمہیں شرافت کی اس زندگی سے......؟ بولو؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے تو آج جانا جانا میرے لیے اس شرافت کے نام نہاد سرٹیفکیٹ کے ساتھ یہاں کوئی جگہ کوئی عزت نہیں۔ میں مزید تمہاری نہیں مان سکتا۔ دوسرے لفظوں میں تمہاری غلامی نہیں کر سکتا۔ میں ناکام ہوا ابھی پرانے راستوں پر لوٹ رہا ہوں۔ تم اتفاق نہ کرو مگر تمہارے اپنوں نے بھی یہی جتلایا تمہیں ان کی زندگیوں میں ان کے سیٹ اپ میں ہماری جگہ نہیں۔ اب بھی اگر تم نہ سمجھو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

اس کا لہجہ ہنوز تند اور غصیلا تھا۔ اس کے خدوخال میں تناؤ کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ دیا آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اسے چیختے چلاتے سنتی رہی۔ ہمیشہ نرمی سے بات کرنے والا، پیار اور شرارت

سے چھیڑنے والا۔ باتوں باتوں میں معنی خیز جملے کہنے والا اس وقت کیسا تلخ اور بدلحاظ ہو رہا تھا۔ دیا کا ذہن اس کے اس روپ کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔ دکھ بھی کوئی نہیں تھا نہ صدمہ ہی۔ وہ کس دکھ پہ آنسو بہاتی اور کسے چھوڑ دیتی۔ آج پہلی بار اس نے دیا کو اس کے والدین کی بے حسی کا طعنہ دیا تھا۔ آج جب وہ خود ایک غلط اور ناجائز کام کی پھر سے ٹھان چکا تھا۔ ان کے تعلق کے بیچ سے محبت، اپنائیت، مان کب کیسے ختم ہو گیا، معلوم ہی نہ ہوا تھا۔ سرخ چہرے کے ساتھ ضبط کی شدت سمیت نچلا لب کاٹتی وہ رحم طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"مم میں نے کہا تھا ناں کہ امانت......"

"فضول باتیں مت کرو، مجھے امانت نے نہیں اس دنیا کے بے رحم اصولوں نے مجبور کیا ہے واپسی پر۔"

وہ اس کی بات کاٹ کر اسے گھورتے ہوئے چلایا۔ دیا نے ہچکی سی بھری۔ اسے لگا یہ موقع اگر اس نے گنوا دیا۔ اپنے حصے کی جنگ نہ لڑی تو سب کچھ تباہ و برباد ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس کی ہمتیں سلب ہو رہی تھیں۔ توانائیاں زائل مگر وہ پھر بھی جدوجہد میں مصروف ہوئی۔

"حالات اور دنیا جتنی بھی بے رحم ہو مستقیم! نیکی اور سچائی پر کاربند رہنا ہی نیکی اور دیانت کی کامیابی ہے۔ ہمیں اس آزمائش میں پورے اترنا ہے۔ یہ حالات ہمیشہ کٹھن نہیں رہیں گے آپ"

"شٹ اپ دیا! اُف، میرے سامنے یہ لیکچر نہیں جھاڑو۔ مجھے نیکی کے سبق یاد نہ کراؤ۔ مجھے آج بھی سب کچھ ازبر ہے۔ مگر میں اس پر قائم رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے کہ مجھے اس پہ قائم رہنے نہیں دیا جا رہا۔ بات سنو........"

وہ بھڑک کر زور سے چیخا۔ اس کا فق چہرہ دیکھ کر لمحہ بھر کو رکا اور لہو رنگ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بے رحمی سے پھنکار کر بولا تھا۔

"اگر واپسی کا راستہ میرے لیے کھلا ہے ناں دیا! تو میں اسے تمہارے لیے بھی کھلا چھوڑ رہا ہوں۔ تمہارے والدین نے تمہیں ایکسپٹ نہیں کیا۔ مگر وہ تمہیں گھر سے بھی نہیں نکالیں گے۔ اگر میرے ساتھ میرا فیصلہ تمہیں قبول نہیں تو واپس چلی جاؤ۔ میں ہرگز برا نہیں مانوں گا۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ دیا کا سکتہ ٹوٹا تو وہ تڑپ تڑپ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی اور یہ پہلا موقع تھا کہ خلیفہ مستقیم اس کے آنسوؤں سے بے چین ہوئے بنا اسے چپ کرانے کو جتن کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وسعتِ وحشتِ ہجر دیکھ کے پھر جاتا ہوں
تجھ سے آگے کا سفر دیکھ کے ڈر جاتا ہوں
روز ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح شام گئے
میں بھی اک درد کے دریا میں اتر جاتا ہوں
وہ بھی چپ چاپ کہیں بیٹھ کے روتی ہو گی
میں بھی راتوں کو اب دیر سے گھر جاتا ہوں
میں نے بھی جرم بغاوت کے ستم جھیلے ہیں
میں بھی اب لوگ جدھر جائیں ادھر جاتا ہوں
چل پڑا ہوں میں اب دنیا کے اصولوں پہ
میں بھی اب اپنی باتوں سے مکر جاتا ہوں

وہ ساکن لیٹا ہوا تھا۔ بالکل ساکن۔ اس کی آنکھوں پر اس کے دونوں بازو دھرے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا اس کے قمیض کی آستین کیوں غمناک ہیں۔ اس نے غیر محسوس انداز میں پھر بازوؤں کی جنبش سے آنکھوں کو رگڑ کر پونچھا۔ بہت عرصے بعد آج پھر اس کا دل اپنی...... اپنی زندگی کی بربادی پہ ماتم کناں تھا۔ دیا کے سامنے جو اپنا بھرم کھویا تھا۔ تاثر خراب کیا تھا اس پر دکھ کا عالم بھی انوکھا ہی تھا۔ وہ ہار گیا تھا۔ اس نے آج خود اس لڑکی کو دکھ دینے کی انتہا کر دی تھی۔ جس کی آنکھوں کی نمی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ لیکن وہ اس کی بات بھی تو نہیں مانتی تھی۔ کیوں تھی وہ اتنی ضدی اور اتنی پارسا۔

نیکی سچائی اور اصول پرستی کے سارے اسباق اگر پڑھ لیے تھے تو ان پر کاربند کیوں رہنا چاہتی تھی۔ تھا کوئی اس سے بڑھ کر احمق؟ اسے ہنسی آنے لگی۔ ہاں کبھی وہ بھی تھا نا ایسا ہی احمق۔ دنیا اور ستمگر لوگ اسے بھی اچھائی کے جواب میں برائی سے نواتے رہے تھے اور ہانک ہانک کر برائی کے راستے پہ ڈالتے رہے۔ وہ ضمیر کے آگے شرمسار شرمندہ ہوا پھرتا۔ مگر کب تک۔ آخر ضمیر سو گیا تھا۔ اسے بھی یقین تھا دیا کا ضمیر بھی سو جائے گا۔ پھر وہ پرسکون ہو جائے گی۔ ہاں اتنی سی تو بات ہے، بھلا کہاں جا سکتی تھی وہ اسے چھوڑ کر وہ مطمئن تھا۔

اس نے اسے اس قابل چھوڑا ہی کہاں تھا کہ وہ اسے چھوڑ دیتی۔ اس کے پیروں میں زنجیریں ہی اتنی ڈال دی تھیں، اپنی اولاد کی، اپنی محبت کی، بدنامی کی وہ اب اس کے علاوہ اور کہیں پناہ حاصل کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے مطمئن ہونا چاہیے تھا مگر وہ ابھی بھی ٹھیک سے بے حس نہیں ہو سکا تھا۔ ابھی

بھی جبھی مطمئن نہیں بے چین تھا۔

معاً کوئی آہٹ ہوئی۔ مستقیم ساکن و سامت جیسے تھا ویسے پڑا رہا۔ آنکھوں پہ دھرے بازوؤں کے درمیان موجود جھری اسے دکھا رہی تھی دیا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ کچھ دیر متذبذب وہیں چوکھٹ کے پاس کھڑی رہی۔ پھر چٹائی پہ اس کے پہلو میں آ گئی۔ مناسب فاصلہ رکھ کر۔ یقیناً وہ اب بھی بہت خفا تھی اس سے۔

"باہر چل کر لیٹو۔ اپنی جگہ پر۔"

مستقیم نے کروٹ بدل کر رخ اس کی جانب پھیرتے خشک و سرد آواز میں اسے مخاطب کیا۔ دیا نے ٹھٹک کر کچھ تحیر کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ کھلی کھڑکی سے آتی مدھم روشنی میں وہ کتنی دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھتی تھی۔

"باہر بارش ہو رہی ہے اور یہ میری ہی جگہ ہے۔"

اطلاع دینے کے ساتھ اس نے جیسے اب کے مستقیم کو کچھ یاد دلانا چاہا تھا۔ جواباً وہ زہرخند سے ہنسا وہ دانستہ کٹھور پن کی حد کر دینا چاہتا تھا تا کہ اسے فیصلہ کرنے میں آسانی اور سہولت رہے۔

"کب تک؟"

اور دیا رنج اور اذیت سے جیسے شل ہو کر رہ گئی۔"

"اس کا فیصلہ بھی آپ کریں گے، ویسے ہی زبردستی، جیسے مجھے یہ جگہ دی تھی۔"

وہ بھی پھٹ پڑی تھی اور تقریباً رو بھی۔

"یہ زبردستی کا فیصلہ تھا۔ جبھی تو تم اسے قبول نہیں کر سکیں۔ کچھ فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ باقی تمہیں کرنا ہے۔ میرے ساتھ چلنا ہے تو میری مرضی کے مطابق بھی رہنا ہوگا۔ دوسری صورت میں......"

"آپ اتنے ظالم کیوں ہیں خلیفہ! کیوں ہیں اتنے بے حس؟"

اس کی پوری بات سنے بغیر دیا نے اسے زور سے جھنجھوڑ دیا تھا اور پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

مستقیم نے رعونت زدہ تاثرات کے ساتھ اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"اس قسم کی باتوں کا فائدہ ہے اب نہ گنجائش۔ فیصلہ کرو، وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

اجنبی اکھڑے تیکھے تیوروں سے اس نے بظاہر دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ مگر سنگینی...... اللہ اللہ دیا بے بس گھبرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی کہ واقعی اس کے کسی انداز میں ہرگز کوئی نہ گنجائش باقی نہیں تھی۔

"میں آپ کی بات مان لوں گی مستقیم! پلیز اک کوشش کر لینے دیں مجھے۔"

کوئی چارہ نہ پا کر وہ اس کی منت پہ اُتری۔ مستقیم نے استعجابی انداز میں بھنوؤں کو جنبش دی۔

"کیسی کوشش"

"میں آزما چکی اپنے والدین کو اک کوشش آپ کی طرف بھی مجھے......"

اس کی بات ادھوری رہ جانے کا باعث مستقیم کا اس کے چہرے پر اٹھا ہوا ہاتھ تھا، وہ پوری ہستی سمیت ہل تو گئی ہی تھی۔ سناٹے میں گھری ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اسے غیر یقینی سے تکتی رہ گئی۔

"لو دوبارہ یہ نام...... بدبخت لڑکی! تم میرے ماضی سے اس لیے آگاہ ہوئی تھی کہ مجھے بات بے بات رگیدتی اور طعنہ دیتی رہو۔ نہیں ہیں وہ لوگ میرے کچھ بھی۔ کوئی تعلق بھی نہیں ہے میرا تو تمہارے وہ کچھ کدھر سے ہو گئے۔ آج کے بعد ان کا نام دوبارہ لیا تو گلا گھونٹ دوں گا تمہارا۔

مشتعل لہجے سے چھلکتا غضب جلال اور غراہٹیں دیا کے اعصاب کو منجمد کر کے رکھ گئیں۔ اس کی بے انتہا بدحواس متوحش نگاہیں سراسیمہ انداز میں اس پر اٹھی ہوئی تھیں۔ رگ رگ میں جیسے کوئی محشر برپا ہو چکا تھا۔ جب کہ وہ اس کی سماعتوں میں اس پر ذرہ برابر رحم کھائے بغیر پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہا تھا۔

"اب سمجھا ہوں میں تمہیں۔ تم مجھے یہاں رکھنا ہی اس لیے چاہتی ہو کہ کسی دن پولیس کے چھاپے کے نتیجے میں بے بسی کی موت مارا جاؤں۔ اب اگر تم واپس مجھے میرے پیرنٹس تک لے جا کر مزید ذلیل کرانے پر تلی ہو یا اپنی اس ہتک کا اس انداز میں مجھ سے بدلا لینا چاہتی ہو تو بات سنو...... کوئی خوش فہمی تمہیں لاحق تھی اپنوں کے متعلق مجھے نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں ایسی حماقت کے نتیجے میں میرا باپ جو میری نفرت کی انتہا پہ پہنچ چکا ہوگا یقیناً...... وہ پہلی فرصت میں پکڑ کر مجھے پولیس کے حوالے کر کا۔ میں پھانسی چڑھوں گا اور تم اس نام نہاد مظلومیت کا لبادہ اوڑھے سب کی ہمدردیاں حاصل کر و گی۔ محترمہ!......" وہ پھنکارا پھر زہریلی ہنسی ہنسا اور اس کا سکتہ زدہ چہرہ دیکھا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مگر ایسی موت نہیں مروں گا جیسی تم چاہتی ہو۔ سن لیا تم نے؟"

وہ پھر غرایا۔ دیا چپ رہی۔ مستقیم اسے گھورتا ہوا پلٹ گیا۔ وہ کمرے سے باہر بارش میں جبکہ دیا کمرے کے اندر اپنے آنسوؤں میں بھیگتی رہی تھی۔ آگ دونوں جانب لگی تھی۔ جو بجھتی ہی نہ تھی۔ مستقیم کی آنکھیں جلتی تھیں اور ہونٹوں پر لفظ سلگنے لگے تھے۔

تجدید راہ رسم کے قابل نہیں تھے ہم مگر

موسم دل کا حکم تھا تعمیل کر دیا

ہم مر گئے کہ مٹ گئے جاں سے گزر گئے
وعدہ کسی طرح سے بھی تکمیل کر دیا
عہد وفا ، سرور محبت، خمار عشق
گرد و غبار وقت نے تحلیل کر دیا
نازک مزاج تھے کبھی پھولوں کی طرح ہم
ان حادثات وقت نے تبدیل کر دیا

اس کے جلتے جلتے چہرے کو بھگوتی بارش ہی تو اکیلی نہ تھی۔ آنسو بھی ساتھ مل گئے تھے۔ آج اس کا شمار بھی ان بدقسمت ترین لوگوں میں ہوا تھا جو محبت پا کر پھر سے کھونے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جو ہدایت ملنے کے بعد پھر سے اندھیروں میں گم ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

ظالم تھا وہ اور ظلم کی عادت بھی بہت تھی
مجبور تھے ہم بھی اس سے محبت بھی بہت تھی
واقف ہی نہ تھا رسم محبت سے وہ ورنہ
دل کے لیے تھوڑی سی عنایت بھی بہت تھی
یوں ہی نہیں مشہور زمانہ میرا قاتل
اس شخص کو اس فن میں مہارت بھی بہت تھی

اس کے پہلو میں وہ گم صم بیٹھی تھی۔ ایسے جواری کی طرح لٹی پٹی جس نے داؤ میں آخری پونجی بھی گنوا دی ہو۔ یہ اسی رات کے آخری پہر کی بات تھی۔ مفرور ڈاکوؤں کی مخبری ہونے پر پولیس نے اس قصبے میں چھاپہ مارا تھا اور انہیں افراتفری کے عالم میں وہ جگہ وہ ٹھکانہ چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ امانت ازلی وفاداری نبھاتے ہوئے یہاں بھی ساتھ نبھا گیا تھا اور اکیلے فرار ہونے کی بجائے انہیں ساتھ لیے آ پہنچا تھا۔

دیا کچی نیند سے جاگی تھی۔ اس افتاد پر سانس لینا بھی بھولنے لگی۔ اس پر خلیفہ مستقیم کی بے اعتنائی کا کوئی انت ہی نہ تھا۔ وہ کیسا بے حس اور نخوت زدہ انداز لیے سوالیہ نشان بنا کھڑا تھا اس کے سامنے۔

''اپنے فیصلے سے آگاہ کرو مجھے، میرا ساتھ نبھانا ہے یا واپس جانا ہے؟''

وہ اگر محبت سے بھی ایسی آفر کرتا تو وہ نہ مانتی، یہ تو پھر ہر انداز ستم گری کا تھا۔ مگر دوسرا راستہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔ دکھ کی عظیم دکھ کی بات بھی یہ کہ وہ اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر استعمال کر رہا تھا۔ اس کے ایک طرف کھائی تھی دوسری جانب کانٹوں سے اٹا راستہ۔ وہ کانٹوں سے اٹا راستہ بخوشی عبور کر لیتی اگر وہ اس کا ساتھ نبھاتا۔ وہ ہی راستہ بدل گیا تھا تو اکیلی کیا کرتی وہ............ ''وہ بھی ایسی صورت میں جب کہیں اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ اگر وہ اس کا ساتھ نہ دیتی تو حرص و ہوس سے بھری اسی دنیا کے لوگ اس کی عزت و ناموس کی بوٹیاں نوچ کھاتے۔ مستقیم کے ساتھ قدم بڑھاتی تو ہر راستہ گناہ کا راستہ تھا۔ ہر ٹھکانا شیطان کی پناہ گاہ تھا۔ بے بسی بے مائیگی، اعصابی شکستگی......وہ جیسے پوری طرح ہار کر سسک پڑی تھی۔

''آپ ایک احسان کر دیں مجھ پر مستقیم! مجھے مار دیں۔ بس مار کر دبا دیں مجھے اور کوئی حل نہیں ہے میرے پاس۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور ایک لمحے کو مستقیم کا وجیہہ چہرہ متغیر ہو کر رہ گیا تھا۔

''مستقیم! کیا فضول بحث میں الجھ گئے ہو یار، پولیس ہمارے سروں پر پہنچ جائے گی تب ہلو گے؟'' امانت کی آواز تھی یا صور اسرافیل۔ وہ کرنٹ کھانے کے انداز میں ہڑبڑا کر ہوش میں آیا۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچے تھے اور کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ دبوچ کر اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ وہ مزاحمت نہیں کرتی تھی مگر زارو قطار روتی ضرور تھی اور پلٹ پلٹ کر بار بار پیچھے دیکھتی تھی، پیچھے...... جہاں سب کچھ اس کا کھو گیا تھا۔

اس کے خواب
امیدیں
حوصلے
ہمتیں
آس تک
نیکی اور ہدایت تک۔

وہ بالکل تہی داماں، تہی دست، تہی دامن وہاں سے نکلی تھی۔ تو زندگی میں کوئی رنگ کوئی احساس نہیں بچا تھا۔ اک بار پہلے بھی واپسی کا سفر شروع ہوا تھا۔ جس نے اسے یہ سارے انمول تحفے بخشے تھے مگر شاید وہ قدر نہیں کر پائی تھی۔ جو بھی واپس لے لئے گئے۔ یہ بھی واپسی کا ہی سفر تھا۔ مگر یہ

ہدایت سے گمراہی کی جانب۔ جس میں کوئی خوش امیدی کوئی آس نہیں تھی۔

☆......☆......☆

ملے ہمیں بعد مدت . کے بلا کے سرد ہیں لہجے
کہ جلنا بھی نہیں ممکن پگھلنا بھی نہیں ممکن
امیدیں ٹوٹ جانے سے تعلق ٹوٹ جاتے ہیں
دلوں میں حسرتیں لے کر بہلنا بھی نہیں ممکن
بہت ناکامیاں لے کر ہوئے ہیں خاک کے قیدی
چلو اب آج سے گھر سے نکلنا بھی نہیں ممکن
اسے اتنا نہ سوچا کر تیری عادت نہ بن جائے
پھر ایسی عادتیں محسن بدلنا بھی نہیں ممکن

وہ ایک بہت بڑا حویلی ٹائپ گھر تھا۔ جس کے اطراف میں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ غیر آباد غیر شناسا علاقہ۔ جہاں وہ سب آ کے اتنے مطمئن تھے جیسے ہر خطرے کی حد سے نکل آئے ہوں۔ سب سے زیادہ شمائل کی چہکاریاں گونجتی تھیں۔ جیسے بچ میں سب کچھ فتح کر لیا ہو اللہ جانے دنیا بھر کی سہولتوں سے مزین یہ عشرت کدہ کہاں سے حاصل کر لیا تھا انہوں نے یا پھر سارا کچھ پہلے سے منصوبے کے تحت تیار کیا گیا تھا۔ ان کے ٹھاٹ دیکھنے والے تھے۔ خود مستقیم بھی یکسر تبدیل ہو گیا۔ لباس سے لے کر چلنے تک۔ اس وقت وہ بلیو جینز پہ وائیٹ ہاف سلیو شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ آرمی کٹ اسٹائل اور فریش شیو اس کی وجاہتوں اور خوبروئی کو ہی دو آتشہ نہیں کر گئی تھی۔ اسے مطمئن اور آسودہ بھی ظاہر کرتی تھی۔ ایسے میں ایک واحد دیا تھی جس کے اندر رہی سہی زندگی بھی دم توڑتی جا رہی تھی۔

انہیں یہاں آئے آج دوسرا دن تھا اور پانی کے گھونٹ کے علاوہ اس نے حلق سے کچھ اتار کر نہیں دیا تھا۔ وہ خلیفہ سے خفا تھی بہت خفا، مگر اسے پرواہ کہاں تھی۔ مجال ہے جو ایک بار کھانے پر اصرار تو دور کی بات ہے اسے دیکھا بھی ہو اس نے، بلکہ شمائل کے لہک کے کہنے پر کہ

تمہاری ڈیئرسٹ وائف نے صبح ناشتہ کیا نہ کھانا کھایا کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔"

کے جواب میں اس نے بے نیازی سے کاندھے جھٹک دیئے تھے۔

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ دل کرے گا تو کھا لے گی۔ نہیں تو دیکھتے ہیں کب تک بھوکی رہتی ہے۔"

اور دیا پتھرا گئی تھی، منجمد، ساکن، غیر یقین، وہ کیسے یقین کر لیتی یہ وہی مستقیم تھا۔ جو اس کی ضدوں کے جواب میں منت سماجتوں سے اپنا آپ ہلکان کر لیا کرتا تھا۔

"کوئی اتنا بھی بدل سکتا ہے؟"

وہ آنسوؤں کی بارش میں خود سے سوال کیے جاتی اور جواب ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔ مستقیم بدل گیا تھا۔ وقت بھی بدل گیا تھا۔ بس وہی نہیں بدلی تھی۔ اس کا دل نہیں بدلا تھا۔ مستقیم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ رات کے دو بجے بھی، وہ کمرے میں اکیلی تھی اور ڈر اس لیے رہی تھی کہ بارش کے ساتھ بادلوں کی گڑگڑاہٹ بھی شروع ہو چکی تھی۔ مستقیم جانتا تھا۔ وہ اس طوفانی موسم سے ہراساں ہوتی ہے۔ وہ پھر بھی کمرے میں نہیں آیا تھا۔ اس کے ضبط اور صبر کی انتہا ہوئی تو انا کا دامن چھوڑ کر خود اس کی تلاش میں اٹھی تھی۔ پورا گھر روشنیوں سے جگمگاتا تھا۔ وہ کارپڈ سیڑھیاں اتری نیچے ہال میں آئی جہاں اس وقت وہ تینوں موجود تھے مگر امانت نشے میں تقریباً دھت ہاتھ پیر چھوڑے پڑا تھا۔ مستقیم البتہ شمائل کے ساتھ شطرنج کی بازی لگائے بیٹھا تھا۔ شمائل شطرنج سے زیادہ کہیں بڑھ کر مستقیم میں گم لگتی تھی۔

"آج تم ہمیشہ سے کہیں زیادہ اچھے لگ رہے ہو۔ حواسوں پہ طاری ہوتے ہوئے حواس چھین لیتے ہوئے۔ شمائل نے بے باکانہ انداز میں اس کی تعریف کی تھی۔ دیا کے قدم وہیں تھم گئے۔ ناگواری سے زیادہ بے بسی کا احساس اس کا گھیراؤ کرنے لگا۔ اسے لگا اس میں اس کی گنجائش باقی نہیں۔

"شرم کرو کچھ تمہارا شوہر محض چند فٹ کے فاصلے پر ہے موجود اور تم ......

"وہ بھی جانتا ہے اور تم بھی ...... کہ میں اس سے نہیں ہمیشہ سے تم سے محبت کرتی ہوں۔ یہ تو محض ایک ڈھکوسلہ ہے تم سے قریب رہنے کا۔"

اس کی بات کاٹ کر وہ ناز سے مسکرائی تھی۔ دیا کے اندر سے برہمی کا ابال سا اٹھا وہ مستقیم کے جواب کا انتظار کیے بنا تلملاتی ہوئی ان کے سروں پر چڑھی تھی۔

"خلیفہ......! میں کب سے انتظار کر رہی ہوں آپ کا کمرے میں اور آپ یہاں اس فضول کام میں مگن ہیں۔"

اس کے لہجے میں غیر شعوری طور پر اس رشتے اور محبت کا استحقاق در آیا تھا جو ان کے درمیان قائم ہو چکا تھا۔ شمائل پہ جو اس نے جھلستی نگاہ ڈالی تھی اس میں کچھ جتلایا گیا تھا۔ مستقیم نے چونک کر دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ دہک رہا تھا۔ مستقیم کے نقوش میں عجیب سا تناؤ اتر آیا۔

"میں نے تمہیں انتظار کو نہیں کہا۔ آ جاؤں گا جب میرا دل چاہا۔ تم جاؤ۔"

وہ بے حد سرد آواز میں کہہ کر پھر اپنے شغل میں مصروف ہوا تھا۔ دیا کو اس کے جواب سے زیادہ شائل کی حرکت نے بھڑ بھڑ جلایا تھا۔ جو محض اس پر اپنی حیثیت واضح کرنے کو سرک کر مستقیم کے پہلو سے تقریباً چپک گئی تھی اور مستقیم نے جواب میں کسی قسم کی کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی تھی۔ دیا کو لگا اس کے دماغ کی رگیں تن گئی ہیں اور کسی بھی لمحے پھٹ جائیں گی۔ اپنے بے وقعتی اور بیکی کا احساس آنکھوں میں آنسو بھرنے لگا۔

اتنی بے رحمی

اتنی تذلیل

اتنی دھتکار

اس کا دل چاہا مستقیم سمیت ہر شے کو ملیامیٹ کر کے ہر شے پر تھوک دے۔ اس کا دل یہ بھی چاہا وہ چیخے روئے اور مستقیم کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑے اور کہے۔

"محبت کے جھوٹے دعویدار محبت تم نے نہیں کی۔ میں نے کی ہے۔ محبت چھیننے کا نہیں محبت تو دینے کا نام ہے۔ تم نے صرف چھینا، میں نے بس دیا مگر وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکی۔ اس میں تو شائل کو بھی دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ جو اسے جتلاتی فاتحانہ نظروں میں تمسخر بھر کے دیکھتی نہیں گھورتی تھی۔ ہاں وہ واقعی جیت گئی تھی۔ ورنہ وہی تھی جس کی جسارت پہ خلیفہ نے اسے طمانچہ رسید کیا تھا اور دیا کو ہزاروں وضاحتوں کے بعد کتنی منت سے منایا تھا۔ پرانی یادیں زخم ہی نہیں کریدتی تھیں۔ آنکھوں میں لہو بھی بھرتی تھیں۔ کیسی بے بسی اور بے اختیاری تھی۔ نہ آگے جانے کا کوئی راستہ تھا نہ پیچھے ہٹنے کا۔ اسے لگا وہ دکھی پہلے نہیں تھی۔ اب ہوئی ہے۔ عمر بھر کی تلخی اور محرومی کے ساتھ احساس زیاں اس کی جھولی میں آ گرا تھا۔ روح میں کیسا تلخ احساس جاگا چھلکتی آنکھیں لیے وہ تیزی سے پلٹ کر واپس بھاگی اور جب سے اسے گھور کر دیکھتا ہوا مستقیم سیڑھیوں کے موڑ پہ اسے غائب ہوتا پا کر شائل کی جانب متوجہ ہوا تو بے حد متنفرانہ انداز میں اسے جھٹک کر خود سے دور ہٹایا تھا۔

"کتنی بار سمجھاؤں۔ میرے ساتھ اک حد میں رہا کرو۔"

وہ غرایا تھا آنکھیں کسی خون آشام درندے کی مانند سلگ رہی تھیں ۔ وہ خائف ہوئے بغیر مسکرائی گویا کہہ رہی ہو۔ تمہاری کمزوری کو پا چکی ہوں۔ اگر تمہیں دیا سے ا ا دور لے آئی ہوں تو اب خود سے اتنا قریب لانے میں بھی ضرور کامیاب ہو جاؤں گی۔ بس تم دیکھتے رہو۔ مستقیم اس کی نظروں کی حکایت پڑھ کر ہی برافروختہ ہوا تھا۔

"دفع ہو جاؤ۔"

جواباً وہ مسکرائی اور کاندھے جھٹک دیے۔ مستقیم واپس سیدھا سیدھا لیٹ گیا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیے۔

"اب میں زندگی کے کسی مقام پہ تمہارے سامنے نہیں جھکوں گا دیا! تمہیں جھکنا ہے۔ میں بے فکر ہوں کہ تمہارے سارے راستے واپسی کے بند ہو چکے۔ پھر میں تمہیں اپنی کمزوری کیوں بتاؤں کہ تم مجھے اپنے اشاروں پر نچا سکو۔ نہیں اب وہ ہوگا جو میں چاہوں گا اور تم وہ کرو گی۔ کیسے ......؟ یہ تم آہستہ آہستہ جان جاؤ گی۔"

☆......☆......☆

وہ واقعی بدل گیا تھا۔ بچی کھچی انسانیت بھی اندر سے کھرچ پھینکی تھی۔ اب وہ محض ایک لٹیرا تھا۔ ایسا لٹیرا جسے اپنے پرائے کی تمیز نہیں رہتی۔ جس کے پیش نظر اپنا مفاد اہم ہوا کرتا ہے۔ اس رات ہواؤں کے طوفانی جھکڑ اس کے کمرے کی کھڑکیوں سے ٹکراتے اور آہ و پکار کرتے گویا اسے بد دعائیں دیتے رہے۔ مگر اس کا دل نہیں کانپا۔ اسے معلوم تھا دیا کو اس کی ضرورت ہے مگر وہ اس کے پاس نہیں گیا۔ وہ اسے پوری طرح بے امید کر دینا چاہتا تھا۔ پوری طرح توڑ دینا چاہتا تھا تا کہ از سرے نو اس کی تعمیر کر سکے۔ اپنی مرضی کی تعمیر۔

☆......☆......☆

بارش زور پکڑ چکی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ آندھی اور طوفان کے جھکڑیوں چل رہے تھے۔ گویا تناور درختوں کو جڑ سے اکھاڑنے کا عزم کر چکے ہوں۔ ہوا کی شائیں شائیں چابک کی طرح پودوں، فصلوں اور مکانات کی دیواروں پر ضربیں لگا رہی تھی۔ بادلوں کی گھن گرج میں کہیں کہیں کسی جانور کی سہمی ہوئی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ ایسا ہی طوفان اس کے اندر بھی امڈ آیا تھا۔ اس سے بھی کہیں شدید۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آتی تھی مستقیم کے رویے کی۔ اپنی من مانی کر کے بھی وہ آخر اس سے خفا کیوں تھا۔ روٹھا ہوا کیوں تھا۔ اس طرح ایک بار پھر اپنی ذات کے گنبد میں کیوں بند ہو چکا تھا کہ اول تو وہ اس تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ پہنچ بھی جاتی تو بند دروازے پر بس دستک ہی دیتی رہتی۔ جیسے ابھی بھی پہنچی تھی وہ دروازہ کھولنے پہ آمادہ نہیں تھا۔

اس لمحے بہت زوردار طریقے سے بجلی کڑکی۔ کڑک اتنی زوردار تھی کہ وہ کسی طرح بھی خود پر قابو نہ رکھ سکی اور خود میں سمٹتی ہوئی بے اختیار چیخ مار کر بلند آواز سے روتی چلی گئی جانے کتنی دیر وہ یونہی

بکھرتی اور سمٹتی رہی تھی پھر خود کو سنبھال کر اٹھی اور وضو کر کے قبلہ رخ کھڑی ہو گئی۔ یہ وقت تہجد تھا۔ دعاؤں کی قبولیت کا وقت۔ وہ رب سے ہی مانگنے کی عادی رہی تھی ہمیشہ۔ اس وقت بھی اسی پاک ذات کے حضور ہاتھ پھیلا دیے۔ آنسو زارو قطار بہنے لگے جو اس کے شدید غم کے مظہر تھے۔

"اے خدا مجھے صبر اور استقامت عطا فرما!

"اے خدا مجھے صبر اور استقامت عطا فرما! اگر یہ آزمائش ہے تو سرخرو ہونے کا موقع دے۔ اگر ظلم ہے تو ظالم کے ذہن میں ہدایت اور عدل کی روشنی اتار دے۔ اگر یہ میرے گناہوں کی سزا ہے تو مجھے کفارا ادا کرنے کی توفیق سے نواز دے اور اگر تیری رضا ہے۔ میری تقدیر کا باب ہے تو پھر مجھے اپنی رضا پہ راضی اور خوش ہونے کی توفیق عطا فرما دے۔ مالک اندھیروں سے روشنی اور روشنی سے پھر اندھیروں کا سفر مجھے تیری ناراضی اور اپنی کوتاہوں کے سوا کچھ نہیں لگتا۔ مجھے معاف فرما اور ایسے نازک وقت میں اکیلا نہ چھوڑ۔ رہنمائی فرما، اور مدد فرما، کہ تیری مدد کے بغیر میں کچھ بھی اچھا نہیں کر پاؤں گی۔

آنسو ابل رہے تھے اور قلب و جاں کی کثافت دھلی جا رہی تھی۔ دعا کے بعد وہ وہیں کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی تو آنکھ دوبارہ اس وقت کھلی جب صبح کا اندھیرا اجالے میں بدل رہا تھا۔ دیا نے عجلت میں پھر وضو کیا اور نماز فجر ادا کی تھی۔ اس کے بعد کمرے سے نکل آئی۔ اس کا رخ کچن کی جانب تھا۔ حالات کے سامنے اگر اس نے شکست تسلیم نہیں بھی کی تھی تو اپنی اکڑ بھی برقرار نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ پہلے بھی اس نے خلیفہ کو محبت اور خدمت سے ہی جیتا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح بازی پلٹنا چاہتی تھی۔ اس کا ارادہ ان سب کے لیے ناشتہ بنانے کا ہی تھا مگر پہلے ہی مرحلے پہ اس کا سامنا اسی دشمن جاں سے ہو گیا تھا۔ ابلتی ہوئی چائے کو چھان کر مگ میں ڈالتا ہوا وہ صبح کے اس نوخیز اجالے میں اپنی تمام تر دلکشی اور خوبروئی سمیت ہرگز بھی اتنا کٹھور نہیں لگ رہا تھا جیسا آج کل ہو چکا تھا۔

"مجھے پتا تھا۔ تم شکست تسلیم کر لو گی۔ کھانا ایسی ہی اپنی بنیادی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر گزارہ نہیں ہے ڈیئر وائف!" رخ پھیرتے ہی اسے روبرو پا کے وہ اچھا خاصا چونکا تھا۔ پھر مسکراہٹ دباتے ہوئے گویا اک ساتھ اسے بہت کچھ جتلایا۔ دیا نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"اچھا کیا نا۔ میں نے منت سماجت میں وقت ضائع نہیں کیا۔ ویسے بھی اب تم میرے بچے کو اپنی فضول ضد سے کیا نقصان پہنچا سکو گی۔ چند دن میں پھر وہ تمہارے قبضے سے نکل کر میری تحویل میں ہو گا اور میں اسے اپنے انداز میں پروان چڑھاؤں گا۔ ایک ڈاکو کے بچے کو اس سے بڑا ڈاکو بننا چاہیے

ہے ناں؟"

اس کی آنکھوں میں جھانکتا اک اک لفظ چبا کر کہتا وہ کہیں سے بھی پہلے والا مستقیم نہیں تھا۔ دیا کی آنکھیں چھلک گئیں۔ بے بسی کے مظہر آنسو گال بھگونے لگے۔

"آپ اتنا کیسے بدل سکتے ہیں مستقیم!"

وہ جیسے کراہی تھی۔ جواباً وہ بے رحم انداز میں ہنستا رہا۔

"میں درحقیقت یہی تھا۔ تم نے سمجھنے میں غلطی کی ہے بس۔ ساری دنیا مفاد پرست ہے۔ میں نے کیا انوکھا کیا۔ کون ہے جو اپنی غرض کا غلام نہیں ہے؟ امانت کو دیکھا تم نے؟ کیا کیا ہے اس نے؟ میں نے اگر یہ کر لیا تو کیا ستم ہو گیا۔"

اب کے وہ بولا نہیں پھنکارا تھا۔ دیا ساکن کھڑی رہی۔

"اپنے کمرے کی الماری کھول کر دیکھو۔ بیش قیمت ملبوسات سے بھری پڑی ہے۔ کوئی ڈھنگ کا لباس پہن لینا۔ ذرا شکل نکل آئے گی۔ ورنہ تمہاری شکایتوں میں اک اور کا اضافہ ہو جائے گا کہ میں تمہاری بجائے شمائل کو کیوں دیکھنے لگا ہوں اب۔

چائے کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگائے ہوئے بے رخی سے کہتا وہ مڑ کر کچن سے نکل گیا۔ دیا کا سکتہ مزید گہرا ہو گیا تھا۔ بے شرمی اگر ڈھٹائی اختیار کر لے تو پھر اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا مشکل نہیں ہی نہیں ناممکن بھی ہو جایا کرتا ہے۔ دیا کو لگا اس کی امیدیں ڈگمگاتے لگی ہوں۔ وہ ہار سے اور قریب ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

دادی کی طبیعت ایک دم سے خراب ہو گئی تھی۔ اتنی کہ ان کے ہاتھ پیر ہی پھول کر رہ گئے۔ کچھ نہ سوجھا تو محلے کے لڑکے کو دوڑا کر ٹیکسی منگوائی اور ہسپتال لے کر بھاگیں۔ وہاں جا کے خیال آیا۔ ذی شان کے بابا کو بھی تو خبر کرنی چاہیے۔ تب معلوم ہوا افراتفری میں میں فون بھی گھر ہی بھول آئی ہیں۔

سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اب انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایسی ضرورت ان کی ریسپشن پہ بھی پوری ہو سکتی ہے۔ دواؤں کا پرچا ہاتھ میں پکڑے پریشان حال سی وہ گیٹ پہ موجود چوکیدار سے کسی قریبی فون بوتھ کا پوچھ رہی تھیں۔ جب پاس سے گزرتے عبدل ماجد کی نگاہ ان پر پڑی تھی اور وہ خود کو ان کی جانب بڑھنے اور اپنی خدمات پیش کرنے سے کسی طرح باز نہیں رکھ سکے تھے۔ بچھڑ کر پھر ملنے والے نے انہیں اتنا ہی تبدیل کر دیا تھا کہ وہ سر راہ بھی یونہی خدمت خلق کے لیے خود کو وقف کر چکے تھے اور بدلے میں بس اسی کی واپسی، اسی کے ملنے کی دعا کی التماس کیا کرتے۔ اس کی ماں نے تو

عرصہ ہوا مستقل بستر سنبھال کر ان کی پشیمانی اور احساس جرم کو وہ کوزا بنا دیا تھا جو برستا تھا تو اپنی سفاکی و بے رحمی پر دھیان نہیں لگاتا تھا۔

ہر لمحہ موت کے قریب ہوتی اور زندگی سے مایوس ہوتی وہ عورت اب ان سے جھگڑنا اور شکوہ کرنا بھی چھوڑ چکی تھی۔

''آپ کا بہت شکریہ بھائی صاحب! دراصل پریشانی میں گھر سے نکلتے اس بنیادی ضرورت کا خیال نہ رکھ سکی۔'' ذیشان اور اس کے بابا دونوں کو ہی کال کر کے صورت حال بتانے کے بعد ان کا سیل فون انہیں واپس کرتیں وہ ممنون و مشکور سی کہہ رہی تھیں۔ عبدل ماجد رواداری سے مسکرا دیے۔

''آپ کی والدہ ہیں ہاسپٹلائزڈ؟''

سیل فون کوٹ کی جیب میں رکھتے وہ سوال کر رہے تھے۔

''نہیں میری ساس ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں میرا بیٹا اور شوہر پہنچ جائیں گے۔ آپ کا بہت شکریہ'' وہ پھر سے مشکور ہوئیں۔

''مجھے شرمندہ کیوں کر رہی ہیں بہن! آپ۔ اتنا بڑا احسان تو نہیں کیا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عیادت کر لوں آپ کی ساس صاحبہ کی؟ دراصل میری زوجہ یہیں زیر علاج ہیں۔ میں انہی کے ساتھ ہوں ادھر۔''

وہ نرمی سے بتا رہے تھے۔ امی خفیف سی ہو گئیں۔

''کیوں نہیں بھائی صاحب! ضرور میں بھی بھابھی کی طبیعت پوچھ لوں گی۔ بس ذرا ذیشان کے بابا آجائیں۔ ویسے بھابھی صاحبہ کو ہوا کیا ہے؟''

''بظاہر تو کوئی بھی مرض نہیں ہے۔ سوائے مایوسی کے اور اس سے بڑھ کر کوئی علاج لا دوا بھی نہیں۔''

وہ دل گرفتہ اور مضطرب نظر آنے لگے۔ انہوں نے حیرانی سے اس مالدار سو بر مگر بے حد عاجز نظر آنے والے شاندار آدمی کو دیکھا تھا۔

''معذرت خواہ ہوں۔ میں سمجھی نہیں آپ کی بات کا مطلب۔''

وہ دوائیں لانا بھی بھول گئی تھیں۔

''بہت سال ہوئے ہمارا اکلوتا بیٹا حادثاتی طور پر بچھڑ گیا تھا ہم سے۔ تمام امیدوں کا مرکز وجود ٹوٹا تو زندگی جینے کی کوئی آس نہیں رہی۔ وہ اس مایوسی کا شکار ہیں۔''

ان کا مدہم لہجہ اس پل بہت شکستہ ہو رہا تھا۔ وہ جیسے کہیں پاتال میں گرتی چلی گئیں۔ بیٹی تو ان کی بھی حادثاتی طور پر ہی بچھڑی تھی ان سے۔ مگر پھر خدا کا کرم ہوا تھا۔ ان کی خواہش اور دعا کے بغیر معجزہ ہوا اور وہ واپس بھی مل گئی۔ جسے خود انہوں نے ٹھکرا دیا۔ جھٹلا دیا۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے؟ وہ بھی اک ماں؟ اس سوال کا جواب ہی نہ ملتا تھا۔ مائیں ایسا تو نہیں کرتیں جو انہوں نے کیا تھا۔ مائیں تو بے بس ہوتیں ہیں۔ جیسے ابھی اس ماں کی داستان الم سنی تھی انہوں نے۔ مائیں تو دادی جیسی ہوتی ہیں۔ جوان سے ان کا مجرمانہ ظلم سن کر چپ چاپ گھلتی جا رہی تھیں۔ اس زیادتی کا ازالہ نہ ہو سکنے کے دکھ میں۔

☆......☆......☆

جو میری آنکھوں پہ مرتا تھا
میری باتوں پہ ہنستا تھا
نہ جانے شخص تھا کیسا
مجھے کھونے سے ڈرتا تھا
وہ جب بھی بات کرتا تھا
یہی ہر بار کہتا تھا
تم مجھ سے پیار کرتے ہو
میں جب بھی روٹھ جاتی تو
وہ ایسے تڑپا جاتا تھا
مجھے یہی وہ کہتا تھا
اگر میں بھول جاؤں تو
اگر میں روٹھ جاؤں تو
کبھی واپس نہ آؤں تو
بھلا پاؤ گے سب کچھ کیا؟
یونہی جیتے رہو گے کیا؟
یونہی سجتے رہو گے کیا؟
یہی باتیں تھیں بس اس کی

یہی یادیں تھیں بس اس کی
مجھے معلوم ہے بس اتنا
مجھے وہ پیار کرتا تھا
مجھے کھونے سے ڈرتا تھا

وہ سارے حوصلے اور ہمتیں مستقیم کے رویے کی بے اعتنائی کی ایک ٹھوکر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھری تھیں۔ کچھ اس طرح کہ وہ خود کو سنبھال نہیں سکی تھی اور بستر سے نہیں اُٹھ سکی۔ کچھ اتنے دنوں کی بھوکے رہنے کی نقاہت۔ باقی اس کی بے اعتنائی ہی کافی تھی اسے مار ڈالنے کے لیے۔ اس کی آنکھیں اس وقت بھی خاموشی سے بہہ رہی تھیں جب خلیفہ مستقیم کسی کام سے اندر آیا تھا۔ اس پر نگاہ اُٹھی تو چند ثانیوں کو جیسے اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

وہ خود کو اس کے پاس آنے سے روک نہیں سکا۔ آواز اور چہرے پر عجیب سی بے چارگی کا احساس تھا۔ کچھ کہے بغیر دیا کی سسکیاں ہچکیوں میں بدلنے لگیں۔ مستقیم بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس کے پاس آ کر بیڈ کی پٹی سے ٹک گیا۔

"طے کر رکھا ہے ناں کہ مجھ سے مخالف چلنا ہے۔ اتنی ضدی کیوں ہو تم؟" وہ اب بھی نہیں کچھ بولی۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو گویا بیتی بسری کہانی یاد کراتے تھے۔

جو پکارتا تھا ہر گھڑی
جو جوڑتا تھا لڑی لڑی
کوئی ایسا شخص اگر کبھی
مجھے بھول جائے تو کیا کروں

وہ اس کی جانب سے رخ پھیر کر گھٹ گھٹ کے رونے لگی۔ مستقیم ہونٹ بھینچے جیسے بیٹھا تھا۔ ویسے ہی اُٹھ کر چلا گیا۔ دیا کے بہتے آنسو منجمد ہونے لگے۔ اس نے جانا تھا۔ شاید اب مستقیم کو اس کی بالکل بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہ احساس بہت روہانسا کر دینے والا تھا۔ بہت گہرائی تک خالی کر دینے والا۔ مار ڈالنے کو کافی۔

☆.....☆.....☆

میرا محسن وفا کا یوں صلہ مانگتا ہے

جیسے سورج کی جگنو سے ضیا مانگتا ہے
میرے بے نور خیالوں کو اجالا دے کر
وہ میرے کچے گھروندوں کا دیا مانگتا ہے
مانند دل جسے سینے میں دھڑکتا پاؤں
جانے کیوں مجھ سے بچھڑنے کی دعا مانگتا ہے
ازل سے جس کو محبت کا پیمبر جانا
وہ میری بے لوث محبت سے پناہ مانگتا ہے
وہ جانتا تھا محبت کے سبھی اوقاف رموز
پھر بھی اس کھیل میں مجھ سے نفع مانگتا ہے

اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ مگر وہ خلیفہ سے کچھ کہنے میں متامل تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی اب کیا ہوگا۔ کیا وہ اسے ہاسپٹل لے جا سکتا تھا یا پھر یہیں کسی لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کرتا۔ اس کے اندر بغاوت سر اٹھا رہی تھی۔ ایسی بغاوت جو اس کے ساتھ ساتھ مستقیم کو بھی برباد کر دے۔ ایسا پچھتاوا جو عمر بھر ساتھ رہے۔ وہ اس کے بیٹے کو اپنے جیسا بنانا چاہتا تھا۔ یعنی ڈاکو، لٹیرا، غاصب، چور۔

یہی نہیں چاہتی تھی وہ اپنے ساتھ وہ اس بچے کو بھی مار ڈالے گی۔ مستقیم کی بدعہدی بے وفائی کی اسے اس سے بڑھ کر کیا سزا مل سکتی تھی۔ دکھ اور مایوسی نے اسے جنونی بنا ڈالا تھا۔ اس کے پہلو میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں جنہیں خود پہ ضبط کرتی وہ برداشت کر رہی تھی مگر اس کی یہ ہیجانی کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی۔ اس نے اپنے آس پاس مخصوص ہلچل اور افراتفری سی محسوس کی۔ اسے سمجھنے میں بوجھنے میں قطعی دشواری نہیں ہوئی۔ ٹھکانا بدل لینے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ لوگ اس ارادے سے نکلنے والے تھے۔ خود خلیفہ بھی۔ یعنی ایسی کیفیت میں جبکہ اسے دیا کی طبیعت خرابی کا بھی علم نہیں تھا اس کا یہاں سے کئی گھنٹوں کے لیے غائب ہو جانے کا خیال بہت ہی سنسنی خیز خوف میں مبتلا کر دینے والا تھا۔ دیا کو اپنی کچھ لمحوں قبل کی شدید سوچ یکسر بھول گئی۔

"خلیفہ.....!!!"

وہ بہت عجلت میں اندر آیا تھا اپنے ہی کسی کام سے جب دیا نے بے ساختہ اسے پکارا۔ وہ رکا تھا مگر پلٹ کر اسے نہیں دیکھا اور آگے بڑھ کر الماری کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

اس کی آواز خدشات، خوف اور تکلیف کی شدت سے کانپتی تھی۔

"جب ایک بات کا پتا ہے تو پھر بے کار سوالوں کا مقصد؟"

خلیفہ پہلے ہی چڑا بیٹھا تھا۔ اسی لحاظ سے اوندھا جواب دیا۔ دیا نے برا نہیں منایا۔ آگے بڑھ کر اس کے قریب آ گئی۔

"جہاں بھی جا رہے ہیں مستقیم! مت جایئے۔ میری...... طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اس کی آواز ہی نہیں کانپتی تھی۔ وہ خود بھی لرز رہی تھی۔ اس کا زرد ہوا چہرہ ہر لحہ پسینوں میں ڈوب رہا تھا۔ مستقیم اسے دیکھتے ہوئے چونک کر رہ گیا۔

"تم......تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟"

اس کے لہجے میں انداز میں جھنجلاہٹ اتر آئی۔ دیا نے جواب نہیں دیا۔ ہونٹ کاٹتی رہی وہ سمی رہی۔

"رکو ذرا...... آتا ہوں میں۔"

وہ تیزی سے پلٹا تھا جب دیا گھبراہٹ زدہ انداز میں اس کے بازو سے لپٹ گئی تھی۔

"مجھے چھوڑ کے مت جائیں مستقیم! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

وہ جیسے بلکی تھی۔ مستقیم اسی لحاظ سے جھلا گیا۔

"پاگل ہو دیا! چھوڑو مجھے۔"

وہ اس پر برسا تھا۔ پھر پوری قوت سے وہیں کھڑا کھڑا دھاڑا۔

"شائلہ...... شائل!!!"

دیا کھڑے سے لڑکھڑا کر نیچے بیٹھ گئی۔ مستقیم فطری طور پر اضطراب کا شکار ہوا تھا۔

"دیا! سنبھالو خود کو۔ شائل ہے نا، وہ لیڈی ہیلتھ ورکر رہ چکی ہے۔ یہ اس کے لیے مشکل کام نہیں ہوگا۔"

وہ لمبے لمبے سانس بھر رہی تھی جب مستقیم نے اس کا پسینوں میں بھیگتا چہرہ تھپتھپا کر تسلی سے نوازا تھا۔ یہی وہ لحہ تھا۔ جب امانت کے ساتھ شائل نے بھی اندر قدم رکھا تھا اور دیا کے اوپر محض ایک نگاہ ڈال کر ہی وہ صورت حال کو سمجھ کر جیسے مسکرانے لگی تھی۔

"اس کا مطلب تمہارا بچہ بالآخر آ رہا ہے دنیا میں۔"

اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تلخی اور چبھن کے ساتھ رقابت کا بھی احساس تھا۔ جسے ظاہر

مستقیم نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"تم اسے ہینڈل کر سکتی ہو شائل یا......؟"

"کیسی باتیں کرتے ہوئے خلیفہ مستقیم! بے فکر ہو کر جاؤ۔ واپسی پر خوشخبری تمہاری منتظر ہوگی۔

اس کی آنکھوں میں اک عجیب سی چمک اتر آئی۔ ایسی جیسے اپنا شکار جال میں پھنستا دیکھ کر کسی درندے کی آنکھوں میں اتر آیا کرتی ہے۔ دیا کی یونہی بے قراری نگاہ اس پر جا پڑی تھی جو وحشت بھرا خوف سمیٹ لائی۔ اس نے بے اختیار خلیفہ کا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھ میں دبوچا تھا۔

"مم...... مجھے ہاسپٹل لے جائیں مستقیم!"

"دماغ ٹھیک ہے؟ جو حالت ہے تمہاری اور جتنا دور ہے ہاسپٹل راستے میں ہی جان ہار دوگی۔"

شائل نے بلا دریغ اسے جھاڑ پلائی تھی۔ دیا کی سانسیں ڈوبنے سی لگیں۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں خلیفہ مستقیم کو دیکھا تھا۔ جو امانت کے اشارہ کرنے پر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"پلیز خلیفہ! مجھے چھوڑ کر مت جائیں پلیز!"

وہ کچھ اس شدت سے ایسی بے قراری سے روئی کہ مستقیم بے چین ہونے لگا تھا۔

"تم جاؤ خلیفہ! اسے میں سنبھال لوں گی۔"

شائل نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے خلیفہ کا ہاتھ چھڑوایا۔ جسے وہ چھوڑنے پہ آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔

"میں مر جاؤں گی خلیفہ! مجھے ڈر لگ رہا ہے پلیز مجھے اکیلا نہ چھوڑیں۔"

آنسو، آہیں، سسکیاں، خلیفہ کا مضبوط دل سینے کے اندر ڈولنے لگا۔

"یہ ہمارا پہلا مشن ہے خلیفہ! اور اسی قدر اہم بھی اور میں ہرگز بھی اسے کسی جذبات کی نذر ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

امانت کا موڈ آف ہونے لگا تھا اسے متامل و متذبذب دیکھ کے، خلیفہ کا چہرہ اچھا خاصا پھیکا پڑا۔ اب وہ نہیں تھا سربراہ، امانت تھا اور خلیفہ اس کے حکم کا پابند بھی

"تم چلو۔ آتا ہوں میں پانچ منٹ میں۔"

وہ امانت سے نظریں چار کیے بنا بولا تھا۔ دیا کی سانسیں اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے حلق سے امڈتی چیخیں دباتی تھی۔

"دیا!!! تھوڑی دیر کی بات ہے میری جان! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حوصلہ کرو۔"

وہ اس کا گال بہت نرمی اور رسان سے تھپک رہا تھا۔ اور امید اس کے ہاتھ میں پکڑا رہا تھا۔ دیا نے ڈوبتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور نقاہت بھرے انداز میں سر ایک جانب ڈال دیا۔

"میں مر رہی ہوں مستقیم! اگر میں مر گئی تو......"

خلیفہ!!! تم آتے کیوں نہیں ہو؟"

باہر سے امانت کی دھاڑ ابھری تھی جس نے دیا کی آواز کو دبا لیا تھا۔

"اللہ سب بہتر کرے گا۔ بس ہمت سے کام لینا۔ پھر ملیں گے۔ فی امان اللہ! وہ اس کا ہاتھ دبا کر پھر اسے چومتا ہوا پلٹ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ دیا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یوں جیسے یقین نہ آتا ہو وہ ایسی بے بسی کی کیفیت میں چھوڑ کے جا سکتا ہے۔ اس کے چہرے پر ہیجان سا در آیا۔ درندوں کی بستی میں اپنے تنہا رہ جانے کے وحشت انگیز خیال کے باعث۔ شمائل اسے اپنی جانب آتی نظر آئی تو اس پہ موت کی غشی طاری ہونے لگی۔ اسے وہ مسیحا نہیں موت کا فرشتہ لگی تھی۔ جو جان لے کر ہی ٹلتا ہے۔ وہ اس کی نفرت، اس کی کدورت اور رقابت محسوس کر چکی تھی۔ اسے لگا تھا اس بے رحم سفاک عورت کو کھل کر کھیلنے کا موقع میسر آ گیا ہو۔

☆......☆......☆

ہوائیں مجھ سے تو کہہ گئی ہیں تیری اداسی کا حال سارا
عذاب بن کے ہے تم پہ گزرا میری طرح سے یہ سال سارا
یہ آئینے کی دکان سجا کر تم اس نگر میں تو آ گئے ہو
یہ پتھروں سے بنے ہیں چہرے بکھیر ڈالیں نہ مال سارا
مقدروں کا یہ کھیل دیکھو برس رہی ہے وہ سنگ بن کر
ہمی نے بخشا تھا جس زباں کو یہ گفتگو کا کمال سارا
بتاؤ ساگر یہ کیا ہوا ہے۔ یہ کس نے چھینا ہے روپ تیرا
تھا آئینوں کو بھی رشک جس پر کہاں گیا وہ جمال تیرا

وہ اضطراب میں بار بار پہلو بدلتا تھا اور ہر لمحہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے اک نظر پلٹ کر دیا کو بھی دیکھ لیتا۔ جو بالکل ساکن تھی۔ لانبی پلکیں ایسے گالوں پر گری پڑی تھیں جیسے کبھی نہ پھر اٹھنے کا پختہ عزم کر بیٹھی ہوں۔ مستقیم کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ وہ اس سے خفا ہوا تھا تو وہ جان دینے پہ تل گئی تھی۔ واقعی بہت عجیب تھی وہ۔

"یا اللہ! دیا کو کچھ نہ ہونے دینا۔ ورنہ میں کبھی خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔"

اس کا دل بھی جیسے رو پڑا تھا۔ وہاں سے وہ جس کیفیت میں نکلا تھا۔ اپنی گن وہیں بھول گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد امانت کو رکنے کا اشارہ کرتا ہوا اس کی خفگی اور بڑبڑاہٹ کی پرواہ کیے بغیر واپس اندر دوڑا تھا۔ عجیب سی بے قراری نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ یہ حقیقت تھی اگر اس کے بس میں ہوتا تو دیا کے پاس رکتا۔ ہرگز بھی نہ جاتا۔ لیکن اب بہت کچھ اس کے بس میں ہی تو نہیں رہا تھا۔ غم و غصے، مایوسی میں اٹھا ہوا ایک جذباتی قدم اسے ہی نہیں شاید اس کی نسلوں کو بھی رہن رکھوا چکا تھا۔ اسے ایک دم سے بہت سارے پچھتاوے نے آن لیا۔ اس کا دل چاہا ہر شے پر لعنت بھیجے اور دیا کو لے کر وہاں سے بھاگ جائے۔

"اللہ کے لیے...... رحم کرو مجھ پہ، میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا، میری تم سے کوئی دشمنی بھی نہیں۔ پھر کس بات کا بدلہ لے رہی ہو مجھ سے۔"

ابھی وہ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا جب اس نے دیا کی درد میں ڈوبی آنسوؤں سے بھیگی نقاہت زدہ سسکتی آواز سنی تھی۔ اسے کیا سمجھ آئی وہ اس طرح سے گڑگڑا کر کس کی منت کر سکتی ہے۔

کس بات کا بدلہ لے رہی ہوں تم سے؟ بدبخت عورت! تم سے بڑھ کر بھی کوئی غاصب ہوگا؟ خلیفہ چھینا ہے تم نے مجھ سے۔ میری محبت تھا وہ۔ تمہاری آمد سے قبل تک اگر وہ میرا نہیں تھا تو کسی اور کا بھی تو نہ تھا۔ یہ اطمینان کافی تھا میرے لیے۔ مگر تم...... تم نے قبضہ کر لیا اس پر۔ دن رات کانٹوں پر سوئی ہوں اس خیال کے ساتھ کہ وہ تم سے قریب ہوگا۔ لمحہ لمحہ زہر پیا ہے اور اس دن کا انتظار کیا ہے۔ اب رحم کروں تم پر؟"

وہ ہذیانی قہقہے لگا رہی تھی اور دروازے کے باہر خلیفہ مستقیم پتھر بنتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے دیا کی بلکتی ہوئی کرب آلود سسکیاں بھی ہوش میں نہیں لا سکیں تھیں۔

"میں ہاتھ بھی نہیں لاؤں گی تمہیں تو قتل کیسے میرے سر ہوگا تمہارا۔ تم مر جاؤ گی تو خلیفہ مستقیم کو میرا ہونے سے کون روک سکے گا؟ اندازہ کرو اگر میں اپنی حکمت عملی سے امانت سے الگ ہو جانے والے خلیفہ کو پھر سے واپس لا سکتی ہوں تو میں اگلا قدم کیسے نہیں اٹھا سکتی۔"

☆......☆......☆

آخری حصہ

وہ شیطان کی ہرکارہ بنی سماعتوں میں آگ اتار رہی تھی۔ وہ بہت ہڑبڑا کر ہوش میں آیا۔ جب اس نے دیا کی گھٹی گھٹی چیخ سنی تھی اور اس کے بعد شمائل کے وحشیانہ قہقہے، پھر خلیفہ کو یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے شمائل کی کیا درگت بنائی یا نیم بے ہوش دیا کو وہاں سے اٹھا کر کیسے واپس گیٹ تک پہنچا تھا۔

"باہر نکل جاؤ گاڑی سے امانت! ورنہ میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔"

دیا کو پچھلی سیٹ پر لٹانے کے بعد اس نے امانت کے ایک ساتھی سے جھپٹ کر رائفل چھین لی تھی اور انہیں نشانے کی زد پر لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور لہجہ و انداز مرنے مارنے پر آمادہ۔ امانت اگر معاملے کو نہیں بھی سمجھا تب بھی اس نے مصلحت کوشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی اور ساتھیوں سمیت اتر کر سائیڈ پر کھڑا ہو گیا۔ مستقیم نے رائفل پھینکی اور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اگلے لمحے گاڑی فراٹے بھر رہی تھی۔ سفر طویل تھا اور جان لیوا انتظار دیا کی جگہ۔ وہ خود کو مرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی اپنے سیاہ پر سمیٹ کر صبح کے اجالے کا استقبال کر رہی تھی اور سورج دھیرے دھیرے افق سے ابھر رہا تھا جب اس کی گاڑی ہاسپٹل کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی، اس کے بعد کی کاروائی عجلت بھری اور معمول کے مطابق تھی۔ اسے کچھ فارمز فل کرنے کو دیے گئے اور فوری پے منٹ کا تقاضا بھی کیا گیا۔

"جلدی کریں مسٹر! آپ کی مسز کی حالت شدید خطرے میں ہے۔ بہت زیادہ تاخیر ہو جانے کے باعث ان کی جان کو خطرہ ہے۔ فوری آپریشن نہ کیا گیا تو خدانخواستہ ...... پے منٹ کے نام پہ اس کے چہرے پر اضطراب پھیلتا دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ پیر کچھ اور پھیلا دیے۔

"مم مگر میرے پاس فی الحال کیش نہیں ہے مگر میں پے منٹ کروں گا۔ ایکچو لی......"

"...مسٹر مستقیم! خون کی بھی اشد ضرورت ہے۔ آپ بلڈ کا ارینج کریں۔"

مستقیم ہونقوں کی طرح سے سر اٹھائے کھڑا رہ گیا، معاً کچھ خیال آتے پر وہ باہر بھاگا تھا۔ لیب سے پتا کروانے کے باوجود خون کا انتظام نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر نے خون نہ ملنے کی صورت میں دیا کی نب سے مایوسی کا اظہار کیا تھا اور وہ رونے والا ہونے لگا تھا۔ اس کی اسی پریشانی کو دیکھتے ہوئے

ریسپشن پر موجود اسمارٹ سی نرس نے اسے اک اور ہاسپٹل کا پتا بتایا تھا تاکہ وہ وہاں سے ارینج کر سکے۔ مستقیم وہاں سے نکلا تو اسے لگتا تھا نہ سر کے اوپر آسمان ہے نہ پیروں تلے زمین۔ اگر دیا کو کچھ ہو جاتا تو اس کے لیے کل کائنات ختم ہو جاتی گویا!

بدحواسی سراسیمگی و گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ راہ چلتے لوگوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا اور جب وہ بھی بار کسی سے ٹکرایا تو جواب میں اسے اپنا نام سننے کو ملا تھا بجائے کوسنے یا معذرت کے وہ چونکا۔ ٹھٹکا اور بے ساختہ پلٹا۔

سامنے موجود باریش چہرہ اس کی آنسوؤں سے دھندلاتی آنکھوں میں غیر واضح رہا تھا۔

وہ اس لرزتی آواز کی غیر یقینی، استعجاب، اور تحیر کو بھی محسوس کرنے سے قاصر رہا تھا اور سرخوشی و سرشاری کو بھی۔

"تم مستقیم ہی ہو نا ...... ؟ میرے خلیفہ مستقیم! میرے بیٹے! میرے لخت جگر۔" اس جانب پہچان آمیز تحیر تھا۔ مستقیم کا دماغ صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف تھا۔ اسے اس پل دیا کے علاوہ سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ آسان الفاظ کے معنی تک۔ وہ آگے بڑھے تھے اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جو لرز رہے تھے۔ آنکھیں بہہ پڑی تھیں۔ غیر یقینی نے یقین کی منزل کو پایا۔ گواہی دل کی تھی۔ اگلے لمحے وہ اسے گلے لگا کر رو پڑے تھے۔

"مجھے معاف کر دو میرے بیٹے! تمہارا باپ بہت شرمندہ ہے۔"

"مجھے فوری بلڈ کی ضرورت ہے۔ ورنہ دیا مر جائے گی۔ میری دیا کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گا۔"

وہ انہیں شدت سے جھٹک کر زور سے چلایا تھا اور پھر ایک جانب کو بھاگا۔ عبدل ماجد اس کے پیچھے لپکے تھے۔

"مستقیم! میرے چاند۔ مجھے بتاؤ۔ کون دیا! کیا ہوا اسے؟ میں کروں گا خون کا انتظام۔"

انہوں نے اسے پیچھے سے زبردستی اپنے بازوؤں میں بھر کے روکا۔ وہ ان کی آخری بات کو سن کر سمجھ کر ہی تھما تھا۔

"دیا ...... ! میری بیوی ہے۔ میری زندگی۔ وہ ہاسپٹل میں ہے۔ اسے ...... او نیگیٹو خون کی ضرورت ہے، نہ ملا تو ......"

مل جائے گا میرے بچے! انشاءاللہ مل جائے گا

انہوں نے مسرت سے کانپتی آواز میں کہا تھا اور اسے لے کر ایک جانب کو لپکے۔ ان کے

قدموں میں جھنی ترنگ جیسی سرخوشی کا احساس تھا۔ مستقیم اسی قدر بدحواس، وحشت زدہ اور مضطرب سا ان کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے محسن کو پہچاننے سے قاصر رہا تھا کہ اس کے حواس ابھی تک مختل تھے۔ ورنہ اگر وہ انہیں پہچانتا تو کبھی اس طرح ان کے قدم سے قدم ملا کر نہ چل رہا ہوتا۔

☆......☆......☆

"مجھے نہیں کھانا ہے یہ کھانا۔ میں نے کہا ہے نا مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ ورنہ ایک ایک کو شوٹ کر دوں گا میں۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے۔"

اس نے بپھرے ہوئے انداز میں ٹرے اٹھا کر دیوار سے ماری تھی اور حلق کے بل چلانے لگا تھا۔ عبدل ماجد اسے ہاسپٹل لے کر جانے کی بجائے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ جہاں اک طرح سے وہ قید ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ ان کا فارم ہاؤس تھا۔ وسیع وعریض رقبے پر پھیلا ہوا سرسبز و شاداب خوب صورت فارم ہاؤس، جس کے ایک کمرے میں وہ اس وقت موجود ہذیانی کیفیت کے زیر اثر تھا۔ عبدل ماجد کو پہچان لینے کے بعد وہ ایسی ہی وحشت اور بدلحاظی کا شکار ہوا ہوا تھا۔ ہیجان اور سراسیمگی جل کر اس کے اعصاب کو شکستہ کر رہے تھے۔ اس کا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنی سگی ساتھی امانت کو بدلتے دیکھا تھا اس نے شمائل سے دھوکہ کھایا تھا۔ اس نے دیا کی ماں کا بھی روپ دیکھا تھا۔ پھر اپنے باپ پر اعتبار کیسے کر لیتا۔ جس نے ہمیشہ اسے ناقابلِ تلافی نقصان ہی پہنچایا تھا۔

"تم جاؤ ارسلان یہاں سے، اپنے بیٹے سے میں خود بات کر لوں گا۔"

تب ہی دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئے۔ خلیفہ مستقیم نے اسی بپھرے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کر ان کا گریبان پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

"تم مجھے پھر دھوکہ نہیں دے سکتے۔ میری دیا مر گئی ہو گی۔ اسے تو......"

معاً کچھ خیال آنے پہ وہ جیسے بلک پڑا تھا۔ عبدل ماجد نے اسے بے اختیار بازوؤں میں بھر کے چھوٹے بچے کی طرح سینے سے لگا لیا تھا۔

"دیا بیٹی اب بالکل ٹھیک ہے۔ تمہاری امی ہیں اس کے پاس۔ ہم دادا دادی جب کہ تم باپ بن گئے ہو ایک پیارے سے بچے کے۔"

انہوں نے اس کی آنکھیں باری باری چوم کر خوشی سے لرزیدہ آواز میں بتایا تھا۔ اس کی کسی بھی بدتمیزی کا مجال ہے جو برا مانا ہو ذرا بھی۔ مستقیم یکدم ساکن ہو کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے مسرت ابھری تھی۔ پھر شک اور آخر میں غیر یقینی۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ محض مجھے بہلانے کو۔"

وہ حقارت بھرے انداز میں پھنکارا اور انہیں دھکیل کر خود فاصلے پر ہوا۔ عبدل ماجد نرمی وحلاوت بھرے انداز میں مسکرائے تھے۔

"نہیں میرے بیٹے! تم بات کر لو دیا سے فون پر۔ پھر تو یقین کرو گے؟"

انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب ہاتھ ڈال کر اپنا سیل فون نکالا اور کچھ نمبر پش کرنے لگے۔ مستقیم تند اور متنفر نظروں سے انہیں گھورتا رہا۔ انہوں نے فون کال سے لگایا۔ پھر کچھ توقف سے رابطہ بحال ہونے پر گلا کھنکار کر بولے تھے۔

"ہاں سب ٹھیک ہے۔ آپ دیا سے بات کرائیں ذرا پلیز صالحہ۔"

وہ اس کی ماں سے مخاطب تھے۔ وہ ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

"آپ بعد میں بات کر لینا صالحہ! ابھی بالکل مناسب نہیں۔ پلیز آپ دیا بیٹی کو دو فون۔"

وہ نرمی ولجاجت سے سمجھاتے ہوئے بولے۔ مستقیم نے جبڑے بھینچے۔ وہ اس کی ماں سے بھلا ایسے بات کب کرتے تھے۔ سارا ڈرامہ۔ اونہہ۔ اس کا زہر آلود ذہن مزید زہر سمٹ کر لانے لگا۔

"دیا بیٹے آپ ٹھیک ہو اب؟ یہ......"

مستقیم نے آگے بڑھ کر سیل فون جھپٹ لیا اور نچ اسکرین کو چھو کر لاؤڈ اسپیکر آن کیا۔

"جی ابو میں ٹھیک ہوں۔ مستقیم کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

وہ دیا کی آواز تھی، مدہم اور نقاہت زدہ مگر وہ اس کی آواز کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

"دیا!!!"

اس کے حلق سے سرسراہٹ زدہ آواز نکلی۔ جو دوسری جانب دیا کی بے چینی کو قرار بخش گئی۔

"آپ ٹھیک ہیں نا مستقیم!"

وہ کتنی بے چین تھی۔ مستقیم نے ملامتی نظروں سے عبدل ماجد کو دیکھا جو زیر لب مسکرا رہے تھے۔ اس ایک لفظ نے رسان سے کہا اور اگلے لمحے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تمہاری جگہ اگر یہ احسان کسی اجنبی نے کیا ہوتا تو میں اخلاقاً اس کا تھینکس کہتا مگر۔"

"اٹس او کے مائی سن! اپنوں میں تھینکس نہیں چلتا۔"

وہ جواباً اعلیٰ ظرفی سے بولے تھے۔ مستقیم نے طیش کے عالم میں ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون دور پھینک دیا۔

"مجھے تمہاری اس چاپلوسی کی ضرورت نہیں ہے سمجھے تم؟"

وہ چیخا تھا۔ عبدل ماجد خاموش رہے۔ وہ اسی بپھرے ہوئے انداز میں آگے بڑھا اور دروازہ

کھولنے کی کوشش میں ناکام ہو کر زوردار ٹھوکر بند دروازے کو رسید کی تھی۔

"اسے کھولو۔ ورنہ میں توڑ کر پھینک دوں گا۔"

اس کے ہر انداز سے بے پناہ درشتگی چھلک رہی تھی۔ جبکہ دوسری جانب اسی قدر رسان، تحمل، رواداری اور مدافعانہ انداز تھا۔

"ہم آج شام تک ڈیڈی کو ڈسچارج کروا کے انشاء اللہ یہیں لے آئیں گے بیٹے۔"

وہ محبت سے لبریز لہجے میں بولے تو جواباً وہ آپے سے باہر ہونے لگا تھا۔

"مت کہو مجھے بیٹا! میں نہیں ہوں تمہارا کچھ بھی۔"

وہ پھر چیخا تھا۔ عبدل ماجد کی بے چارگی اور اذیت کا عالم دیکھنے والا تھا۔

اپنے بوڑھے باپ کو معاف کر دو بیٹے!

ان کا لہجہ دھیما شرمسار اور بھیگا ہوا تھا۔ جواب میں اس کی چھیدتی نظریں گویا انہیں اندر تک ادھیڑ کر رکھ گئیں۔

"مجھے یہاں کیوں بند کیا ہے؟"

"بند نہیں کیا بیٹے! آپ اپنے گھر پر ہو۔ یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے اور تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔"

"میں تو ......"

"مجھے یہ جذباتی تقریر نہیں سننی۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

خلیفہ مستقیم ان کی بات کاٹ کر بدلحاظی سے تکبر رعونت بھرے انداز میں بول پڑا تھا۔ عبدل ماجد شکست خوردہ، مایوس اور دل گرفتہ نظر آنے لگے۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتا تم پولیس کے ہتھے چڑھو۔ میں ......"

اور جواب میں خلیفہ مستقیم کے چہرے پر آگ سی دہک اٹھی تھی۔

"بہت خوب ...... مگر کب تک؟ میرا تو نصیب ہی اس ملک کے کسی محافظ کی گن سے نکلی ہوئی اندھی گولی یا پھر پھانسی کا تختہ ہے اور میرا نصیب ایسا بنانے میں سب سے زیادہ تمہارا ہی تو ہاتھ ہے انسان نما بھیڑیئے! پھر یہ اب ہمدردی کیوں؟"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گیا تھا۔ ایسا شکوہ جو انہیں بکھیر کے رکھ گیا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوا۔ اگلے لمحے وہ بے بسی سے سسک رہے تھے۔

"ہاں میں قصوروار ہوں۔ خطاکار بھی ہوں۔ تم مجھے بھلے معاف نہ کرو مگر یہاں سے مت جاؤ میرے بچے! میری سزا میں کچھ تو تخفیف کر دو اور کچھ نہیں۔ میں سکون سے مر تو سکوں گا۔ اس خیال کے ساتھ کہ میرے بیٹے نے اگر مجھے معاف نہیں بھی کیا تو اپنا حق تو قبول کر لیا۔"

وہ واقعی رو رہے تھے۔ مستقیم ہونٹ بھینچے بے مہر نظروں سے انہیں دیکھتا رہا تھا۔ ایک لفظ تسلی کا کہے بغیر، یہاں تک کہ وہ جب تھک گئے تو اٹھ کر چلے گئے۔ اس نے ان کے لڑکھڑاتے قدموں میں ویسی ہی مایوسی پائی تھی۔ جو اس وقت اس کے دل میں اتری تھی جب وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر چھوڑ کر گیا تھا۔

☆☆☆

وہ کھڑکی میں کھڑا فارم ہاؤس کے سامنے کچھ فاصلے پر بنی سنگ مرمر کی چھوٹی سی بارہ دری کو دیکھتا تھا جس میں موجود سفید سنگی تخت پر گرد کی ہلکی تہہ یہاں سے بھی نظر آتی تھی۔

دیا کل ہاسپٹل سے یہاں پہنچ گئی تھی۔ ساتھ میں امی بھی تھیں اور ننھا نومولود بھی۔ وہ بے حس بنا اسی جگہ ایستادہ رہا تھا۔ اپنے والدین کے ساتھ وہ دیا سے بھی گویا خفا ہو چکا تھا جو ان لوگوں سے اس طرح گھل مل گئی تھی، امی جس بے تابی، بے قراری سے اس کی جانب لپکی تھیں خلیفہ کے اندر وہ جوش وارفتگی مفقود رہا تھا۔

"سالوں سے بیمار تھی میں۔ مگر تمہارے ملنے کی خبر ساری بیماری لے اڑی۔ یہ بیماری ہی خوش بخت تھی جس کی بدولت میرا بیٹا مجھے مل گیا۔ اگر تمہارے ابو ہاسپٹل میں نہ آ رہے ہوتے تو بھلا کیسے ملتے تم ہمیں۔"

وہ بار بار اسے چومتی اور گلے لگاتی تھیں۔ وہ کتنی بوڑھی لگنے لگی تھیں۔ حالانکہ ان کی عمر ہرگز اتنی نہ تھی جتنی وہ ضعیف ہو چکی تھیں۔

"اب کہیں جاؤ گے تو نہیں نا خلیفہ؟"

وہ کسی خیال کے تحت خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ اور خلیفہ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے اندر وہی بے چینی، تلخی اور بے اعتنائی ماں کا چہرہ دیکھتے بکھرنے لگی تھی۔ نفرت کی کاٹ کیسے غیر محسوس انداز میں ہونے لگی۔ اسے لگا ماں کی آنکھوں کی امید اس کے قدموں کی زنجیر بن رہی ہے۔

"آیئے صالحہ! کچھ دیر آرام کریں۔"

عبدالماجد بیٹے اور بہو کو تنہائی فراہم کرنا چاہتے تھے اتنی طویل جدائی کے بعد۔

"نہیں ...... نہیں ...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں گی۔ ابھی تو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں میں نے۔"

انہوں نے مستقیم کے لمبے چوڑے وجود کو اپنے کمزور ناتواں بازوؤں میں بھرنے کی ناکام

کوشش کرتے بچوں کی سی ضد دکھائی۔ جہاں عبدالماجد، مستقیم کی متوقع ناراضگی سے خائف ہوئے۔ دیا بے حد شانت ہوتی ہوئی مسکرائے گئی تھی۔ اس کی فخریہ اور کسی حد تک جتلاتی مسکراہٹ خلیفہ مستقیم کو کچھ باور کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ہونٹ بھینچ کے نگاہ کا زاویہ بدل گیا تھا اور انہیں اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا۔ امی نے اس کے سینے میں سر چھپا لیا تھا۔

"ابو آپ رہنے دیں امی کو یہاں۔ آپ بھی بیٹھ جائیے ناں۔ اور یہ بتائیں مجھے کہ آپ نے اپنے پوتے کا کیا نام سوچا ہے؟ آپ کو پتا ہے ابو جی ہمارے خاندان میں پوتا ہو یا پوتی پہلے بچے کا نام دادا، دادی کی پسند پر ہی رکھا جاتا ہے۔"

اس کا مان بھرا۔ اپنائیت آمیز انداز کسی فرمانبردار بیٹی کی جھلک دکھاتا تھا۔ گو کہ دونوں یہ بات پہلے میں بھی محسوس کر چکے تھے۔ مگر بدگمان بیٹے کے سامنے وہ جس طرح ان کی ڈھال بن رہی تھی یہ تو اور بھی دل موہنے والا انداز تھا۔ ان کے ہونٹوں پر اترنے والی مسکان بہت عاجزانہ اور تشکرانہ تھی۔

"ہمارے بیٹے اور بیٹی کی پسند ہی ہماری پسند ہے بیٹے! نام مستقیم رکھے گا۔"

ان کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ چاہت تھی اور ایک عجیب سی تشنگی کا احساس بھی تھا۔ مستقیم کی توجہ کی تشنگی کا احساس۔ جسے دیا نے بہت شدت سے محسوس کیا۔

"انہیں تو ایزد نام پسند ہے۔ ایزد مستقیم! دیکھیں کتنا پیارا ہو گیا نام۔ ہے نا امی؟"

دیا چہکی تھی۔ امی کا چہرا چمکنے لگا۔ انہوں نے بے ساختہ اسے لپٹا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا اور بھیگی آنکھوں سے مسکرانے لگیں۔ ہوش میں آنے کے بعد جب انہوں نے اپنا تعارف مستقیم کی امی کے حوالے سے کرایا تھا۔ تو بس یہ حوالہ ہی کافی ثابت ہوا تھا دیا کے لیے ان سے محبت اور اپنائیت کے اظہار کے لیے۔ وہ سمجھ اور جان گئی تھیں کہ ان کے بیٹے کا انتخاب کتنا اعلیٰ تھا۔

"جیتی رہو بیٹی! سدا سہاگن رہو۔ اللہ ہر خوشی نصیب کرے۔ آمین۔"

وہ نہال ہوتیں دعاؤں سے نواز رہی تھیں۔ پھر اچانک مستقیم کی جانب متوجہ ہوئی تھیں اور اسی محبت سے اس کے بال سہلائے۔

"تم بھی تو کچھ بولو بیٹے! اپنے بچے کو بھی گود نہیں لیا۔ دیکھو کتنا پیارا ہے۔ ہو بہو تمہارے بچپن کی تصویر، ہے نا مستقیم کے ابا؟"

ان کی خوشی ان کے ہر انداز سے چھلک رہی تھی۔ مستقیم کے تنفر زدہ چہرے پر زہر خند پھیل گیا۔

"ان سے کیا پوچھتی ہیں۔ انہیں کیا پتا میں کیسا تھا بچپن میں۔ نہ انہوں نے کبھی اپنے پاس رکھا نہ ڈھنگ سے کبھی شکل دیکھی تھی میری۔"

وہ زور سے پھنکارا۔ بہت ہی انسلٹنگ رویہ تھا اس کا ان کے لیے۔ جہاں عبدالماجد کا چہرا پھیکا پڑا دیا بالکل فق ہو کر رہ گئی۔ اس نے بے اختیار تادیبی انداز میں مستقیم کا ہاتھ دبایا تھا۔ انداز میں التجا بھی اور خفگی بھرا بھی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بزرگوں سے ایسے بات کرتے ہیں خلیفہ مستقیم!"

وہ جیسے منمنائی تھی۔ عبدالماجد نے نرمی سے دیا کو ٹوک دیا۔

"انس او کے بیٹے! مستقیم کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔"

مستقیم کے چہرے کا تنفر بڑھا جبکہ آنکھوں کی جلن میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے وہ اٹھا تھا اور دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ امی مضطرب سی اسے جاتے دیکھتیں رہی تھیں۔

"آئی ایم ساری ابو جی۔"

دیا کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ عبدالماجد نے اٹھ کر اس کے سر پر اپنا ہاتھ ڈھارس کے انداز میں رکھا۔

"ابھی وہ بہت شاکی اور بدگمان ہے ہم سے اور میں مطمئن ہوں اس کا رویہ نارمل ہے۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ان کی اعلیٰ ظرفی کی دیا دل سے قائل ہوئی۔ بھلے یہ عمل کا ردعمل تھا۔ مگر مستقیم کے انداز میں بدتمیزی بہت تھی۔

"میں انہیں سمجھاؤں گی امی! آپ پریشان نہ ہوں۔"

اس نے امی کا ہاتھ نرمی سے دبایا تھا۔

"نہیں بیٹے! آپ اس سے کچھ مت کہنا۔ اس کا غصہ ختم ہونے کا انتظار کریں۔"

عبدالماجد نے جاتے جاتے سمجھایا تھا۔ پھر بچے کو پیار کرتے امی کے ہمراہ کمرے سے نکل گئے۔ مستقیم اس سے بھی بعد بہت بعد میں کمرے میں آیا تھا۔ دیا نے خفگی چھلکاتی نظروں سے اسے گھورا ضرور مگر کچھ کہا نہیں تھا۔

"لائٹ بند نہیں کریں۔"

وہ جیسے ہی اٹھ کر سوئچ بورڈ کے پاس گیا۔ دیا نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے فی الفور ٹوکا۔

"کیوں؟ پتا ہے نا تمہیں مجھے اندھیرے کے بغیر نیند نہیں آتی۔"

وہ جھنجلایا تھا۔ دیا نے گہرا سانس کھینچا۔

"جی پتا ہے۔ مگر آپ کے اس سپوت کو پتا نہیں ہو گا والد محترم کی شاہانہ عادات کا۔ لائٹ بند

ہوتے ہی چیخے گا۔ دیکھ لیجیے۔"

اس کی والہانہ نظروں کا مرکز کاٹ میں سویا ہوا بچہ تھا۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"آپ کو اپنے بیٹے کی خوشی نہیں ہے مستقیم!"

وہ جس پل بستر پر آیا دیانے کسی قدر رنجیدگی سے سوال کر لیا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا؟"

وہ تیوری چڑھا کر اسے گھورنے لگا۔ آج کل وہ اتنا ہی بدمزاج، سڑیل اور بے لحاظ ہو رہا تھا۔

"مجھے لگا ہے۔ خوش نظر نہیں آتے۔ مجھ سے آپ۔"

وہ سرد آہ بھر کے بولی تھی۔ مستقیم بیدردی سے ہونٹوں کو کچلنے لگا۔

"جس طرح آپ مجھے وہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔ دوبارہ آپ کو دیکھ سکوں گی۔"

وہ اس کے بازو سے لگ کر نمناک آواز میں کہنے لگی۔

"تمہیں وہاں سے نکال کر بھی میں ہی لایا تھا۔"

مستقیم نے جتلانا ضروری خیال کیا۔

"ہوں...... ہوں۔ ابو جی نے بتایا تھا۔ یہ بھی کہ آپ اپنی سدھ بدھ گنوائے ہوئے تھے میری پریشانی میں۔" وہ حجاب آمیز مسکان سے بولی تو چہرے پر جانے کس کس احساس کے تحت رنگوں کی برسات اتر آئی تھی۔ مستقیم کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لرزا۔

"آپ کے امی، ابو تو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں مستقیم!"

اس کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی۔ مستقیم ہونٹ بھینچے دوسری جانب دیکھتا رہا۔

"خلیفہ......"

دیانے بہت مان بھرے انداز میں اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ خلیفہ نے محض ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

"ابو کو بھی معاف کر دیں پلیز۔"

"شٹ اپ دیا!"

وہ یکدم چیخا۔ یوں جیسے ضبط چھلک گیا ہو۔ اس کا ہاتھ اس نے بہت غصے سے اور زور سے جھٹکا تھا۔

"مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے معلوم ہے اوکے؟ راستے مت دکھاؤ مجھے۔"

اس کے رنگ اڑے چہرے پر قہر بھری نگاہ ڈالتا ہوا وہ ایک بار پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ ضبط میں
...ے پڑی رنگت اور وحشت بھری آنکھیں اس کے اندرونی اکھاڑ بچھاڑ کی گواہ بنی ہوئی تھیں۔ وہ
...نکھوں میں اتری نمی کو پلکیں جھپک کر اندر اتار رہی تھی۔

☆......☆......☆

کچھ درد مجھے تو سہنے دے
اندر سے زندہ رہنے دے
آنکھیں بنجر ہو جائیں گی
کچھ اشک میرے تو بہنے دے

کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ ڈھیروں کشنز میں منہ دیئے اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ جھینگر کی آواز کا
...ز ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے کر کچھ مزید بوجھل اور سوگوار بنا رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی ہونٹ
...نچے۔ اور جیسے سر بھی جھٹکا۔ مگر اس احساس کو نہیں جھٹک سکا جو احساسات سے لپٹ گیا تھا۔ عبدالماجد
...ے غافل جان کر اس پر جھکنا اور والہانہ انداز میں اس کے نقوش کو چومنا۔ کیا جھوٹ تھا؟ کیا
...یب؟

ان کے اشک ندامت...... جو بیقراری سے چھلکتے تھے۔
ان کے چہرے و انداز سے عیاں وہ اضطراب جو کہیں قرار نہ پاتا تھا۔
وہ صرف اسے پا کر خوش نہیں تھے۔ وہ اسے مطمئن اور آسودہ دیکھ کر ہی پرسکون ہو سکتے تھے۔
...تیم کا دل کھنور تھا۔ وہ کھنور ہی رہنا چاہتا تھا۔ مگر عبدالماجد جیسے ٹھان چکے تھے۔ اس پتھر میں نقب
...ے۔ محبت کا چشمہ کھودنا ہے۔ عجیب دیوانی کوشش تھی۔ دیوانہ وار ہی جاری تھی۔ ہر روز ان کے
...وان پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوتے۔ اور وہ اس کی بے اعتنائی۔ لاتعلقی یہاں تک کہ دل
...ری کی پرواہ کیے بغیر برا مانے بغیر اک اک چیز اسے پیش کرتے اور جواب میں اس کی نظر اندازی
...یسے ترش انداز پر دل برا کیے بغیر کسی اگلی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے۔
اب مستقیم خود خائف ہونے لگا تھا۔ یہ سچ تھا اس نے زندگی میں اگر کسی سے محبت نہیں کی تھی تو
...ت بھی نہیں کی تھی۔ نفرت کا پرچار کرنا الگ اور اس کو عملی طور پر ثابت کرنا بالکل الگ نوعیت کے کام
...۔ جو وہ نہیں کر پا رہا تھا۔ یا پھر عبدالماجد کا رویہ اس کے ہر ہتھیار کو کند کرتا جا رہا تھا۔ وہ صحیح معنوں
...ف ہو گیا تھا۔ عبدالماجد سے بھی اور ان سے زیادہ اپنے دل میں ابھرتے ان کے لیے نرمی کے
...ت سے۔

ہونٹوں پہ ہنسی آنکھوں میں نمی
بھیگی سی ہے میرے دل کی زمیں
سب کچھ ہے حاصل آج مجھے
مٹتی ہی نہیں کیوں تیری کمی
نیندوں میں سہی، خوابوں میں سہی
بانہوں میں اپنی سو لینے دے
کچھ درد مجھے تو سہنے دے
اندر سے زندہ رہنے دے

اس کی آنکھوں کی جلن یکلخت بڑھ گئی۔ سطح پر پھیلتی نمی گویا تیزاب تھی۔ جو اسے جلا کر خاکستر کر رہی تھی اور تکلیف کی شدت...... ناقابل بیان۔ ناقابل برداشت۔

"خلیفہ...... خلیفہ!"

دیا اسے پکارتی ہوئی اندر آئی تھی۔ مستقیم نے سرعت سے اپنی بھیگی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"اٹھیں...... میرے ساتھ آئیں۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر مستقیم کو اٹھانا چاہا۔

"کہاں چلوں؟"

وہ رکھائی سے بولا اور گویا اسے گھورنے کا آغاز کیا۔

"آیئے تو۔ بہت بڑا سرپرائز ہے آپ کے لیے۔"

اس کے لہجے میں جوش و خروش تھا۔ مسرت تھی۔ مستقیم نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون سا خزانہ دریافت کرلیا ہے محترمہ!"

اس کا چڑچڑاپن ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ جس کی دیا نے خاص پرواہ کرنا ... رکھی تھی۔ اس کا زیادہ وقت امی کے ساتھ گزرتا تھا۔ یا پھر ایزد کے آگے پیچھے پھرا کرتی۔ وہ بہت ... سے روبصحت ہو رہی تھی تو اس میں امی کی محبت توجہ اور وہ خیال تھا جو خوراک سے لے کر دیکھ ... تک اس کی کرتی تھیں۔ بچے کو بھی زیادہ وہی سنبھالتی تھیں۔ دیا بھی کچھ کم مگن نہیں تھی گھر ... ابو میں ایسے میں وہ اور چڑا کرتا۔ امی کی توجہ ابو کی اپنائیت و جانثاری اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ... صرف شاکی نہیں تھا۔ دکھا ہوا اور زخم خوردہ بھی تھا۔ اسے اپنا آپ ایسے بچے کی مانند لگتا جس کا ... کھلونا ٹوٹ جائے۔ اس کا بھی وہ وقت کھو گیا تھا جس میں اس کی زندگی کا سارا سنہرا پن پوشیدہ ...

آج وہ ٹوٹا ہوا انسان تھا۔ گمراہ اور بہکا ہوا۔ اور ایسا صرف ایک شخص کی بدولت تھا۔ وہ اسے معاف کرنے پر خود کو آمادہ ہی نہ پاتا تھا۔

اب وہ جتنی بھی دلداریاں کرلیں۔ مسیحائی کرلیں یا رفوگری کرلیں۔ دکھ کم ہوتا تھا۔ نہ زخم سلتے تھے۔ اس کے خیال میں ازالہ ممکن ہی نہ تھا۔ وہ اپنے گھر اپنے ملک میں مجرم تھا۔ قیدی تھا اور اپنی نظروں سے گر چکا تھا۔ ایسے میں اللہ کے دربار میں کیا مقام تھا اس کا؟ وہ سوچتا تو اندر سے تڑخنے ٹوٹنے اور بکھرنے کے مرحلے سے گزرنے لگتا۔

"یہاں کیسے بتادوں؟ آپ چلیے نا میرے ساتھ۔"

دیا نے اس کا ہاتھ ہنوز پکڑ رکھا تھا۔ اس کے انداز میں بچوں کی سی ضد اور اشتیاق تھا۔

"محترمہ مت بھولیں۔ آپ کے سسر محترم کا قیدی ہوں یہاں۔ باہر نکلنا سختی سے منع ہے۔" اس کے ساتھ گھسیٹتا ہوا وہ طنزیہ لہجے میں جتلا رہا تھا۔ دیا نے سن کر بھی ان سنی کردی۔ اور یونہی اسے ساتھ کھینچتی ہوئی جس کمرے میں لائی اس کی تمام لائٹس آف تھیں۔ البتہ کمرا ایئر فریشنر اور گلاب کی بھینی بھینی دلفریب مہک سے بوجھل تھا۔

"ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہپی برتھ ڈے ڈیئر مستقیم! ہپی برتھ ڈے مائی سن!"

اس سے قبل کہ مستقیم کچھ بولتا عبدالماجد کی مدھم آواز گونجی تھی اور ساتھ ہی تمام لائٹس جل اٹھیں۔ مستقیم کے چہرے پر ناگواری اور حیرانی تھی۔ فینسی گلوبز اور فانوس کی چکاچوند نے اس کی آنکھیں یکدم چندھیا کر رکھ دی تھیں۔ جبھی وہ بے اختیار دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر دو قدم پیچھے ہوا۔

"مینی مینی ہپی ریٹرن آف دا ڈے مائی سن!"

عبدالماجد آگے بڑھے تھے اور اسے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ دوسری جانب امی تھیں۔ ان کے چہرے پر خوشی تھی مگر آنکھوں میں نمی کے ساتھ خوف کا احساس بھی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ یعنی وہ خائف تھیں۔ اس کی ناگواری۔ برہمی سے۔ مستقیم کی نگاہ انہی پر پڑی تھی۔ اور سارا اشتعال جیسے ہونٹوں پر آنے سے قبل ہی بے بسی کا شکار ہوتا چلا گیا۔

"کیک کاٹو مستقیم بیٹے! آجاؤ شاباش۔"

عبدالماجد نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا تھا۔ وہ اتنا ہی جزبز ہوا۔ پتا نہیں کس مٹی سے بنے تھے وہ اس کی ہر بدسلوکی کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے اور اعزاز سمجھ کر سینے پر ایسے سجاتے کہ وہ خود اپنی جگہ خفت و خجالت سے بھر جایا کرتا۔ جو جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی وہ الگ۔

"اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ سراسر فضولیات۔ میں نے تو کبھی اپنے بچپن میں بھی......"

اب کے وہ کسی طرح بھی خاموش نہیں رہ سکا اور تلخی سے کہہ گیا تھا۔ دیا نے گہرا سانس بھر کے امی اور ابو کے پھیکے پڑے چہرے دیکھے تھے اور خود میدان میں اتر ی۔

"ماضی اگر تکلیف یا اذیت کا باعث ہو تو اسے بھول جانا، فراموش کر دینا ہی عقلمندی ہے۔ معاف کرنا اعلیٰ ظرفی کے تقاضوں کو صحیح معنوں میں پورا کرتا ہے۔ وہ بھی اس صورت خلیفہ مستقیم اگر غلطی کرنے والا شرمندہ ہو۔ ایسے میں اپنے رویئے سے جتلانا کینہ پروری اور کم ظرفی کی علامت ہوتا ہے۔ آپ تو......"

"تم خاموش رہو۔ میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ سمجھی ہو تم؟"

وہ غرایا اور آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔ دیا خجالت اور سبکی سے سرخ پڑ گئی۔ کمرے کی فضا میں جان لیوا سناٹا اتر آیا تھا۔ مستقیم اسے کہنی سے پکڑ کر سائیڈ پر دھکیلتا ہوا قدم بڑھا کر عبدالماجد کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اس کی بے دید بے لحاظ گستاخ آنکھیں خشمگیں انداز میں ان پر آن جمی تھیں۔ عبدالماجد پرسکون جبکہ امی اسی قدر سہمی ہوئی نظر آنے لگیں۔

"کیا چاہتے ہیں آپ؟"

اس کی آواز میں سرد غراہٹ در آئی تھی۔ عبدالماجد خاموش رہے۔ مستقیم کی ناراضگی میں مزید اضافہ ہوا۔

"کیا مجھے آپ کو بتانا چاہیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں جو ایسی باتوں سے بہل جاؤں گا، اور یہ......"

اس نے اپنی سلگتی آنکھوں کا زاویہ ان کے چہرے سے ہٹا کر نہایت خوبصورتی سے گلاب اور موتیے سے سجے کمرے کی ڈیکوریشن پر ڈالی اور طنزیہ ہنکارا ابھرا۔

"اس سب کا کیا مطلب ہے؟"

"کوئی مطلب نہیں ہے بیٹے! ہمیں اللہ نے اتنی بڑی خوشی سے نوازا ہے۔ تم واپس ملے ہو ہمیں۔ تو تھوڑی سی خوشی کا اظہار کیا تھا بس۔"

امی سسک پڑی تھیں۔ عبدالماجد سر جھکائے کھڑے تھے۔ جیسے واقعی اس کے مجرم ہوں۔

"مت منائیں خوشیاں۔ اس لیے سمجھا کہ اب ان کا فائدہ نہیں ہے۔ گزر چکا ہے جو از دانے کا وقت۔"

بھنچے ہوئے لہجے میں وہ پھر چلایا تھا۔ اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا۔ عبدالماجد بے جان سے ہوتے وہیں بیٹھ گئے۔ امی ہاتھوں میں چہرا چھپائے سسک پڑیں۔ دیا کی جان پر بننے لگی۔

"بہت ناراض ہے وہ بہت زیادہ۔ کاش بس میں ہوتا میرے۔ جان دے کر بھی منا لیتی اسے۔"

امی کی آہ و بکا دیا کا دل گویا بھینچنے لگی۔ کچھ کہے بغیر اس نے ان کا لرزتا کانپتا ہوا وجود اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

☆......☆......☆

اسے یہ کون سمجھائے
وہ دشت خامشی کے سوکھے سمندر کی
ادھوری پیاس کی باتیں
بہت چپ چاپ سنتا ہے
بہت خاموش رہتا ہے
اسے یہ کون سمجھائے
خوشی کے ایک آنسو سے
سمندر بھر بھی جاتا ہے
بہت خاموش رہنے سے
تعلق مر بھی جاتا ہے

اسے دیکھتی دیا کی نظروں میں موجود یاسیت کا احساس گہرا ہونے لگا۔ سرد آہ بھر کے وہ قدم بڑھاتی اس کے نزدیک آ گئی۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا آنکھوں پر دھرا بازو ہٹایا۔ بڑھی ہوئی شیو۔ رتجگوں کی مظہر بے خواب دہکتی ہوئی آنکھیں۔ ستا ہوا چہرا۔ وہ اسے خاصا قابل رحم لگا تھا۔

"تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ تم جا کے اپنے ساس سسر کا خیال رکھو۔ ان کی خدمتیں کرو۔ مجھ سے تو تمہارا تعلق واسطہ ہی نہیں ہے اب کوئی۔"

اس کا انداز نروٹھا تھا۔ دیا کو اس بچگانہ انداز پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"امی کو آپ کا خیال ہے۔ کہہ رہی تھیں۔ آپ کے پاس جاؤں۔"

وہ مسکراہٹ دبا کر گویا ہوئی۔ مستقیم نے اسے تیکھی نظروں سے گھورا۔ نچلا لب دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں ہلکان وہ گلابی سے سرخ پڑ رہی تھی۔ یہاں آنے کے بعد کھلی آب و ہوا۔ بہترین خوراک اور ماحول کی بدولت وہ اتنی تیزی سے دوبارہ پہلے والی دیا بنی تھی کہ خود مستقیم بھی

حیران رہ گیا تھا۔ بلکہ اگر کہا جاتا کہ وہ پہلے سے بھی کئی گنا زیادہ حسین ہو گئی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ ماں بننے کے بعد اس پر حسن ونکھار جیسے ٹوٹ کر برسا تھا۔ گلابی مائل بالکل اجلی شفاف رنگت جس سے روشنیاں سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ اتنی بے داغ اور چمکدار تھی کہ ہاتھ لگنے پہ میلی ہونے کا خدشہ محسوس ہو۔ گھٹنوں تک لٹکتی موٹی سی چوٹی دراز قامت، سرتاپا حسن ودلکشی کا نازک پیکر۔ حسن وجاذبیت کے جیسے جھرنے پھوٹتے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اب تم ٹھیک ہو۔ ہے ناں؟"

وہ اس کا سرتاپا جائزہ لے چکنے کے بعد گویا ہوا تھا۔ جبکہ اس کی اس درجہ توجہ نے دیا کے رخسار شفق رنگ کر ڈالے تھے۔ جھیل جیسی آنکھوں میں حیا تیرنے لگی۔ لانبی ریشمی پلکیں عارضوں پر بچھ گئیں۔

"ہاں ٹھیک ہوں، مطمئن بھی۔ خوش تب ہوں گی مستقیم! جب آپ کے تعلقات امی، ابو سے......"

"ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دو بہتر ہوگا۔"

وہ اس کی بات کاٹ کر بربمی سے بولا تھا۔ دیا لب بھینچے اسے خفگی سے تکنے لگی۔

"مستقیم آپ......"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔ اپنی تیاری کر رکھو۔ میں بہت جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لیتا دھواں اڑاتا وہ ٹہل رہا تھا۔ دیا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے دھک سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی خوشنما آنکھوں سے آن کی آن میں خوف وخدشے جھلکنے لگے۔

"ک...... کہاں؟"

لفظ جیسے اس کے حلق میں پھنسنے لگے تھے۔ رنگت الگ پیلی پڑنے لگی۔

مستقیم نے ایک جلتی ہوئی نگاہ سے اسے نوازا تھا۔ اور ہنکارا بھرتے ہوئے اس کے پاس آن ٹھہرا۔

"جہاں بھی۔ یہ میرا ٹھکانہ نہ تھا نہ ہی ہوگا۔ سمجھی ہو تم؟"

وہ بے حد خفا سا اسے جھڑک رہا تھا۔ دیا کی فکر مندی اور اضطراب میں مزید اضافہ ہوا۔

"آپ اگر امانت اور شمائل کے پاس جانا چاہتے ہیں تو......"

وہ تیزی سے کچھ کہنے جا رہی تھی کہ مستقیم نے اس کی بات کو درشتی سے کاٹ ڈالا۔

"تو کیا...... تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی؟"

اس کے چہرے پر خطرناک قسم کے تاثرات ابھر آئے۔ جو دیا کو خوفزدہ کرنے کو کافی ثابت ہو سکتے تھے۔

"آپ ان کو نہیں جانتے۔ شمائل مجھے مارنا چاہتی تھی اور آپ......"

وہ روہانسی ہوتے کہہ رہی تھی کہ مستقیم نے بے حد قطعیت سے ہاتھ اٹھا کر اسے پھر درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"مجھے پتا ہے سب، بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بے حد رکھائی کا بڑا شاندار مظاہرہ ہوا تھا۔ دیا کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

"پھر بھی آپ......"

اس کی آواز بھی بھرا گئی۔ اس سے اب خود بات مکمل نہیں ہوئی۔ اسے بے حد دھچکا لگا تھا۔ جیسے مستقیم جانتے بوجھتے بھی اسے پھر ان سفاک لوگوں کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔

"ضروری نہیں ہے میں وہیں جاؤں۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ یہاں نہیں رہوں گا۔"

اس کا لہجہ پھر قطعی اور دوٹوک تھا۔ دیا کے آنسو گالوں پر اترنے لگے۔

"کیوں خود کو برباد کرتے ہیں مستقیم! پہلے چلیں آپ کی کوئی مجبوری تھی۔ اب ایسا کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ ابو، امی منتظر ہیں آپ کے۔ ختم کر دیں ان سے ناراضی۔ قبول کر لیں حالات کو۔ انا اور نفرت کی اس جنگ میں سب سے زیادہ نقصان آپ کی جھولی میں ہی آ کے گرا ہے۔ اس نقصان کو فائدہ میں بھی بدل سکتے ہیں آپ۔ پلیز......"

وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر نرمی سے جھنجوڑتے ہوئے گویا منت کر رہی تھی۔ مستقیم نے جواباً اسے سرد نظروں سے دیکھتے ہاتھ جھٹک دیئے اور اٹھ کر فاصلے پر ہو گیا۔

"ہاں ارادہ تو بدلا ہے میں نے اپنا۔ پہلے کچھ دنوں بعد جانے کا سوچا تھا۔ اب ابھی وقت جاؤں گا۔ اٹھو تم۔ ایزد کو لو ساتھ۔"

اس کے تاثرات میں کبیدگی اور شدید نخوت تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر اس نے بھرپور جھٹکے سے دیا کو بھی گھسیٹ کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اتنا مشتعل تھا اور ایسی نظروں سے دیا کو دیکھتا تھا جو اس کا خون خشک کر کے رکھ گئی تھیں۔ اس کے اس جارحانہ موڈ اور حرکت پر اس کے حلق سے خوفزدہ سی چیخ بھی نکلی تھی۔ جس پر مستقیم نے مطلق دھیان نہ دیا۔

"تمہیں سنا نہیں ہے؟ لے کے آؤ ایزد کو ہم ابھی اسی وقت یہاں سے چل رہے ہیں۔"

وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ دیا نے سر کو نفی میں جنبش دی تھی اور اپنا بازو بے حد غصے میں آتے اس سے چھڑوالیا۔

"تو پھر آپ بھی سن لیں۔ اگر آپ ٹھان ہی چکے ہیں کہ برائی کے راستے کو نہیں چھوڑیں گے تو میں آپ کے ساتھ نہیں چلوں گی۔ پہلے حالات اور تھے۔ میں مجبوراً نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کے ساتھ چلنے پر مجبور تھی مگر اب...... اب میں امی، ابو کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں نے کہا تھا ناں کہ میں اپنی اولاد کی خاطر کچھ بھی کر گزروں گی۔ اس لیے کہ مجھے اپنے بچے کو غلط اور ناجائز راستوں پر نہیں چلانا ہے۔"

جواباً وہ بھی بپھری گئی تھی۔ اور بغیر لحاظ رکھے اس سے بڑھ کر بلند آواز میں چیخی۔ جس کو سن کر امی اور ابو گھبرا کر بھاگے آئے تھے جبکہ مستقیم کو اس کا یہ انداز...... گویا سکتہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

"کیا کہا تم نے؟"

وہ اس سناٹے سے نکلا تو آتش فشاں لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔ ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر خود سے قریب کیا دوسرے سے کئی تھپڑ اس کے چہرے پر دے مارے تھے۔ ابو ششدر جبکہ امی بے ساختہ رو پڑی تھیں اور تڑپ کر ان کے درمیان حائل ہوئیں۔

"مستقیم...... بیٹے! چھوڑو بچی کو۔ یہ ظلم نہ کرو۔"

وہ تھر تھر کانپتی جیسے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ دیا کا چہرا لال بھبھوکا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی مگر وہ بہت مضبوطی سے اپنی جگہ پہ جمی اسے دیکھتی رہی۔

"میں نے کہا میں مزید آپ کے ساتھ ان گناہ آلود راستوں پر نہیں چل سکتی۔ سن لیا آپ نے؟"

وہ اسے گھورتے ہوئے پھنکاری۔ اس پل وہ نہ اس سے ڈری تھی نہ خائف ہوئی تھی۔ البتہ آواز بھرائی ہوئی ضرور تھی۔ مستقیم مزید مشتعل ہوا۔

"تم چلو گی میرے ساتھ۔ اس لیے کہ تم میری بیوی ہو۔ مجھ پر میرے دشمنوں کو ترجیح نہیں دے سکتی تم۔"

اس نے دانت کچکچائے تھے۔

"یہ دشمن نہیں ہیں آپ کے کیوں اللہ کے غضب کو آواز دیتے ہیں۔"

پھر وہ بے بغیر تڑخ کر کہہ گئی۔ جواباً مستقیم کا مزید ایک طمانچہ اس کے نازک گال پر نشان ثبت کر گیا۔ امی کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ انہوں نے دیا کو بیتابی سے اپنے بازوؤں میں چھپایا۔

"مستقیم بیٹے پلیز! دیا آپ چپ کرو بیٹے!"

عبدالماجد باری باری دونوں کو دیکھ کر جیسے گڑگڑائے۔ مگر ان کی سن کون رہا تھا۔

"آپ چھوڑ دیں امی مجھے۔ آج کر لینے دیں انہیں اپنے دل کی۔ مارنا چاہتے ہیں آپ مجھے؟ مار دیں۔"

دیا بپھری ہوئی موج کی طرح بے کل کر امی کے بازوؤں سے نکلی اور مستقیم کے سامنے آ گئی۔ اس کی غیض سے بھری آنکھیں مزید قہر سمیٹ لائیں۔

"ایزد کو لو اور میرے ساتھ چلو۔"

مستقیم نے اسے گھورتے ہوئے اپنا مطالبہ دہرایا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ میں کہہ چکی ہوں۔ اس گستاخی پر شوٹ کر دیں گے مجھے؟ کریں۔"

وہ بھی آج سرتاپا قہر تھی۔ مستقیم کی آنکھوں سے جیسے لہو ٹپکنے لگا۔

"میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی۔ یاد رکھنا بچہ پھر بھی میں ہی ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ہار تمہارا ہی مقدر بنے گی۔ بولو چل رہی ہو میرے ساتھ۔"

امی دھک سے رہ گئیں۔ دیا کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ ابو نے بے اختیار دل تھام لیا۔

ان کا چہرا لمحے کے ہزارویں حصے میں پسینوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ انہیں لگا۔ وقت دس سال پیچھے چلا گیا ہے۔ ان کی جگہ یہ مستقیم کھڑا تھا۔ ایک بار پھر ایک قیامت ٹوٹنے کو تھی اور اک گھر بربادی کے آخری مرحلے پہ۔ کتنے دل تباہ ہونے تھے۔ انہیں لگا ان کا دل دھڑکنے سے انکار کر دے گا۔ جبھی وہ مزید کھڑے نہیں رہ سکے۔

"چپ کیوں ہو؟ یعنی منظور نہیں میرا مطالبہ؟ تو ٹھیک ہے پھر۔ میں تمہیں ابھی اسی وقت طلاق......"

"چپ ہو جائیں مستقیم! خدا کے واسطے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں چلوں گی آپ کے ساتھ......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ عبدالماجد کا لمبا چوڑا وجود پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہوا تھا۔ امی بے ساختہ چیخیں۔ دیا بھی سب کچھ بھول کر ان کی جانب بھاگی۔ اک افراتفری مچ گئی۔ مستقیم حق دق کھڑا رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

صورتحال لمحوں میں تبدیل ہوئی تھی۔ صورتحال لمحوں میں ہی تبدیل ہوا کرتی ہے۔ اگر کوئی تغیر آیا

چاہتا ہو۔ وہ جو کسی برائی پر تلا ہوا تھا۔ خود آزمائش میں پڑ گیا۔ عبدالماجد کو پڑنے والا دل کا شدید دورہ اس کے شدت پسندانہ رویے کا باعث تھا۔ وہ جتنا بھی شاکی تھا ان سے۔ جتنا بھی متنفر تھا۔ مگر یہ بھی نہیں چاہ سکتا تھا ان کی موت کا موجب بن جاتا۔ اضطراب اس کا دل مسلتا تھا۔ تفکر اس کی روح کو چھیل رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر ایک ایک لمحہ گراں تھا۔ امی اور دیا ہچکیوں سے روتی تھیں۔ اور اس کا فولادی وجود اشکوں کی اس برسات میں مائع بنتا جا رہا تھا۔

عبدالماجد آپریشن روم میں تھے۔ خطرے کی لال بتی مسلسل اسپارک کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جلن ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ پلٹ گیا۔ اس کے اٹھتے ہوئے ہر قدم میں اضمحلال اور اضطرار تھا۔ وضو کرنے کے بعد وہ قریبی مسجد آ گیا۔ مشکل میں اسے بھی خدا ہی یاد آیا تھا۔ ویسے ہی جیسے ہر مسلمان کو یاد آیا کرتا ہے۔ دو رکعت نماز حاجت پڑھنے کے بعد اس نے دعائے حاجت پڑھی تھی اور ہاتھ پھیلا دیئے۔ الفاظ کی جگہ حاجت روائی کو اشک رواں ہو گئے تھے۔

"انہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے میرے اللہ! اگر انہیں کچھ ہوا تو میں شاید کبھی تیری جانب نہ پلٹ سکوں۔ تجھے تو ہر وقت اپنے ہر بندے کی واپسی کا انتظار رہتا ہے ناں۔ مجھے بھی واپس بلا لے۔ مجھے بھی اس ملال سے نجات عطا فرما۔ اس پشیمانی سے نکال لے۔ ازالے کا موقع عطا فرما۔ آمین۔

آنسو قطرہ در قطرہ بہتے تھے۔ وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ بیتابی سے سسک رہا تھا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ مگر حقیقتاً واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ کہ دل پگھل جائیں تو نفرت کا زہر دھل جاتا ہے۔

بقول شاعر

محبت جب لہو بن کر
رگوں میں سرسرائے تو
کوئی بھولا ہوا چہرا
اچانک یاد آئے تو
قدم مشکل سے اٹھتے ہوں
ارادے ڈگمگائیں تو
کوئی مدھم سے لہجے میں
تمہیں واپس بلائے تو
ٹھہر جانا سمجھ لینا
کہ اب واپس پلٹنے کے عمل آغاز ہوتا ہے

کبھی تنہائیوں کا درد
آنکھوں میں سمائے تو
کوئی کمزور لمحہ چاہتوں کا جب ستائے تو
کسی کی یاد میں رونا تمہیں بھی خوں رلائے تو
کبھی انہونیوں کا ڈر
پرندوں کو اڑائے تو
ہوا جب پیڑ سے اک زرد سا پتہ گرائے تو
ٹھہر جانا، سمجھ لینا
کہ اب واپس پلٹنے کا عمل آغاز ہوتا ہے

وہ بھی واپس پلٹ آیا تھا۔ محبتوں کی طرف۔ اچھائی سچائی اور حق کی طرف اور دعا کرتا تھا۔ بہت عاجزی سے

"بے شک ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر۔ نہ پھیرنا ہمارے دلوں کو۔ بعد اس کے جب کہ تو نے ہمیں ہدایت دی۔ ورنہ ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

وہ یہ گزارش اللہ کے حضور پہنچا رہا تھا۔ اسے اب ساری عمر یہ گزارش باقاعدگی سے اللہ کے حضور پہنچاتے رہنا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے گہرا سانس بھرا اور عبدالماجد کے چہرے سے نگاہ ہٹالی۔ وہ دونوں کے زیراثر غنودگی میں تھے۔ سر اس کی گود میں جبکہ ہاتھ یوں تھام رکھا تھا جیسے اس کے کہیں بھاگ جانے کا خدشہ دل میں لاحق ہو۔ وہ نہیں چاہتے تھے مستقیم ہاسپٹل میں ان کے پاس رکے انہیں اس کی جانب سے بہت سے خدشات لاحق تھے۔ جبکہ مستقیم چاہنے کے باوجود انہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پوری طرح ٹھیک نہ ہونے کے باوجود ضد کر کے ڈسچارج ہو گئے تھے اور اب واپس گھر کی جانب ہی ان کی گاڑی رواں دواں تھی۔ دیا اور امی کو اس نے آج ہاسپٹل آنے سے اسی لیے منع کر دیا تھا۔ اس نے گاڑی سے باہر کے منظر پر نگاہ ڈالی تھی۔ سامنے بسوں اور ویگنوں کا اڈا تھا۔ بے تحاشہ ٹریفک، بے شمار لوگ اور پلازہ کے اطراف بنی رنگ برنگی چیزوں کی دکانیں۔ نیلی وردی میں ٹریفک پولیس کے سارجنٹ بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتے تھے۔

انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد بھی اس کا نام پکارا تھا۔ شعور و لاشعور ہر جگہ وہی چھا گیا تھا

گویا وہ ڈاکٹرز کے بھی پکارنے سے پہلے لپک کران تک آیا اور جھک کران کا چہرا ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

"میں آپ کے پاس ہوں ابو! جسٹ ریلیکس۔"

اس کی آواز پر نمی اپنا غلبہ پا چکی تھی۔

"تم کہیں نہیں گئے ہو ناں؟ تم نے دیا کو طلاق بھی نہیں دی؟"

وہ ہراساں تھے۔ وہ خوفزدہ نظروں سے سوال کرتے تھے۔ یوں جیسے اک جواب بھی توقع اور مرضی کے خلاف ہوا تو جیسے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ سب کچھ نہ بھی سہی عبدالماجد ضرور۔

"نہیں ابو جی! ایسا کچھ بھی نہیں غلط ہوا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

وہ ان کے سر کو سہلانے لگا۔

"اور...... اور تم نے مجھے معاف کر دیا۔"

ان کے چہرے پر آس جگی تھی۔ ان کے چہرے پر انجانا خوف بھی سمٹ آیا۔

"میری کیا اوقات ہے کہ آپ معافی مانگیں مجھ سے۔ مجھے شرمندہ اور گناہگار نہ کریں۔"

اک لمحہ ہوتا ہے ہدایت کا۔ اگر آ جائے زندگی میں تو خوش بختوں میں شمار ہو جایا کرتا ہے۔ نہ آئے تو بے کار میں گزر جایا کرتی ہیں۔ زندگیاں وہ خوش بخت ہی تھا۔ اسے یہ لمحہ ودیعت ہوا تھا۔ عبدالماجد نے ہچکیوں سے روتے اس کے لیے دونوں بازو پھیلا دیئے وہ بھی کسی چھوٹے بچے کی طرح ایسے ان کے گلے لگا جیسے کوئی گلہ، کوئی شکوہ کوئی دوری اور کدورت درمیان میں آئی نہ تھی۔ وقت پیچھے چلا گیا تھا بہت پیچھے جب وہ محض دس سال کا "موجو" تھا۔ معصوم، ڈرپوک اور احمق سا، جسے باپ کی آغوش میں سمٹنے کی خواہش شدید تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا اور وہ سسکیاں بھرتے ہوئے شکوے کیے گیا۔

"کیسے بتاؤں آپ کو۔ آپ کی توجہ اور محبت کے لیے کتنا ترسا ہوں۔ جتنا بھی آپ سے ڈرتا تھا۔ مگر ہمیشہ آس مندانہ نظروں سے آپ کو دیکھا کرتا۔ کبھی تو آپ مجھے پیار کریں گے۔ کبھی تو آپ مجھے توجہ دیں گے۔ مگر یہ خواہش حسرت بنتی گئی۔ یہ محبت کا راستہ سراب کا راستہ تھا جس نے بالآخر مجھے نگل لیا۔"

انہوں نے اس کا سر تھپکا۔ اسے اپنے سینے میں بھینچا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔ جو آج تک اس کے لیے محسوس کیا تھا۔ مگر فی الحال اسے سننے کے متمنی تھے۔ وہ بھی جانے کس رو میں بہہ رہا تھا۔ ساری حسرتیں نکال لینے کا متمنی لگتا تھا۔

"کیسے بتاؤں آپ کو، کن راستوں پر ڈال دیا تھا آپ نے مجھے۔ جہاں نہ چاندنی کی دستک تھی۔ نہ روشنی کے قدموں کی آہٹ ابھرتی تھی۔ کیسے بتاؤں کہ میری روح کی طنابیں آپ نے کیسی بیدردی سے اکھاڑ کر پھینک دی تھیں۔ آپ کے بخشے سرد تعلق کے ان بے ثمر لمحوں نے مجھے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں میں اپنی پہچان تک بھول گیا تھا۔ مجھے جہاں یقین کاغذ کی کشتی کی طرح وسوسوں کی بارش میں بھیگ کر بار بار ٹوٹتا تھا۔ جہاں دیارِ ذات کے تاریک بام و در میں خوش امیدی کی کوئی کرن نہیں جگمگاتی تھی۔ میں انہی اندھیروں میں بھٹکتا تھا اور بھٹکتے رہنا چاہتا تھا کہ تقدیر کے تھپیڑے نے مجھے پھر آپ تک پہنچا دیا۔ آپ کی یکسر بدلی ہوئی شخصیت محبت پیار میرے قدموں میں اس محبت کی زنجیر ڈالنے لگی۔ جسے میں پہننا نہیں چاہتا تھا مگر...... اب مجھ پر انکشاف ہوا۔ میں تو کبھی آپ سے محبت ترک کر ہی نہ سکا۔ وہ نفرت، نفرت ہی نہ تھی۔ نفرت کی آڑ میں محبت تھی۔ آپ کو بھلانے کی کوشش میں آپ کی یادوں کے چراغ باقاعدگی سے روشن کرتا رہا۔ میں نے جانا میں تو آج بھی بیس سال پرانا وہی "موجو" ہوں۔ جسے اپنے سونڈ بونڈ بہت بڑے آفیسر باپ سے والہانہ عشق تھا۔ جن کی شاندار قامت باوقار سراپے کی میں بڑھ چڑھ کے اپنے دوستوں کے سامنے فخر سے تعریفیں کرتا نہیں تھکتا تھا۔ میں نے آپ کو تکلیف میں دیکھا تو جانا میری نام نہاد نفرت اس محبت کے سامنے کچھ بھی نہیں جس کی بیس پر میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکا۔ آپ کو دکھ نہیں دے سکا۔ میں نے جانا...... میں آج بھی آپ کو دکھ نہیں دے سکتا۔"

وہ خاموش ہوا اور ان کے کندھے سے اپنی بھیگی آنکھیں رگڑ کر صاف کرنے کے بعد ان سے الگ ہوا تھا۔ ان کا چہرا ہاتھوں کے پیالے میں لے کر پیار لٹاتی نظروں سے جھک کر ان کے بھیگے چہرے کو چوم لیا۔ جو خاموش آنسوؤں سے نمناک ہو چکا تھا۔

"آپ دل پر بوجھ نہ لیں ابو جی! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے اب۔ یہ تقدیر کا لکھا قسمت کا کھیل تھا۔ اب اس پر کیا الزام دیں کسی کو بھی۔"

عبدالماجد نے اس کا ہاتھ لبوں سے چھوا اور نرمی سے مسکرائے تھے۔

"یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے بیٹے! کہ تم نے میرا ہر جرم معاف کر دیا۔ ورنہ ساری کوتاہیاں اور غلطیاں تو میرے اعمال کی تھیں اور میں سمجھتا ہوں اس کی بھرپور سزا بھی پا چکا میں۔ نو سال کم نہیں ہوتے۔ میں نے نو سال کا پچھتاوے و ملال سے لبریز صبر بھگتا ہے۔ کمال ضبط کی اس اسٹیج کا کیا نام ہو سکتا ہے جس سے میں گزر رہا ہوں جس میں ضمیر ہر لمحہ کوڑے برساتا تھا اور ذرا جو دریغ کرتا ہو۔ تم تو ایسا خزانہ تھے جسے میں نے خود اپنی نااہلی کی بنا پر کھو دیا تھا۔ اور سزا یہ تھی کہ اس دنیا میں واحد تم ہی

وہ ہستی تھے۔ جس سے میں نے صحیح معنوں میں دل لگایا تھا۔

To the world you are one of many to me you are all the world.

اور سب سے بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ تم میری اس کیفیت سے بے خبر تھے۔ میری سزا میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوا جاتا تھا۔ مجھے ہر آن لگتا گویا گرم توے پر بیٹھا ہوں اور جل کر راکھ ہو رہا ہوں۔ اس پوری دنیا کی بس نہ چلتا تھا خاک چھانوں اور تمہیں ڈھونڈ لوں۔ تمہارا میں سو بنا چہرا دیکھوں تا کہ دل کو کچھ سکون مل سکے۔ کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ تم یقین کر سکتے ہو میرے بچے! تمہیں کھونے کے بعد میں نے لمحہ لمحہ تمہیں سوچا تمہیں ہی سوچا۔ مجھے تم سے زیادہ کوئی حسین نظر نہ آتا۔ تمہارا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا۔ میں راتوں کو نیندوں میں بیکل ہو کر اٹھ بیٹھتا۔ اس بیتاب خواہش کے ساتھ کہ تمہارا وہ چہرہ چوم لوں۔ جس پہ ہمہ وقت نرمی چھائی رہتی تھی۔ مجھے یاد آتا جب تم مسکراتے تھے تو چاروں طرف کیسا اجالا بکھر جایا کرتا تھا۔ میں تمہاری آواز کی بازگشت اپنی سماعتوں سے کھنگالتا اور اس آواز کے سو سو بار واری صدقے ہوا کرتا۔ وہ آواز جس میں احترام ہوتا تھا اور انوکھی عاجزی بھی، میں نے تمہاری جدائی میں ہر لمحہ سولی پر گزارا۔ میں ہر گھڑی تڑپا ہوں۔ یہ میری دعائیں تھیں جو اللہ کو مجھ پر رحم آیا اور تم لوٹا دیئے گئے۔ تم وہ نہ تھے جو میں تمہیں سوچتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے تم پہ غصہ نہ آتا۔ یہ تو میرے عمل کا ردعمل تھا۔ پھر کیسا دکھ۔ ہاں مگر مجھ سے تمہاری جدائی برداشت نہ ہو سکی تھی۔ جبھی تو دل دھڑکنے سے انکار کرنے لگا۔ میں جو تمہاری جدائی میں رب سے نزدیک ہوا تھا۔ ہر لمحہ ازالے کی التجائیں کرنے لگا۔ برسوں گزر گئے اس التجا میں۔ اس میں ایسی ہی شدت تھی کہ تم لوٹا دیئے گئے۔ میری منتظر نظروں کا انتظار ختم ہوا اور بینائی نصیب ہو گئی۔ تم سمجھ تو گئے ہو گے مستقیم میری بینائی کیا تھی؟"

وہ سوال کر رہے تھے اور وہ نوخیز لڑکے کی مانند جھینپ کر سرخ پڑ گیا تھا۔ عبدالماجد ہنوز غنودگی میں تھے۔ اس کی نظریں پھر کھڑکی سے باہر بھٹکی تھیں۔ ارد گرد شام کے سائے گہرے تھے اور سڑک کے دونوں اطراف پھیلی اونچی نیچی جھاڑیوں سے لدی پہاڑیاں اور ٹیلے۔ باہر ٹھنڈک اور سکون تھا۔ ویسا ہی اس کے اندر اتر آیا تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے انسان بہت کچھ اگر کھوتا ہے تو پانے والا بھی بنتا ہے۔ جیسے اس نے کھویا ہوا سکون کھوئی ہوئی چاہتیں اور رشتے پا لیے تھے۔ جیسے اسے دیا مل گئی تھی۔ یہ اللہ کی عنایتیں ہی تھیں۔ یعنی کسی بھی مقام پر کسی بھی مرحلے پر اللہ نے اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ بس وہی اللہ کو بھول گیا تھا۔ اس نے دل میں پھر اللہ سے اس کوتاہی کی معافی طلب کی اور دل میں دیا کا خیال آنے پہ مسکرا دیا۔ وہ یقیناً بہت خفا ہو گی اس سے۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس نے اچھا

بھی تو کردی تھی بہت۔

"میں منا لوں گا تمہیں میری جان!" وہ مسکرایا تھا۔ اور عبدالماجد کا سر نرمی سے سہلانے لگا۔ جو ہنوز نیند کے زیر اثر پرسکون نظر آ رہے تھے۔

☆......☆......☆

"یہ دیکھو...... مستقیم! کیسا سوٹ ہے؟ دیا کے لیے لائی ہوں۔ چلو نہا کر پہنے گی۔"

امی نے بے حد چمکتا دمکتا ہوا خوبصورت ترین سوٹ ڈبا کھول کر اس کے سامنے پھیلایا۔ مستقیم نے ہاتھ بڑھا کر دوپٹے کا کنارا تھاما پھر مسکراہٹ دبائی تھی۔

"ایسے تو اندازہ نہیں ہو رہا تھا امی بالکل بھی۔ آپ ذرا ان سے کہیں پہن کے دکھائیں پھر پتا چل سکے گا۔"

اس نے بالکل لاتعلق نظر آئی دیا کو نظروں کے فوکس میں لے کر گویا مطالبہ ظاہر کیا تو اس کی وجہ بھی تھی وہ اسے کتنے دنوں سے یونہی نہ صرف نظر انداز کر رہی تھی بلکہ ازالے کا کوئی موقع بھی نہیں دے رہی تھی۔ رات کو بھی ایزد کا بہانہ کر کے امی کے کمرے میں سویا کرتی اور وہ جزبز ہو کر جاتا۔

"پہن کر دکھانا تو مشکل ہے۔ ابھی میں نے درزن کو دینا ہے کہ دیا کے ناپ کا کر دے۔ ہاں دوپٹہ اوڑھ کے دکھا دو بیٹے! مجھے پورا یقین ہے میری بیٹی پر یہ رنگ بہت کھلے گا۔" امی کے لہجے میں محبت کا احساس بے حد گہرا تھا۔ اپنی فتح کے احساس پر مستقیم کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔ دیا اسی قدر جھلائی تھی۔

"ایزد ابھی سویا ہے امی! ذرا سی جنبش کی تو جاگ اٹھے گا۔ بعد میں نہ دکھا دوں آپ کو؟"

وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ بڑے میٹھے انداز میں مستقیم کی چال کو ناکامی سے دوچار کیا تھا۔ وہ سرد آہ بھر کے رہ گیا۔ امی کی وہ بالخصوص چہیتی تھی۔ جب سے انہیں مستقیم کے کارنامے کا معلوم ہوا تھا کہ کس طرح جبراً اسے اٹھایا اور پھر نکاح کیا تھا۔ بعد میں دیا کی ساری کارگزاری جان کر مستقیم کے منہ سے وہ تو دیا کی بے دام غلام اور مرید ہو گئی تھیں۔ جیسے "تو میری دعاؤں کا اجر تھی میری بچی! اللہ ہی تجھے اس نیکی اور اعلیٰ ظرفی کا انعام عطا فرمائے گا۔"

وہ بار بار آبدیدہ ہو کر کہتی رہی تھیں۔

"دے تو دیا ہے اللہ نے اجر و انعام! آپ کے بیٹے کی صورت انہیں۔ اور کیا چاہیے؟"

مستقیم ہر بار مسکرا کر ٹکڑا لگانا نہیں بھولا کرتا تھا۔

"بہت ظالم ہوتی جا رہی ہو تم۔"

ابھی کسی کام سے اٹھیں تو مستقیم کو اس سے کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ دیا نے وہی نظر اندازی کا حربہ آزمانا چاہا جسے مستقیم نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔

"ابھی تک خفا ہو؟"

وہ اس کا ہاتھ زبردستی تھام چکا تھا۔

"مجھ سے بات نہیں کریں۔ سمجھے ہیں آپ؟"

وہ آنکھیں نکال کر دھیمے لہجے میں غرائی۔ مستقیم نے سر کھجایا۔

"یعنی خفا ہو۔"

دیا نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اسے یہ خیال یہ احساس کند چھری بن کر کاٹتا تھا کہ اتنی معمولی بات پر وہ اسے طلاق دینے پر تل گیا تھا۔ یہ تھی اس کے نزدیک اس کی حیثیت کہ جب چاہا زبردستی زندگی میں شامل کر لیا۔ جب چاہا بے کار سمجھ کر نکال کر پھینک دیا۔ جبکہ جانتا بھی تھا اس کی بے بسی و لاچاری کو بھی کہ زندگی میں ایسے دوراہے پر وہی اسے لایا ہے جہاں اس کے علاوہ اور کوئی اس کا نہیں بچا ہے۔

"کمرے میں چلو۔ ابھی منا لیتا ہوں تمہیں۔"

مستقیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ وہ بدک سی گئی۔

"کیوں؟ کیوں چلوں میں؟"

اس نے بے تحاشہ غصے میں آتے ہوئے اسے گھورتے پھپھک کر پوچھا تھا۔ مستقیم اک پل کو ہونق ہونے کے بعد بے ساختہ ہنسنے لگا۔

"کیا ہو گیا ہے یار! بیوی ہو تم میری۔"

لال ہوتے چہرے کے ساتھ وہ بہ مشکل ہنسی کے درمیان جتلا کر بولا۔ گویا صفائی پیش کی اور اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا جو دیا نے فی الفور چھڑوا لیا۔

"زیادہ فرینک ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے آپ؟ جتنی اوقات تھی آپ کے نزدیک میری وہ آپ بہت اچھی طرح سے بتا چکے مجھے۔"

آن کی آن میں اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اتر آئے۔ مستقیم اس لحاظ سے بے چین و بیقرار اور مضطرب نظر آنے لگا۔

"میں معذرت کر چکا ہوں دیا! پھر سوری کر رہا ہوں۔ میری ذہنی کیفیت جتنی مخدوش تھی تب تمہیں انڈرسٹینڈ تو کرنا چاہیے نا؟"

ملتجی انداز میں وضاحت پیش کرتے وہ امید افزا نظروں سے اسے ایسے تکنے لگا جیسے معافی کا خواہاں ہو۔

"سوچا آپ نے؟ اگر خدانخواستہ اسی غصے میں آپ اس حد سے گزر جاتے پھر کیا بنتا؟ میں کہاں جاتی؟ کہاں جوگا چھوڑا تھا آپ نے مجھے؟"

وہ اس وقت کی اذیت کو پھر سے محسوس کرتی جیسے پھر خود پر ضبط کھو گئی۔ مستقیم نے بے اختیار نزدیک ہوتے اسے بازو کے حصار میں مقید کر کے اسے خود سے قریب کر لیا۔

"اللہ نے بچا لیا ہے نا۔ اللہ نے بیوی ہی مجھے اتنی سمجھدار عقلمند دی ہے۔ جو میرے ہر رنگ کو پہچانتی ہے۔ جبھی تو اسی وقت سب کچھ چھوڑ کر میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ اور ہر نقصان ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

وہ جھکا تھا اور اس کی پیشانی پر لب رکھ دیئے۔ عقیدت بھرا مہکتا ہوا انداز تھا۔ جو صحیح معنوں میں مسحور کر کے رکھ دینے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ دیا اس کے طلسم سے کیسے بچ سکتی تھی۔ اس کی ساری ناراضی جیسے اپنا اثر کھونے لگی۔

"تم خاص ہو دیا! بے حد انوکھی۔ جبھی تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہوں کہ......"

نرالی تیری چاہتیں ہیں
نرالی ہی تو محبتیں ہیں
میں تم کو جب بھی سراب بخشوں
ہمیشہ مجھ کو گلاب دو تم
ہمیشہ تم کو عذاب دوں تو
مجھے تم زندگی کی جانب کھینچ لاؤ
کہاں سے سیکھی ہے ایسی فطرت
سنہری لڑکی مجھے بتاؤ
یہ کیسی عاشق بنی ہو میری
کبھی تو کھل کے مجھے بتاؤ
نرالی تیری چاہتیں ہیں

وہ مسکرایا اور پھر جھک کر اس کا گال چومنا چاہا تھا کہ وہ کترا کر تیزی سے فاصلے پر ہو گئی۔

"شرافت کے جامے میں رہیں۔ بیڈ روم نہیں ہے یہ آپ کا۔"

وہ اچھا خاصا چڑی ہوئی تھی۔ اس کی اس بے تکلفی کے مظاہرے پر۔ مستقیم محظوظ ہو کے قہقہہ لگانے لگا۔

"حد بندیاں لگانے سے بہتر تھا تم میرے ساتھ بیڈ روم میں ہی چلتیں۔"

وہ اب پوری طرح پڑی چھوڑتا ہوا آنکھ مار کر بولا۔ دیا کے سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا تھا گویا۔

منہ دھو کے رکھیں۔ اونہہ حکم دے رہے ہیں محترم! اتنی بھی فرمانبردار نہیں ہوں میں اب آپ کی۔"

چلبلاتے ہوئے وہ جیسے اپنی خجالت مٹانے کو بولی۔ البتہ نظریں اس سے چار نہیں کیں کہ اس کی نگاہوں کے گستاخ تقاضوں کی تاب لانے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔

"فرمانبردار تو تم ہو میری۔ پر اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ سن لو۔ اگر آج شرافت سے نہیں آئیں تو امی ابو کا خیال کیے بغیر اٹھا کر لے جانے سے گریز نہ کروں گا بعد کی ناراضی کی پرواہ بھی کچھ خاص نہیں ہوگی مجھے۔"

اس بیانگ دہل دعوے پر دیا کا چہرا بھاپ چھوڑنے لگا۔ لانبی پلکیں حیا سے بوجھل ہو کر لرزنے لگیں۔ مستقیم کو وہ نظریں چراتی جھینپی شرماتی اتنی اچھی لگی کہ خود کو کسی گستاخی سے باز نہیں رکھ سکا۔ دیا کی سراسیمگی، حجاب اور ہراسگی کا عالم بھی کیا خوب دیکھنے والا تھا۔ جسے نگاہوں کی زد پر رکھے وہ ہنسے جا رہا تھا اور دیا راہ فرار پر مجبور ہو کر وہاں سے بھاگی تھی۔

☆......☆......☆

"یہ بھلا کیا بات ہوئی ابو جی! آپ مجھے اتنی دور اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے کیوں بھیج رہے ہیں آخر؟"

آج ہی دیا چلہ نہائی تھی۔ امی نے اس موقع پر قرآن خوانی اور محفل نعت کا بھی اہتمام کر لیا تھا۔ دور و نزدیک کی سب جاننے والی خواتین بلوائی گئی تھیں۔ دیا کی سج دھج بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ امی نے جانے کون کون سے ارمان نکالتے ہوئے اسے صحیح معنوں میں دلہن بنا کے دم لیا تھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھی تیاری کو آخری اور فائنل ٹچ دے رہی تھی۔ جبکہ مستقیم بستر پر نیم دراز اس میں گویا پوری طرح گم مبہوت بیٹھا تھا معاً وہ ایک دم اپنی جگہ سے اچھلی۔

"کیا ہوا؟"

مستقیم اسی کی جانب متوجہ تھا۔ بری طرح حیران ہوا۔

"اینڈ امی کے پاس ہے اور میلاد کے لیے خواتین پہنچنا بھی شروع ہو گئیں۔ میری ابھی تک تیاری مکمل نہیں ہوئی۔ اوپر سے آپ بھی کم نہیں ہیں بوکھلانے کو۔"

وہ جھنجھلاہٹ میں اسی پر الٹ پڑی۔ مستقیم کو جھٹکا لگ کر رہ گیا۔

"ہائیں...... میں نے کیا کیا؟ اتنے فٹ کے فاصلے سے یار؟"

وہ تڑپ اٹھا تھا اس سراسر کے الزام پر۔

"ایسے دیکھیں گے تو ڈھنگ سے کہاں کچھ کر پاؤں گی۔ ہاتھ بہک جاتے ہیں۔ جائیے باہر۔ ابو جی کے پاس۔" وہ سخت چڑی۔ اور کوفت سے اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ساتھ ساتھ ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کو کھول کھول کر مختلف زیور کے ڈبے نکال کر رکھ رہی تھی۔ مستقیم سخت خفا ہوتا اٹھ کر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"نگاہیں چار نہیں کر رہیں مجھ سے۔ پھر ہاتھ کیسے بہکتے ہیں تمہارے؟ بالکل جھوٹی ہو تم۔"

اس نے بھی جیسے شکوہ کیا۔ دیا کا چہرا دہک گیا۔

"نگاہیں نہ بھی ملاؤں۔ آپ کی نظریں تو اپنا کام دکھا جاتی ہیں ناں۔"

وہ جل کر بولی تھی اور جھکنے کے باعث آگے ڈھلک آنے والے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے گرایا جو مستقیم کے بازو سے ٹکرا کر دیا کی کمر پہ جھولنے لگے۔

"اچھا...... واہ! اتنا سمجھتی ہو تم نگاہوں کی زبان؟ مجھے تو ابھی پتا چلا۔"

اب کے وہ صاف اس پر طنز کر رہا تھا۔ پھر جھک کر اس کے بالوں کی لمبی لٹ ہاتھ میں پکڑ کر اٹھائی اور سونگھ کر لمبی سانس بھری۔

تیرے بھیگے بدن کی خوشبو سے لہریں بھی ہوئیں سہانی سی......

اس نے مسکراہٹ دبا کر بے حد شوخ و شنگ انداز میں تان اڑائی تھی۔ دیا کا رنگ دہک دہک گیا۔ پلکیں بار حیا سے لرز کر جھکیں مگر بظاہر جھنجھلائی اور اپنے بال چھڑائے۔

"اف اللہ! چھوڑیں۔ جائیں نا۔"

اسے مزید شرارت پر آمادہ پا کر اس نے بوکھلاتے ہوئے اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے زور سے پیچھے دھکیلا اور اسے بیڈ پر بٹھا کر سیدھی ہوئی۔

"خبردار آپ یہاں سے ہلے تو۔"

وہ اس کی آنکھوں کے آگے مسکارا لہرا کر سختی سے تنبیہ کر رہی تھی۔

"اف...... ظالم بیوی۔"

وہ جھوٹ موٹ کا سہما۔ مگر پھر شرارت پر اتر آیا اور اس کا دامن پکڑ کر منچلے انداز میں کھینچا۔

نگاہوں سے قتل کر دو نہ ہو تکلیف دونوں کو
تمہیں خنجر اٹھانے کی ، ہمیں گردن جھکانے کی

دیا نے ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ ضبط کی۔ پھر جیسے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"خلیفہ مستقیم! آپ چلے جائیں یہاں سے۔ قسم سے نہیں ہوگی ایسے مجھ سے تیاری۔ نیچے امی اکیلی سب کچھ ہینڈل کر رہی ہیں۔ کچھ تو خیال کریں۔"

لجاجت سے کہتے اس نے اپنی مجبوری و بے بسی بتائی۔ مستقیم نے گہرا طویل سانس بھرا اور کہنی کے بل تسلی سے نیم دراز ہو گیا۔

"چلو کیا یاد کرو گی۔ نہیں تنگ کرتا۔ کرو اپنا کام۔"

دیا سرد آہ بھر کے عجلت میں بالوں کو سمیٹنے لگی۔ اس کے بعد زیورات کے ڈبے کھولے تھے اور ایک سیٹ منتخب کیا اور جلدی جلدی گلے میں نیکلس سجاتے ہوئے خیال آنے پر اسے مخاطب کر لیا۔ مگر پچھتائی۔

"کیسا لگ رہا ہے یہ سیٹ؟"

"بہت خوب! اتنا کہ مجھے اپ سیٹ کر دیا ہے۔ ذرا یہاں آؤ تو بتاؤں کتنا اپ سیٹ کر چکا ہے۔" وہ اس کے سجے بنے سراپے پر نگاہیں فوکس کیے سرد آہیں بھر رہا تھا۔ دیا اسے گھورنا چاہتی تھی مگر اس کی نگاہوں کے انداز نے الٹا اسے بوکھلا کے رکھ دیا۔ اس سے قبل کہ مستقیم مزید کوئی پھلجھڑی چھوڑتا دروازے پر دستک ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھا تھا۔ دروازہ کھولنے پر ملازمہ کی صورت نظر آئی۔ جو روتے ہوئے ایزد کو گود میں لیے کھڑی تھی۔

"بیگم صاحبہ کہتی ہیں۔ چھوٹی بی بی کو دے آؤں۔ بابا کو بھوک لگی ہے اور بیگم صاحبہ بی بی کو جلدی آنے کا بھی کہہ رہی ہیں۔ قرآن خوانی شروع ہو چکی ہے۔"

مستقیم نے بڑھ کر بچے کو لے لیا۔

"یہ لیجیے محترمہ! پیغام تو سن لیا ہوگا آپ نے۔"

وہ ایزد کو لیے اس تک آیا تھا۔ دیا نے بری جھنڈی دکھائی۔

"آپ کی وجہ سے ہی لیٹ ہوئی ہوں۔ اب ذرا بہلائیں اسے۔"

وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ مستقیم نے اسے گھورا۔

"مجھ سے کہاں سنبھلے گا۔"

"سنبھل جائے گا۔ باپ ہیں دشمن نہیں۔ ذرا بہلائیں جھلائیں اسے۔"

اس کی جھنجھلاہٹ کو خاطر میں لائے بغیر وہ مزے سے بولی تھی۔ مستقیم سرد آہ بھر کے رہ گیا۔ مگر ایزد ہاتھ پیر مار مار کے کچھ ایسے رویا کہ دیا کو اٹھنا پڑا تھا۔

"آؤ میری جان! بابا نے مارا؟"

وہ لپک کر اس کے پاس آئی اور ایزد کو اس سے لیا۔ اور خود میں سمو لیا۔ ایزد کی فریادیں بھی جیسے تھمنے لگیں۔

"آج کے بعد میں بھی ایسے ہی بالکل اسی انداز میں احتجاج کر کے تمہیں متوجہ کروں گا۔ خبردار جو تم نے ذرا سی بھی ڈنڈی ماری اس والہانہ محبت میں۔"

مستقیم جو اس کے التفات کا مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔ فوراً گرفت کرتے ہوئے مطالبہ بھی ظاہر کر دیا۔ دیا کے چہرے سے بھاپ نکلنے لگی۔ اب کے اسے گھورنا تو درکنار وہ لرزتی پلکیں بھی نہیں اٹھا سکی۔ اس کی حالت دیکھ کر مستقیم خود ہی ہنستا چلا گیا تھا۔

"بہت بے شرم ہیں آپ۔"

دانت کچکچا کر کہتی خود ہی جھلا کر باہر نکل گئی تھی۔ مستقیم مسکراتا ہوا اسٹڈی میں عبدالماجد کے پاس آ گیا۔ تب انہوں نے اسے اس کا اور دیا کا پاسپورٹ بننے کی اطلاع دی تو وہ کتنا حیران رہ گیا تھا۔

"ترکی؟ مگر کیوں ابو جی؟"

"یہاں مجھے ہر دم تمہاری گرفتاری کا دھڑکا لگا رہتا ہے بیٹے! مجھے یہ بھی احساس ہے کہ یہاں تم اب پوری آزادی سے سر اٹھا کر نہیں جی سکتے ہو اور میں چاہتا ہوں میرا بیٹا عمر بھر کی احساس کمتری یا محرومی کا شکار نہ رہے۔ یہ معمولی سا ازالہ ہے اس زیادتی کا جو میں نے تم پر کی۔ تمہارا نام میں نے بدل دیا ہے۔ یہ بھی ضروری تھا۔ بہت مشکل تھا یہ کام مگر اللہ کا شکر ہے ہو گیا۔ بس چند دن کی بات ہے۔ پھر تم پورے اعتماد اور آزادی کے ساتھ زندگی سے لطف کشید کر سکو گے کہ وہاں تمہیں اس حوالے کے ساتھ کوئی نہیں جانتا ہوگا۔"

وہ نرمی اور رسانیت سے کہہ رہے تھے۔ جبکہ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ محبتوں کا ایسا ثبوت زیادتی کا ایسا ازالہ احسان کا ایسا شاندار انداز محسوس کرتا رہا تھا۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے بیٹے! اسلامی ملک کو ترجیح اس لیے بھی دی کہ اک دن تمہارے بچے بڑے بھی ہوں گے تو مشکل نہ فیس کرنی پڑے۔ جیسا کہ عموماً برٹش ممالک میں ہوتا ہے۔ پھر دیا بھی بہت سمجھدار ہے۔ مجھے بہت بھروسہ ہے اس پر۔ وہ سنبھال لے گی خوبی سے آپ کو

اور ہماری نسل کو بھی۔"

وہ مزید کہہ رہے تھے۔ مستقیم نے بے چین ہوتے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

"لیکن میں اب آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا ابو جی! آپ اور امی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ کسی بھی صورت چاہے مجھے یہاں کتنی ہی مشکلات کو فیس کرنا پڑے۔"

اس کا گلا اندرونی جذبات کے باعث بھرانے لگا تھا۔ عبدالماجد نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا تو اپنا بازو اس کے شانے پر دراز کر کے خود سے لگا کر تھپکا تھا۔

"تھینک یو بیٹے! میں سمجھ سکتا ہوں۔ ہم خود بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جبھی یہاں سے ہجرت کا سوچ لیا ہے۔ آپ کی امی کے ویزے میں کچھ پرابلمز آ رہی ہیں۔ جبکہ میں یہاں سے بزنس وائنڈ اپ کر کے تمام کام سمیٹ کر جانا چاہتا ہوں۔ کچھ وقت لگ جائے گا لیکن اللہ نے چاہا تو ہم بہت جلد اکٹھے ہو جائیں گے۔"

وہ بہت نرمی سے۔ محبت سے اسے قائل کر رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے۔ جب دروازہ کھول کر امی بہت عجلت میں اندر آئی تھیں۔ ان کا چہرا اندرونی جذبات کے باعث تمتمایا ہوا تھا۔

"خیریت امی! آپ ٹھیک ہیں؟"

مستقیم گھبرا کر کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے وفور جذبات میں اسے گلے لگا کر ماتھا چوما۔

"خوشی کی ہی خبر ہے الحمد للہ! دیا بیٹی کی والدہ مل گئی ہیں۔ بلکہ مستقیم کے ابا یاد ہیں نا وہ محترمہ آپ کو؟ جن سے ہاسپٹل میں آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہی جن کی ساس کی طبیعت خراب تھی تو ہاسپٹل میں آپ ان سے ملے تھے؟ قدسیہ بیگم، وہی تو ہیں دیا کی امی......"

وہ مسرت زدہ لہجے میں تیز تیز بول کر ساری تفصیل سنانے میں مصروف ہوئیں۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ قدسیہ بیگم نے دیا کو پہچان لیا تھا اس کے بعد کا منظر ظاہر ہے بہت جذباتی تھا۔ قدسیہ بیگم نے کال کر کے اپنے بیٹے، شوہر اور ساس کو بھی بلوا لیا تھا۔

"دیا ابھی تک بہت رو رہی ہے پتا نہیں کیوں؟ میں نے سوچا آپ کو بلاؤں۔ چپ تو کرائیں کسی طریقے سے بچی کو۔ آؤ بیٹے تم بھی۔"

انہوں نے پلٹنے سے قبل مستقیم کا ہاتھ پکڑا۔ وہ سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

"آپ کر لیں بات امی! صورتحال سنبھل جائے گی بے فکر رہیں۔ دیا ہرٹ ہے انہیں دیکھ کر۔"

اور امی ابو چونکہ کسی بھی معاملے سے بے خبر نہیں تھے جبھی محض سر ہلایا تھا اور پلٹ کر باہر چلے گئے۔ مستقیم سگریٹ سلگاتے ہوئے حالات میں تیزی سے آنے والی تبدیلیوں پر غور کرتا کش لیتا رہا

تھا۔

☆......☆......☆

پھر تو جیسے ساری صورتحال ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ دیا کی امی بے حد شرمندہ تھیں اپنے اس عمل سے، جبھی اب بار بار مستقیم سے بھی معذرت کر چکی تھیں۔ اس کے علاوہ دیا کے بابا اور بھائی کے علاوہ دادی نے بھی ان کے رویے پر معافی مانگی تھی تو مستقیم شرمندہ ہونے لگا تھا۔ جبھی عاجزی سے انہیں ٹوکا۔

"یہ اپنی جگہ پر ٹھیک تھیں۔ مجھے ہرگز بھی شکوہ نہیں ہے۔ شاید نہیں یقیناً ہم اسی سلوک کے مستحق تھے۔ خاص طور پر میں۔"

وہ سر جھکائے بولا تھا۔ تو دیا کے بابا نے بے حد محبت سے اس کا کاندھا تھپتھپایا تھا۔

"ایسا مت سوچیں مستقیم بیٹے! قابل تحسین ہوتے ہیں وہ لوگ جو برائی سے اچھائی کی جانب واپس لوٹیں اور اس کے لیے اسٹرگل کریں۔ آپ تو خاص ہو عام لوگوں سے کہیں زیادہ بہادر بھی۔"

ان کا لہجہ ان کے الفاظ کا واضح عکاس تھا۔ مستقیم ان کی رواداری کے مظاہرے پر نرمی سے مسکرایا پھر دیا کو دیکھا تھا۔

"سچ پوچھیں تو اس میں میرا کہیں بھی کوئی کارنامہ شامل نہیں ہے۔ امی ابو جی کی دعائیں رنگ لائیں اور اللہ کا احسان ہوا۔ دوسرا یہ کریڈٹ دیا کو ہی جاتا ہے۔ یہ ساری محنت سارا کمال اسی کا تھا۔ اگر یہ نہ ہوتی تو شاید میں آج یہاں بھی نہ ہوتا۔"

اس کے لہجے میں عقیدت بھی تھی۔ سچائی بھی۔ دیا اس برملا تعریف پر وہ بھی سب کے سامنے اچھا خاصا شرما گئی تھی۔ جبھی جھینپ کر مسکرانے لگی۔

"یہ سب تو ہے بیٹے! آپ کی فطرت کی اچھائی بھی اس میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔ مجرم عادی ہو جائے تو جرم کا احساس ختم ہو جایا کرتے ہیں۔ کب...... کیسے...... کیوں اور کیسے کے سوال اپنی وقعت کھو دیتے ہیں۔ وہ بس اپنی کامیابیوں پر نگاہ رکھتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے۔ پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ لیکن آپ کا پلٹ کر بار بار دیکھنا آپ کی فطرت کی اچھائی اور اللہ کا آپ پر خاص کرم ہی تھا۔ جو اس واپسی کا باعث بنا۔ گناہ یہ نہیں کہ آپ گناہگار ہیں۔ گناہ یہ ہے کہ آپ کو اس پر فخر ہے۔ آپ توبہ کے طلب گار بنیں۔ شرمسار بنیں۔

اور گناہ سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے گناہ کا احساس نہیں۔ جبکہ الحمد للہ آپ نے اپنی غلطی پر فخر نہیں کیا۔ آپ جرم کے عادی ہو کر بھی ذہنی طور پر اسے قبول نہ کر سکے۔ ہر قدم پر آپ کو غلطی اور

گناہ کا احساس تھا۔ پچھتاوا بھی دکھ بھی۔ یہی آپ کی رہائی آپ کی نجات کا باعث بن گئی۔ اور یہ مقام شکر ہے۔"

دیا کے بابا کہہ رہے تھے اور مستقیم آہستگی سے مسکرا دیا تھا۔ وہ سو فیصد متفق تھا۔ آخری خیال سے خاص طور پر جبھی چند لمحوں میں شکرانہ ادا کرنے اٹھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

"یہ تو بہت زیادتی ہے بھئی! تمہیں منع کرنا چاہیے تھا اور میرا خیال بھی الٹا نگاہ تک ملائے بغیر اٹھ کر ساتھ بھاگ گئیں۔"

وہ سیل فون کان سے لگائے اس سے محو گفتگو بھنایا جا رہا تھا۔ دوسری جانب دیا کی کھنکتی ہنسی اس کے غصے کو ایسے بڑھا رہی تھی جیسے جلتی آگ کو تیل بھڑکاتا ہے۔

"ہنسو نہیں۔ بتا رہا ہوں تمہیں ورنہ ابھی پہنچ جاؤں گا وہاں اور بغیر کسی کا لحاظ کیے لے آؤں گا سمجھیں۔"

اسے صحیح معنوں میں غصہ آ گیا تھا۔ دیا اسی دن اپنے والدین کے ہمراہ اپنے میکے چلی گئی تھی۔ اس بات کو اب کتنے ہی دن ہو گئے تھے مگر وہ تھی کہ واپس آنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جبکہ اس کی یہی بے اعتنائی مستقیم کے شدید غصے کا باعث بن چکی تھی۔

"افوہ...... اتنا غصہ کرنے کی کیا تک ہے بھئی؟ شادی کے بعد پہلی مرتبہ میکے آئی ہوں۔ صرف یہی نہیں، مستقل طور پر اس ملک سے بھی جا رہی ہوں۔ تو اتنا رہنا تو حق بنتا ہے نا میرا۔"

وہ جواباً نرمی سے سمجھا رہی تھی۔ مستقیم نے متاسفانہ سرد آہ کھینچی۔

"ہاں جی! بالکل...... بالکل حق بنتا ہے۔ سارے دوسروں کے حقوق ازبر ہیں ہماری ڈیئرسٹ وائف کو سوائے اپنے اس غریب شوہر کے۔"

دوسری جانب دیا یقیناً اس کی اس بیچارگی پلس بے صبری پہ خفت زدہ ہوئی تھی جھینپی بھی تھی۔

"تھوڑا سا صبر کر لیں، پھر تو عمر بھر آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے۔"

وہ مسکرائی تھی۔ مستقیم کا موڈ اس خوبصورت بات نے ذرا سا بحال کیا۔

"ان شاء اللہ! مگر ابھی کا کیا کروں؟ دل نہیں لگ رہا ظالم لڑکی تمہارے بغیر۔ اتنا عادی کیوں بنایا تھا مجھ بیچارے کو اگر یہی سب کرنا تھا۔"

اس نے سرد آہیں بھر کے واویلا کیا۔ دیا کی مسکان مچل مچل گئی۔

"بس کریں اداکاری اچھا۔ جانتی ہوں جتنی محبت کرتے ہیں آپ۔"

وہ جیسے اس پل کچھ شاک کی ہونے لگی۔ مستقیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"شکوہ اور اچھی بات تم ہمیشہ فاصلے سے ہی کرتی ہو۔ بہت خراب عادت ہے۔ یار یہ تمہاری۔ اگر یہاں ہوتی تو ثبوت پیش کر دیتا۔ مگر بگڑا تو اب بھی کچھ نہیں۔ جواب دینا ضروری ہے نا۔ وہاں آ کے بتاتا ہوں کتنی محبت کرتا ہوں۔ انتظار کرو۔"

اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے گویا لمحوں میں اسے بوکھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں خلیفہ! ٹائم دیکھیں ذرا۔"

وہ واقعی شپٹائی تھی۔ بکلائی تھی۔

"میں ٹائم نہیں تمہارے شکوے کو دیکھ رہا ہوں اور تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

اس نے اسے اچھے انداز میں چھیڑنے کا تہیہ کر لیا تھا گویا۔

"اچھا بھئی! معاف کر دیں مجھے۔ نہیں ہے مجھے آپ سے کوئی گلہ شکوہ۔"

وہ عاجز ہوئی اور بات ختم کرنی چاہی۔ مستقیم کو قہقہہ روکنا محال ہوا مگر اسے تنگ کرنے کا ارادہ نہیں بدلا۔

"یعنی دوسرے لفظوں میں تم مجھے وہاں آنے سے روک رہی ہو۔"

"اف اللہ! مستقیم...... قسم سے آپ حد کر رہے ہیں۔ میں کیوں روکوں گی آپ کو؟ بلکہ یہاں سب آپ کے منتظر ہیں۔ امی دعوت کرنا چاہ رہی ہیں۔ امی ابو جی اور آپ کی بھی۔"

وہ واقعی اس کے جھانسے میں آ گئی تھی۔ اور گھبرا کر وضاحتیں اور صفائیاں پیش کیے گئی۔ اور مستقیم کو ہنسی روکنا محال لگنے لگا۔ جبھی بے تحاشہ سرخ پڑ چکا تھا۔

"میں تو ہرگز نہیں آؤں گا۔ تب تک جب تک تم نہ بلاؤ۔"

اس نے نروٹھے پن کا مظاہرہ کیا۔

"میں ہی تو بلا رہی ہوں آپ کو۔"

اس نے باقاعدہ منت کے انداز میں کہا تو مستقیم کے قہقہے نے اسے بتایا اب تک وہ اسے کتنا بیوقوف بنا کر ستا چکا ہے۔

"ثابت ہوا۔ ابھی تمہیں بہت زیادہ عقل نہیں آئی۔"

"میں بات نہیں کر رہی ہوں آپ سے بس۔"

اس نے مصنوعی غصے میں کہتے فون بند کر دیا۔ مستقیم بعد میں بھی اس کی شکل کے بگڑے زاویوں کا تصور کر کے مسکراتا رہا تھا۔ پھر اس نے یونہی مسکراتے ہوئے اسے ٹیکسٹ سینڈ کیا تھا۔

(خفا نہیں ہونا ڈارلنگ! تمہیں نہیں ستاؤں گا تو اچھی نیند نہیں آئے گی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اب تمہارے بغیر زندگی کا تصور ہی محال ہے۔ تم میرے لیے اللہ کا وہ انعام ہو جو زندگی کو سہل اور خوشگوار بنا دیتا ہے۔)

اور یہ اعتراف اس نے اس وقت بھی اس کے سامنے کیا تھا۔ جب وہ پاکستان سے ترکی فلائی کرنے کے لیے سب کو الوداع کہہ کر ڈیپارچر لاؤنج کی جانب دیا کی ہمراہی میں بڑھ رہا تھا۔ اس نے بہت عقیدت بھرے انداز میں دیا کے ہاتھ پر بوسہ ثبت کیا تھا اور محبت سے لبریز مہکتے خوشبودار لہجے میں گویا تھا۔

"نیک، صالح اور دیندار بیوی قدرت کا انعام ہوا کرتی ہے۔ میں شکرگزار ہوں اپنے رب کا کہ اس نے یہ انعام مجھے عطا فرمایا۔ یہ سب یونہی ہونا طے ہوا تھا۔ مگر دیا ہر انسان اپنے عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ تمہارا عمل قابل ستائش ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ اگر تمہاری محبت، تمہارا تعاون ساتھ نہ ہوتا تو میں آج ایک بدلا ہوا انسان نہ ہوتا۔ ایک گمراہ ڈاکو کو اپنی کوشش اور دعاؤں سے راہ راست پر لانے والی لڑکی کے نام پر نیک جذبات بہت عقیدت کے ساتھ وہ تھما تھا۔ اور گلا کھنکار کر بہت جذب سے گویا ہوا تھا۔

وہ لڑکی پھولوں جیسی ہے
وہ بالکل حوروں جیسی ہے
ہے چاند نگر کی رانی وہ
ہے جیسے رات مستانی وہ
ہے میری پریم کہانی وہ
روشن وہ اجالوں جیسی ہے
وہ میرے خیالوں جیسی ہے
شعلہ بھی وہ، شبنم بھی وہ
وہ زلف گھٹا سی رکھتی ہے
وہ آنکھ رسا سی رکھتی ہے
وہ دھوپ میں چھاؤں جیسی ہے

ساون کی گھٹاؤں جیسی ہے
تتلی کی اداؤں جیسی ہے
وہ ملکہ چاند ستاروں کی
وہ خوشبو باغ بہاروں کی
وہ لڑکی پھولوں جیسی ہے
وہ بالکل حوروں جیسی ہے

اور دیا کے سفید اجلے چہرے پر حیا کی سرخیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ لانبی پلکیں جیسے اٹھنے سے انکاری ہو رہی تھیں اور مسلسل لرزتی تھیں۔ اپنا محجوب روپ چھپانے کو اس نے جھک کر ایزد کو پیار کیا تھا۔

"جنت میں ہر مرد کو ستر حوریں ملیں گی۔ مگر میں اپنی بیوی سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ صرف تمہیں پر اکتفا کروں گا۔ دیکھا ہو گا تم نے کوئی ایسا بھی صابر و شاکر مرد؟"

وہ اس کی سماعتوں میں بوجھل سرگوشیاں انڈیلتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جہاز میں آ کر بیٹھ بھی گئے تھے اور جس پل وہ اس کی سیٹ بیلٹ باندھ رہا تھا دیا نے نہایت محبت سے اس کے ہاتھ کو تھام کر اپنے ہاتھوں کے ساتھ ملا کر دعا کے انداز میں پھیلا دیئے۔

"سفر میں مانگی جانے والی دعائیں قبول ہوا کرتی ہیں خلیفہ مستقیم! آیئے ہم دعا مانگیں اللہ پاک اپنے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہمارے نیکی کے اس ارادے میں پختگی پیدا فرمائے۔ ہماری اس واپسی کو دائمی رکھے۔ ہر آزمائش میں استقامت اور سرخروئی نصیب فرمائے اور شیطان کے بہکاوے سے بچا کر اپنی پاک حفاظتوں میں لے لے۔ آمین ثم آمین۔"

مستقیم نے صدق دل سے کہا تھا پھر مزید گویا ہوا۔

"نہیں کوئی معبود سوائے تیرے۔ تو پاک ہے۔ بے شک میں ہی ظالموں سے ہوں۔"

اور یہ بہت پیاری دعا تھی جو واپسی کے اس دائمی سفر میں ہمیشہ اس کے لبوں پر زینت بنی رہتی تھی۔ وہ مشکور تھا اور خوش بھی کہ آزمائش کے ان لمحات میں اللہ نے اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا کسی بھی لحاظ سے اور اس کی محبت کا اس کی عنایت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا تھا بھلا؟ کہ اس نے اسے بچانے اور ہدایت پر لانے کو اتنا خاص سبب عطا کیا تھا دیا جیسی نیک سیرت بیوی کی صورت میں اس

کی شنات اور رفاقت میں تو اس نے جانا تھا۔ زندگی بیکار نہیں تھی جسے ضائع کیا جاتا۔ زندگی خاک بھی نہیں تھی جسے حقیر سمجھ کر اڑا دیا جاتا۔ زندگی تو انمول سرمایہ تھی۔ ایک مہلت ایک چانس۔ جسے ہرگز ضائع نہیں کرنا تھا۔ جسے اسی مقصد کے لیے گزرنا تھا جس کی خاطر رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا تو جان بھی گیا تھا۔ اب کوتاہی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اب زندگی حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تحت ہی صراط مستقیم پر گزرنی تھی ان شاء اللہ۔

ختم شد

☆......☆......☆